القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

تاہم اگر ان لوگوں کی بے رُخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا، لہٰذا نادان مت بنو۔ دعوتِ حق پر لبیک وہی لوگ کہتے ہیں جو سننے والے ہیں، رہے مُردے تو انہیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اُٹھائے گا اور پھر وہ (اس کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے) واپس لائے جائیں گے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اُتری، کہو اللہ نشانی اُتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔

(آیات ۳۵ تا ۳۷)(حوالہ تفہیم القرآن از مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی)

الحدیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہِ رمضان کی فضیلت

حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ شعبان کی آخری تاریخ کو نبی کریم ﷺ نے خطبہ دیا جس میں فرمایا:۔

"اے لوگو! ایک بڑی عظمت والا، بڑی برکت والا مہینہ قریب آگیا ہے۔ وہ ایسا مہینہ ہے کہ جس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ میں روزہ رکھنا فرض قرار دیا ہے اور اس مہینہ کی راتوں میں تراویح پڑھنا نفل کر دیا ہے (یعنی فرض نہیں ہے بلکہ سنت ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے)۔

جو شخص اس مہینہ میں کوئی ایک نیک کام اپنے دل کی خوشی سے بطور خود کرے گا تو وہ ایسا ہوگا جیسے کہ رمضان کے سوا اور مہینوں میں فرض ادا کیا ہو۔

اور جو اس مہینہ میں فرض ادا کرے گا تو وہ ایسا ہوگا جیسے کہ رمضان کے سوا دوسرے مہینہ میں کسی نے ستر فرض ادا کیے۔

اور یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔

اور یہ حاجت مندوں کے ساتھ مالی ہمدردی کا مہینہ ہے"۔

(بحوالہ مختصر صحیح بخاری)

اس شمارے میں......

صفحہ	عنوان	مصنف	تعارف
2	القرآن	ضیاء القرآن	قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے!
3	الحدیث	ادارہ	ماہ رمضان کی فضیلت!
14	دستک	امجد یوسف خان	کراچی ایئرپورٹ پر حملہ..... سیکیورٹی کہاں ہے؟
38	وہ سٹے بازی کا شکار ہوگیا	سید سجاد حسین کاظمی	ایک شخص کا ماجرا، وہ راتوں رات امیر بننے چلا تھا!
49	خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں	قلندر حسین سید	ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں چننے کے لیے درجنوں کتابوں کی ورق ریزی درکار ہوتی ہے!
79	عشق بامراد	ڈاکٹر درخشاں انجم	پیار کے متلاشی دو دیوانوں کا فسانہ، جنہیں عشق کی اصل "راہ" مل گئی تھی!

17 **مولانا طارق جمیل**

ایک ایسے عظیم اور پُر اثر بندے کی چشم دید کہانی،
جو لاکھوں انسانوں کی ہدایت اور توبہ کا ذریعہ بن رہا ہے!

135 پھلوں کا بادشاہ..... آم

90	آن	بہار انصاری	ایک دوشیزہ کی کہانی، جو علاقائی روایات کی بھینٹ چڑھ گئی!
93	مسٹر جیک	راؤ حسن ناصر	وہ دونوں ہم نام، مگر ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے!
125	قسمت	آسناتھ کنول	ایک دفتر میں ملازم دو عورتوں کی کہانی، قسمت کی دیوی اچانک اُن پر مہربان ہو گئی تھی!
129	یاراں واویلا	اقبال تبسم	طنز و مزاح کی چاشنی لیے شگفتہ اور چلبلی تحریر:
139	کسی کی ڈفلی پر میرا راگ	نوشابہ اختر	گھر گھر کی کہانی، ہماری نئی نسل کے اپنی اقدار سے دور ہونے کا المیہ
157	کیسے ممکن ہے!	لیاقت علی ملک	صنفِ نازک کے کردار کے مختلف رنگ بیان کرتی اچھوتی تحریر!
161	حضرت سلطان باہوؒ	پروفیسر غلام رسول	سلطان العارفین کی زندگی کے ایمان افروز حالاتِ زندگی!

رمضان سپیشل

رمضان کیا کھائیں کیا نہ کھائیں — صغیرہ بانو شیریں — 65

رحمتوں کا خزینہ رمضان المبارک — ڈاکٹر سید نعیم احمد ادیب جعفری — 46

86 کولیسٹرول (Cholesterol) کو کنٹرول کیجیے — حکیم راحت نسیم سوہدروی

170 پہلی تصویر — محمد سلیم اختر — زندگی میں آپ نے کئی بار تصویر بنوائی ہوگی مگر کیا آپ کو سب سے پہلی تصویر یاد ہے؟

177 بزم شاعری — ادارہ — باذوق قارئین کے کلام و انتخاب پر مبنی مقبول ترین سلسلہ!

183 داغ داغ مسیحا — صغیرہ بانو شیریں — ایک عورت کی کتھا، والدین کی ذراسی بھول نے اُس کی زندگی داغ دار کردی تھی!

195 بیتے دن — سعید فتح محمد — ایک لڑکی کی بپتا جس نے اپنی کمزوری کو دوسروں کی طاقت بنا دیا!

199 اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ — پیر شاہ محمد قادری — اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں سے آپ کے مسائل کا حل!

205 تھوڑا سا آسماں — محسن علی — ایک دوشیزہ کی کہانی جسے موت سے بہت ڈر لگتا تھا!

209 آخری موقعہ......! — تحریر: لوا اینزی، ترجمہ: ایس۔ اے۔ اعظم — اُس شخص کی کہانی جو آرٹ کا دل دادہ تھا اور پتھر کا دل رکھتا تھا.........!!

خواتین کارنر
173 ☆ سیارہ کچن کارنر — جویریہ کامران

152 ہندوستان میں مسلم ورثہ — عارف محمود آئیلی

حقیقت کہانی

97 قسم — نواز خان — محبت اور جرم کا شاہکار افسانہ نواز خان کے قلم سے

71 غمِ دوراں — جاوید راہی — ایک شخص کا ماجرا، اُس کی کامیاب زندگی — ایک عبرت خیز داستان

جلد 51 - شمارہ 7 - جولائی 2014ء

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

www.facebook.com/sayaradigest
Email:editorsayyara@yahoo.com
sayyaradigest@gmail.com
editorsayyara@hotmail.com
Phone:92-042-37245412
Mobile:0300-9430206

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور

قیمت 80 روپے

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر 240 مزنگ روڈ لاہور سے شائع کیا۔

نام بھی لاثانی
معیار بھی لاثانی

عرق مہزل
ARQ MEHZAL
Herbal Product
No Side Effects

اظہار خیال

دل سے دُعا نکلتی ہے......

محترم مدیر صاحب سلام مسنون! سیارہ ڈائجسٹ کے حوالے سے کچھ کہنے کے لیے "اظہار خیال" کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں۔ پچھلے شمارے میں جناب سرفراز احمد شاہ صاحب کے بارے میں پڑھا۔ بہت اچھا لگا ایک جامع شخصیت کے حوالے سے لکھا ہوا مضمون اور ان کی ٹائٹل پر تصویر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ رسالہ کی مقبولیت کا یہ عالم کہ پھر رسالہ ہی نایاب ہو گیا۔ اب کے شمارے میں "دستک" میں معاشرے کے ایک بہت اہم پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے۔ واقعی اپنے پر نگاہ دوڑائی جائے تو دوسرے ذمہ دار نظر نہیں آتے۔ اپنی غلطی کو تسلیم کرنا چاہیے۔ فراخ دلی سے غلطی تسلیم کرنے سے دوسروں پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اپنی اصلاح بھی اور دوسروں کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

"سیارہ رپورٹ" پڑھ کر بے ساختہ دل سے دُعا نکلتی ہے۔ کاش "یہ قبضہ" اور بے انصافی ختم ہو جائے۔ ایک فلاحی، اسلامی مملکت میں رہنے والا ہر فرد انصاف حاصل کر سکے۔ آمین بہن شوکت افضل بہت اچھا لکھتی ہیں۔ "ہنی مون" کی رُوداد جس سادگی سے تحریر کی ہے پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ میری طرف سے مبارکباد اور سلام۔

(صغیرہ بانو شیریں)

عمدہ لکھنے والے کہاں گئے؟

جناب کامران امجد۔ آداب۔ اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ جب بھی میرا افسانہ چھپتا ہے تو سیارہ ڈائجسٹ نظر موصول ہوتا ہے۔ خیر یہ تو طے شدہ بات ہے کہ سیارہ سنجیدہ قارئین کا رسالہ ہے۔ اس کی عمدہ ... پڑھنے والوں کو راب بھی کرتی ہیں اور اکثر تو لکھنے کی ترغیب بھی دیتی ہیں۔ ایک بات محسوس ہوتی ہے کہ اکثر عمدہ لکھنے والے کہیں غائب ہوتے جا رہے ہیں جیسے (فرخ صابری) خیر سب کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ کچھ تحریریں بھیج رہی ہوں، چھپتے رہیے۔

(آسناتھ کنول)

"گرمی میں فرحت"

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! جون کا "سیارہ" شدید گرمی میں نظر نواز ہوا اور دل کو فرحت بخش گیا۔ گرمی سے دھیان ہٹ گیا اور ذہنی تسکین کا باعث بنا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔ تیسرا جنم ڈاکٹر خالد جمیل اختر کی تحریر پڑھ کر ہمت، جرأت اور استقلال کے قائل ہو گئے۔

ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا
وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا

ایسے ہی نہیں لکھا گیا اور احمد ندیم قاسمی نے ایسے تو یہ شعر نہیں لکھا تھا۔

اگر ہو جذبہ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

مجھے ویسے ہی ذاتی طور پر ڈاکٹر خالد جمیل اور ان کی فیملی پسند ہے۔ مسز جمیل ٹی وی پر اکثر نظر آتی ہیں۔ ان کی مسز کا انٹرویو سنا تھا بلکہ وصی شاہ نے "رات گئے" میں ان کو بلوایا تھا تو ان کی زندگی کے کئی ادبی پہلو بھی روشن ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس فیملی کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے اور کامیابیاں ان کے قدم چومیں (آمین ثم آمین)

بزم شاعری اور اظہار خیال میں جگہ دینے کا شکریہ! ... سیارہ کا گلدستہ ذہنوں کو مہکا دیتا

ہے۔ کھجور کے فائدے پڑھ کر خوشی ہوئی۔ رمضان آنے والا ہے عموماً اس ماہ میں کھجور کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔ جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے محمد سلیم اختر کی تحریر متاثر کن رہی۔ کیا یہ وہی سلیم اختر ہیں جو ڈاکٹر سلیم اختر کے نام سے نقاد اور محقق کے طور پر مشہور ہیں۔ ایم فل پی ایچ ڈی کے طلبہ و طالبات ان کی کتابیں پڑھ کر تحقیق فن سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان کے تنقیدی نکتہ نظر کو مثال سمجھتے ہیں پلیز وضاحت کیجیے گا۔

(یاسمین کنول راجپوت)

☆ یاسمین صاحبہ جن سلیم اختر کا آپ نے ذکر کیا وہ اگرچہ محقق اور منجھے ہوئے لکھاری ہیں مگر پروفیسر سلیم اختر دوسری شخصیت ہیں۔

غلطیوں سے سبق

جناب مدیر سیارہ ڈائجسٹ السلام علیکم!

سیارہ ڈائجسٹ شمارہ جون ۲۰۱۴ء زیر مطالعہ ہے۔ سابقہ شمارہ میں کمپوزر صاحب نے "ز" کو "ذ" میں بدل دیا تھا جس سے ادیب "ادیب" پڑھا گیا۔ اس شمارہ میں بھی صفحہ 51 پر حضرت موہانی کو حضرت موتانی بنا دیا گیا۔ معزز قارئین اسے حضرت موہانی ہی پڑھیں گے تو مفہوم سمجھ میں آئے گا۔ اظہار خیال کے صفحات پر زاہدہ یوسفی صاحبہ نے گزشتہ شمارہ کی غلطی کو جس نگاہ سے دیکھا وہ ہر کسی کا کمال نہیں۔ انہوں نے میرے احساسات کا احساس کیا وہ قابل قدر ہے۔ میں عرض کرتا چلوں کہ میں فری لانس ادیب اور کالمسٹ ہوں۔ کسی کا ملازم نہیں ہوں۔ اب پنشنر ہوں لکھنا میری کمزوری ہے میں نیٹ پر ایک قدیم یونانی کہاوت پڑھ رہا تھا۔ "ایک معاشرہ تب پروان چڑھتا ہے کہ جب وہاں کے عمر رسیدہ افراد یہ جانتے ہوئے بھی پودے لگائیں کہ وہ اپنے لگائے گئے پودوں کے سائے میں کبھی نہیں بیٹھ پائیں گے۔" آج ہمیں 67 سال آزاد ہوئے ہو گئے ہیں۔ اس دوران ہمارا ملک دولخت ہوا آخر کیوں؟ افسوس کہ آج بھی وہی ناٹک کھیلا جا رہا ہے۔ بلوچستان میں علیحدگی پسند تحریکیں چل رہی ہیں آئے دن کراچی اور سندھ میں خون کی ہولی سے خون کی ندیاں بہائی جاتی ہیں آخر کیوں۔ ایوب خان کے دور حکومت میں ملک میں 22 خاندان بڑے تھے۔ آج وہ بڑھ کر دو گنے' تگنے ہو گئے ہیں اور وہی ہمارے حاکم چلے آ رہے ہیں آخر کیوں؟ اس لیے کہ ہم میں کھوٹے کھرے کی پرکھ مفقود ہو کر رہ گئی ہے۔ شریف برادران پہلے بھی دو بار اقتدار میں آ چکے ہیں۔ افسوس کہ وہ اقتدار میں وقت سے پہلے آؤٹ (OUT) ہوئے افسوس! کہ انہوں نے اپنی سابقہ غلطیوں سے کوئی سبق نہ لیا۔ ان کے دور میں وہی کچھ آج بھی ہو رہا ہے آخر کیوں۔ اب تو لوگ برملا اس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ اس سے اچھا تو پی پی پی کا دور حکومت تھا۔ اس سے اچھا سابقہ حکومت پرویز مشرف کا دور تھا جیسے چاول جتنا پرانا ہو گا اتنا ہی اچھا ہو گا آخر کیوں؟ سابقہ حکومتوں نے ملازمین اور پنشنرز کو مہنگائی کے تناسب سے ان کی تنخواہوں اور پنشنوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور ان بھائیوں نے انہیں محض 10 فیصد پر ٹرخایا آخر کیوں؟

(قلندر حسین سید)

غزل کی اشاعت

قابل احترام ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! آپ کی صحت' تندرستی اور خوشیوں کے لیے ہر وقت دعا گو رہتا ہوں۔ جون کے شمارے میں غزل کی اشاعت پر تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ایک غزل مزید بھیج رہا ہوں۔ معیاری ہونے کی صورت میں اسے بھی اگلی بار پرچے میں جگہ دے کر دعائیں لیں۔ تمام قابل احترام دوستوں کو سلام۔

(قدیر رانا/راولپنڈی)

منفرد موضوع

محترم مدیر سیارہ ڈائجسٹ السلام علیکم! مئی کے شمارے میں آپ کے ادارے کی طرف "میری کہانی ایک رات" شائع کی گئی۔ اس کے لیے میں آپ کے ادارے کی شکرگزار ہوں۔ اس شمارے میں میرے خط کے جواب میں کہا کہ میں مختلف موضوعات پر لکھوں۔ تو اس دفعہ میں ایک ایسے منفرد موضوع کو لے کر حاضر ہوئی ہوں جو کہ آپ کو پسند آئے گا (انشاء اللہ)۔ میں اُمید کرتی ہوں۔ آپ اس کو جلد پرچے میں جگہ دیں گے۔ میں آپ کی طرف سے اس پرچے کا انتظار کروں گی۔ اللہ حافظ!

(عطیہ زاہرہ)

کراچی کیلئے دُعا

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ سیارہ ڈائجسٹ کو اور آپ کو خوب ترقی عطا فرمائے (آمین)۔ سیارہ ڈائجسٹ کے جملہ ممبران اور تمام قارئین کے لیے دعاؤں کے تحفے کے ساتھ حاضر خدمت ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حفظ و امان میں رکھے (آمین)۔ دستک پڑھ کر دل سے یہی دعا نکلی کہ "اللہ کرے زورِ قلم اور عطا ہو"۔ سیارہ ڈائجسٹ کے توسط سے تمام پڑھنے والوں سے درخواست گزار ہوں کہ دن میں دو چار مرتبہ اہلیان کراچی کے لیے دعائے خیر ضرور کیا کیجئے۔ ایک تحریر ارسال کر رہا ہوں امید ہے جلد شائع ہو جائے گی۔ دستک میں امید کرتا ہوں کہ ایسے موضوعات پڑھنے کو ملتے رہیں گے۔ شکرگزار

(نیئر رضا دوی/کراچی)

ماہِ رمضان کی پیشگی مبارکباد

مکرمی کامران احمد خان صاحب! السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ [illegible] 2014 کا

خوبصورت شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ تمام خوبصورت عنوانات کے ساتھ کہانیوں، شاعری اور آرٹیکلز کا معیار بہت بہتر تھا! ہماری تحریریں شائع کرنے کا شکریہ! آپ کو ہو نگر سٹاف اور "سیارہ ڈائجسٹ" کے تمام لکھنے والوں اور تمام پڑھنے والوں کو ماہ رمضان کی پیشگی مبارکباد۔

(ایس۔ امتیاز احمد/کراچی)

مستقل حصہ

جناب مدیر السلام علیکم! "ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ" شمارہ اپریل میں بزم شاعری کا حصہ بن کر بہت خوشی ہوئی۔ گزشتہ چند ماہ سے اس ادبی جریدے کا مستقل قاری بھی بن چکا ہوں اور انشاء اللہ باقاعدہ حصہ بھی بنتا رہوں گا۔ ایک نئی غزل ساتھ بھیج رہا ہوں اور بیچ کا سارا حق آپ کو ہے۔ رب تعالیٰ سے دعا ہے آپ کی یہ اولیٰ کوشش ہر دن نئی نئی منزلیں طے کر کے خوب پھلتی پھولتی رہے۔ والسلام

(عبدالباسط عدیل)

کور سٹوری

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب! تسلیمات! اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ تحریریں حاضر خدمت ہیں باری باری جیسا مناسب سمجھیں لگاتے رہیے گا۔ سیارہ ڈائجسٹ کے کور سٹوری کے طور پر شائع ہونے والے سارے سلسلے بڑے اچھے ہیں۔ جن میں "بارشاہ سائی"، "مختون سنگھ آٹو بائیوگرافی"، "سچ محبت اور ذرا سا کینہ" بہت دلچسپ تھے۔ اولیاء کرام کی زندگی کے حالات کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اور صغیرہ بانو شیریں صاحبہ کی تحریریں لاجواب ہیں۔ شوکت افضل صاحب ایک عرصے سے غائب ہیں۔ اُن کا نمبر ہوتا تو میں ضرور ان سے رابطہ کرتی۔ والسلام

(ڈاکٹر درخشاں انجم)

معاشرہ کس طرف جارہا ہے؟

جناب مدیر صاحب! السلام علیکم! اللہ کریم آپ کو تندرستی دے (آمین) مئی کا سیارہ ڈائجسٹ سامنے رکھا ہے دس بارہ سال بعد شاید یہ پہلا موقع ہے کہ آپ کی طرف سے مجھے میگزین نہیں ملا بہرکیف میری کہانی "گنگر کے کانٹوں سے کھود تک" شائع کرنے کا بہت شکریہ۔ آپ کا اداریہ "دستک" سو فیصدی حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ آپ نے بالکل سچ کہا ہے کہ اپنی جان بچانے کے چکر میں اپنی غلطی تسلیم نہیں کی جاتی اور الزام دوسروں پر تھوپ دیا جاتا ہے۔ کچھ ہی عرصہ کی بات ہے ایئر پورٹ روڈ پر چلا جارہا تھا میرے آگے اچانک ایک ٹیکسی آگئی اور میں اس سے بری طرح ٹکرا گیا میری موٹر سائیکل کا نقصان ہوا لیکن الحمد اللہ خود میں بچ گیا ہمارے اردگرد کافی پبلک جمع ہوگئی سبھی افراد غلطی ٹیکسی والے کی قرار دے رہے تھے جبکہ میں نے اسے کہہ دیا آپ میرے آگے کیوں آئے؟ جواب ملا آپ تیزی میں تھے؟ میں نے کہہ دیا جی ہاں۔ ٹیکسی والے نے فوراً ہی حجت گھڑی، تو پھر آپ غلطی پر ہیں وہ اس طرح کہ آپ تیزی میں تھے۔ آخر تک اس نے اپنی غلطی تسلیم نہیں کی۔ بعدازاں میں نے ایک اور ملنے والے ٹیکسی ڈرائیور سے یہی بتا کر سوال کیا کہ یہ ڈرائیور لوگ اپنی غلطی کیوں تسلیم نہیں کرتے جواب ملا کہ ہمیں ہماری یونین کی طرف سے ہدایت ہے کہ اپنی۔ غلطی کو کبھی تسلیم نہ کرو۔ وجہ......؟ میں نے پوچھا جواب ملا...... غلطی تسلیم کرلی تو ہم پر تھو تھو الگ ہوگی اور جرمانہ الگ بھرنا پڑے گا۔ ہمارا معاشرہ پتہ نہیں کس طرف جارہا ہے؟ اب کی بار "تابوت کا ٹیلی فون" "انیس اختر" "سگار والا" یاسمین کنول اور "محبت کی ماری" نواز خان کی کہانیاں بہت اچھی ہیں۔

(... ... ...)

محسور کن اندازِ بیان

جناب مدیر محترم۔ محترمہ شوکت افضل صاحبہ اپنے اندازِ بیان سے بہت محسور کن انداز میں قاری کی سوچ کو جکڑ لیتی ہیں۔ آج کل اردو نثر نگاری لکھنے والے ان گنت ہیں لیکن بہت کم ایسے ہیں جن کی تحریر میں پختہ سوچ کا عنصر ہوتا ہے۔ ایک نثر نگار معاشرے میں اصلاح کا کام بھی کرسکتا ہے۔ ایسے جذبات محترمہ شوکت افضل کی تحریر کو پڑھ کر دل میں جنم لیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی قارئین ان کے دلچسپ اندازِ بیان سے محظوظ ہوتے رہیں گے۔

(عقیل محمد شاہین / راولپنڈی)

لکھاریوں کی ٹیم

محترم امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ ہمارا پسندیدہ شمارہ ہے۔ گزشتہ ماہ کے شمارے میں کافی عرصہ بعد فرخ صابری صاحبہ کو دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ اسی طرح صفیرہ بانو شیریں کی تحریریں سیارہ ڈائجسٹ کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ ہم کچھ عرصے سے شوکت افضل صاحبہ کی تحریروں کو "مس" کررہے ہیں وہ طویل وقفے سے غیر حاضر ہیں خدارا ہماری طرف سے انہیں شکوہ پہنچا دیجئے۔ مجموعی طور پر سیارہ ڈائجسٹ کے لکھاریوں کی ایک زبردست ٹیم تشکیل پاگئی ہے۔ نئے لکھنے والوں میں کیپٹن (ر) لیاقت کی تحریروں نے ہمیں بے حد متاثر کیا ہے۔ اُن کی تحریر میں ادبی چاشنی اور شگفتگی ہوتی ہے۔ اسی طرح مدیحہ اصغر، نوشابہ اختر، جاوید راہی اور نعیم بیگ بھی بہت عمدہ لکھ رہے ہیں۔ انہی لکھاریوں کی وجہ سے سیارہ ڈائجسٹ خوب ترقی کررہا ہے۔ دعا ہے کہ یہ سلسلہ ہمیشہ ایسے ہی چلتا رہے (آمین)

(محمد ... امتیاز / سرگودھا)

کراچی ایئر پورٹ پر حملہ...... سیکورٹی کہاں ہے؟

کئی ماہ تک امن اور دہشت گردی کے واقعات میں وقفہ کے بعد 8 اور 9 جون کی درمیانی شب 10 نقاب پوش دہشت گردوں نے پاکستان کے سب سے بڑے اور مصروف ترین کراچی ایئر پورٹ کو نشانہ بنادیا۔ جس کے نتیجے میں اے ایس ایف، سول ایوی ایشن اور پولیس کے بارہ اہلکار شہید ہوئے، دو طیارے تباہ اور کچھ کو نقصان پہنچا۔ سیکورٹی اداروں کے مطابق کسی طیارے کو نقصان نہیں پہنچا۔ دہشت گردوں نے ہوائی اڈے کے فوکر گیٹ پر حملہ کیا اور سیکورٹی پر مامور اہلکاروں پر گولیاں برساتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔ ان دہشت گردوں نے اے ایس ایف کی وردیاں پہن رکھی تھیں اور بعض کے پاس شناختی بیج بھی تھے جو انہوں نے گلے میں لٹکا رکھے تھے۔ انہوں نے گولیاں برسانے کے علاوہ دستی بم بھی پھینکے' پہلے ایک غیر ملکی ایئر لائن کے ٹرمینل کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، بعد ازاں پی آئی اے کے ٹرمینل پر حملہ کیا۔ تربیت یافتہ دہشت گردوں کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا جس سے انہوں نے ایئر پورٹ پر کھڑے طیاروں کو نقصان پہنچایا۔ بعد ازاں اے ایس ایف کے اہلکاران دہشت گردوں کے خلاف مقابلے کے لیے ڈٹ گئے اور انہوں نے ٹکڑیوں میں بٹے دہشت گردوں کو بڑی ہوشیاری سے دوطرفہ لڑائی میں اُلجھا لیا۔ اے ایس ایف کے اہلکاروں نے اپنی جان پر کھیل کر کراچی ایئر پورٹ کو بڑی تباہی سے بچایا۔ وگرنہ انڈیا کی تربیت یافتہ دہشت گرد پوری تیاری کے ساتھ ایئر پورٹ پر قبضہ کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ اُن کے مذموم اہداف [illegible] چلا ہے کہ طویل لڑائی جاری رکھی جا[illegible] ایئر پورٹ پر مکمل قبضہ کر لیا جا[illegible] [illegible] قبضہ ممکن نہیں

ہو پاتا تو طیاروں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جائے یا انھیں ہائی جیک کر لیا جائے۔ تیسرا یہ کہ زیادہ سے زیادہ تباہی اور ہلاکتوں کو ممکن بنایا جائے تاکہ پاکستان کو عالمی سطح پر مزید بدنام کیا جا سکے۔

اے ایس ایف اہلکاروں کی بہادری کی وجہ سے دہشت گرد مزید پیش قدمی نہ کر سکے اور بعدازاں پاک فوج کے ساتھ مل کر مشترکہ کمانڈو آپریشن میں تمام دہشت گردوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ تاہم ہماری سیکورٹی اور دعوؤں کا پول اس وقت کھل گیا جب ایک روز بعد دہشت گردوں نے کراچی ائرپورٹ کے کارگو ٹرمینل کو دوبارہ نشانہ بنا دیا اور مزاحمت پر فرار بھی ہو گئے۔ بہرحال اس سارے واقعہ میں اے ایس ایف کے جانبازوں کی بہادری کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہو گی جنھوں نے جانوں کا نذرانہ دے کر دہشت گردوں کو مزید تباہی پھیلانے سے روکا۔ اے ایس ایف فورس کو سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ائرپورٹس کی سیکورٹی کے لیے تشکیل دیا تھا۔ اس فورس کی افادیت برسوں بعد کھل کر سامنے آ گئی ہے، کیونکہ یہ اے ایس ایف اہلکار ہی تھے جن کی وجہ سے دہشت گرد اپنے مطلوبہ اہداف حاصل اُس حد تک حاصل نہ کر سکے جس کی وہ منصوبہ بندی کر کے آئے تھے۔

دہشت گردی کے اس بدترین واقعہ میں کئی تشویشناک پہلو سامنے آئے ہیں جو ہمارے سیکورٹی نافذ کرنے والے اداروں کے لیے لمحہ فکریہ ہیں، یہ انکشاف سامنے آیا ہے کہ دہشت گرد حملے سے پہلے کئی روز تک کراچی ایئرپورٹ کی نگرانی کرتے رہے۔ انھوں نے نہ صرف ائرپورٹ کے مختلف حصوں کی ریکی کی بلکہ تصاویر اتارتے اور ویڈیو بھی بناتے رہے۔ ان دہشت گردوں کو اے ایس ایف کی وردیاں اور بیج بھی فراہم کیے گئے۔ یہی نہیں انھیں معلوم تھا کہ اے ایس ایف کے اہلکاروں کی ڈیوٹی کس وقت تبدیل ہوتی ہے۔ اسی لیے جب یہ دہشت گرد اتنی بڑی تعداد میں اے ایف ایس ایف کی وردیوں میں داخل ہوئے تو کسی نے اُن پر دھیان نہیں دیا۔ ان دہشت گردوں کے پاس سے بھارتی اسلحہ اور گولہ بارود ملا ہے۔ نیز ایسے انجکشن ملے ہیں جو بھارتی فوجی خون روکنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں امن کی آن کے راگ الاپنے والوں کے غبارے سے ہوا نکل جانی چاہیے اور انھیں معلوم ہو جانا چاہیے کہ ہمارا اصلی دشمن کون ہے۔ کون ہے جو ہمیں دنیا بھر میں ذلیل و رسوا دیکھنا چاہتا ہے۔ ہمارے حکومتی ارباب اختیار اب بھی اس حوالے سے مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں کیونکہ انھیں ملک کی سلامتی سے زیادہ بھارتی وزیراعظم سے دوستی کی فکر ہے۔ جو ہمارے وزیراعظم کو اپنی حلف برداری کی تقریب میں بلاتا ہے اور مہمان کی عزت کے بجائے الزامات اور مطالبات کی فہرست تھما کر چلتا کرتا ہے۔

اس حملے کی منصوبہ بندی مہینوں پہلے کی گئی تھی، اور اس کے لیے انتہائی تربیت یافتہ دہشت گرد جن میں بعض انجینئر اور ہوائی جہاز اڑانے کی مہارت رکھنے والے بھی شامل ہیں۔ انھیں تیار کیا گیا تھا، یہ حملہ آور ایک عرصے سے یہاں آ رہے تھے۔ انھیں کس طرح کراچی ایئرپورٹ تک پہنچایا گیا، وہ

کہاں رہتے رہے۔ کس طرح انہوں نے اے ایس ایف کی وردیاں حاصل کیں۔ دو گاڑیوں میں اسلحے سمیت وہ ایئرپورٹ کی حدود کے اندر کیسے پہنچ گئے۔ ان سب سوالوں کا جواب ہماری سیکورٹی ایجنسیوں کو دینا چاہیے۔

ماہرین اس حملے کو پاکستان نیوی کی مہران بیس اور راولپنڈی میں جی ایچ کیو پر حملے جیسا قرار دے رہے ہیں۔ دہشت گردوں نے ایک بار پھر ہمارے انتہائی حساس اور سیکورٹی کے لحاظ سے اہم ترین مقام پر حملہ کیا ہے اور ہمارے سیکورٹی انتظامات کی ناکامی کو ایک بار پھر بے نقاب کردیا ہے۔ خدشہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ دہشت گردوں کو اندر سے بھی معاونت حاصل تھی۔ بعض خبروں کے مطابق طالبان کے علاوہ ازبک دہشت گرد تنظیم نے کراچی ائرپورٹ پر حملے کی ذمہ داری قبول کرلی ہے اور اُس نے ہلاک ہونے والے دس دہشت گردوں کی تصویریں بھی جاری کی ہیں۔

ایک اور تشویشناک اور اہم پہلو یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل کراچی ایئرپورٹ کے قریب سے ایک امریکی جاسوس بھی گرفتار ہوا تھا۔ اطلاعات کے مطابق اس کے پاس سے حساس تصاویر اور ویڈیوز برآمد ہوئی تھیں۔ خدشہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ یہ شخص ایئرپورٹ پر حملے کی تیاریوں میں معاونت کررہا تھا۔ بعدازاں اسے امریکی سفارت کار قرار دے کر چھوڑ دیا گیا اور کہا گیا کہ اس کے پاس سے صرف گولی برآمد ہوئی تھی۔ اس بارے میں بھی تحقیقات کی جانی چاہئیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ارباب اختیار جن پر ہماری سیکورٹی کی ذمہ داری ہے وہ آپس میں دست و گریباں ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ اس شاخ کو بچائیں جس پر سب بیٹھے ہیں، اس بات پر لڑ رہے ہیں کہ وہ شاخ دوسرے کے بوجھ کی وجہ سے جھک رہی ہے۔ وزیر داخلہ کراچی ایئرپورٹ پر حملے کی ذمہ داری سندھ حکومت پر عائد کرتے ہیں کہ انہوں نے وارننگ کے باوجود سیکورٹی کے لیے خاطرخواہ انتظامات نہیں کیے اور سندھ حکومت وزیر داخلہ پر الزام لگاتی ہے کہ حملے کے وقت وہ خود سوئے رہے۔ ایسی صورت میں عوام اور ملک کے سیکورٹی کا اللہ ہی حافظ ہے!

(امجد رؤف خان)

سیارہ
رمضان
کیلنڈر

اوقاتِ سحر و افطار ۱۴۳۵ھ
جون/جولائی 2014ء

2

پہلا عشرہ رحمت

تاریخ ایام	رمضان المبارک	جون/جولائی	انتہائے سحر	وقت افطار
ہفتہ	یکم رمضان	28	3:17	7:12
اتوار	2	29	3:18	7:11
پیر	3	30	3:19	7:10
منگل	4	یکم جولائی	3:20	7:09
بدھ	5	2	3:21	7:08
جمعرات	6	3	3:22	7:07
جمعہ	7	4	3:23	7:06
ہفتہ	8	5	3:24	7:05
اتوار	9	6	3:25	7:04
پیر	10	7	3:26	7:03

دوسرا عشرہ مغفرت

تاریخ ایام	رمضان المبارک	جولائی	انتہائے سحر	وقت افطار
منگل	11	8	3:27	7:02
بدھ	12	9	3:28	7:01
جمعرات	13	10	3:29	7:00
جمعہ	14	11	3:30	6:59
ہفتہ	15	12	3:31	6:58
اتوار	16	13	3:32	6:57
پیر	17	14	3:33	6:56
منگل	18	15	3:34	6:55
بدھ	19	16	3:35	6:54
جمعرات	20	17	3:36	6:53

تیسرا عشرہ نجات

تاریخ ایام	رمضان المبارک	جولائی	انتہائے سحر	وقت افطار
جمعہ	21	17	3:37	6:52
ہفتہ	22	18	3:38	6:51
اتوار	23	19	3:39	6:50
پیر	24	20	3:40	6:49
منگل	25	21	3:41	6:48
بدھ	26	22	3:42	6:47
جمعرات	27	23	3:43	6:46
جمعہ	28	24	3:44	6:45
ہفتہ	30	25	3:45	6:44
اتوار	20	26	3:46	6:43

لاہور سے دوسرے شہروں کا فرق

شہر	فرق
گوجرانوالہ:	2 منٹ بعد
ملتان:	11 منٹ بعد
سیالکوٹ:	3 منٹ بعد
پشاور:	13 منٹ بعد
کراچی:	29 منٹ بعد
اوکاڑہ:	2 منٹ بعد
ڈیرہ غازی خان:	15 منٹ بعد
راولپنڈی:	6 منٹ بعد

سیارہ رپورٹ

مولانا طارق جمیل

ایک ایسے عظیم اور پُراثر بندے کی چشم دید کہانی،

جو لاکھوں انسانوں کی ہدایت اور توبہ کا ذریعہ بن رہا ہے!

مولانا طارق جمیل صاحب کا آج کل ہر طرف چرچا ہے۔ وہ لوگوں میں بے حد مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ اُن کی زبان و بیان میں ایک ایسی کشش ہے باتوں میں ایسی سچائی ہے کہ آدمی کے دل پر اثر کرتی ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب میں نے پہلی بار مولانا کا ایک بیان سنا تھا۔ انھوں نے فرمایا "اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ 2۔ کبھی جھوٹ نہ بولو اور 3۔ کسی کو دھوکا نہ دو"۔ میں نے اپنی بقایا زندگی گزرنے کے لیے ان تین باتوں کو اپنے پلے باندھ لیا۔ جب میں ان باتوں پر عمل کرتا رہا تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ باتیں مجھے کتنی اور برائیوں سے دور کرتی جا رہی ہیں یہ تینوں اصول پر اگر انسان عمل شروع کردے تو وہ ہر برائی سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اُن کے ایک بیان سننے کے بعد میں اپنی زندگی میں بہت سی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ میں آپ کو یقین سے کہہ سکتا ہوں اگر آپ بھی مولانا طارق کے بیان کو سن لیں اور ان کی باتوں پر عمل کر کے دیکھ لیں آپ اپنے اندر کئی تبدیلیاں محسوس کریں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا طارق جمیل کو لمبی زندگی دے اور اُن کو ہمت، طاقت دے اور وہ اپنا یہ دعوت اسلامی کا سلسلہ جاری رکھیں تا کہ ہمارے جیسے گناہ گار اُن کو سن کر توبہ اور ہدایت حاصل کرتے رہیں۔

ایڈیٹر

بے وفائی

آج ہم نے سمجھ لیا ہے کہ جتنا اچھا کپڑا ہوگا، جتنا اچھا گھر ہوگا جتنا اچھا زیور ہوگا اتنی زیادہ ہماری عزت ہوگی۔ میرے بھائیو اور بہنوں یہ عزت تو خاک میں مل جائے گی۔ جسم کو قبر کے کیڑے کھا جائیں گے۔ ابدی کامیابی تو محمد ﷺ کے طریقوں میں ہے۔ پھر ہم ان طریقوں کو [illegible] نہ اختیار کریں۔ ماں بھی [illegible] کے دن کہے گی یا [illegible] [illegible] دے [illegible]۔ باپ [illegible] کہے گا جا

چلا جا۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسا جلیل القدر نبی بھی کہے گا میں اپنی ماں مریم کا سوال بھی نہیں کرتا، اے اللہ بس مجھے بچا لے۔ مگر کائنات میں ایک ہستی ایسی ہوگی جس کی جھولی قیامت کے روز بھی دوسروں کے لیے پھیلی ہوگی۔ یارب اُمتی اُمتی۔

میرے بھائیوں اور بہنوں، اگر بے وفائی کرنی ہے تو اپنی ذات سے کرو۔ محمد ﷺ سے بے وفائی کرتے ہو جو وہاں بھی نہ بھولیں گے۔

عورت کے حقوق

جب آپ نے حضرت فاطمہؓ کا نکاح پڑھایا تو مجمع کو مسجد میں اکٹھا کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ حضرت جبریل اللہ کا فرمان میرے پاس لے کر آئے ہیں کہ میں حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے کردوں لیکن میں قربان جاؤں شریعت محمدی مصطفےٰ ﷺ پر کہ آسمان سے وحی آگئی لیکن گئے ہیں، حضرت فاطمہؓ سے پوچھنے۔ بیٹی علیؓ کا رشتہ آیا ہے میں تیرا نکاح کردوں۔ ہمارے ہاں بیٹیوں سے پوچھنا عیب سمجھا جاتا ہے۔ بیٹی اگر کوئی رائے دے دے تو کہیں گے کہ بڑی بے حیا ہے۔

آسمان سے وحی آچکی ہے کہ فاطمہؓ کا نکاح علیؓ سے کرایا جائے مگر میرے مصطفےٰ ﷺ بیٹی سے پوچھنے گئے ہیں کہ علیؓ کا پیغام آیا تیرا نکاح اس سے کردوں۔ جب انہوں نے ہاں کی تو پھر واپس جاکر لوگوں کو کہا کہ مجمع اکٹھا کرو۔ پھر منبر پر کھڑے ہوکر فرمایا کہ لوگوں میرے اللہ نے حضرت جبریل کے ذریعے پیغام دیا کہ اپنی بیٹی کا نکاح علیؓ سے کردوں۔ علیؓ کو سامنے بٹھایا اور خطبہ فرمایا اور کہا، علیؓ میں نے چار سو درہم مہر کے عوض میں نے اپنی بیٹی کو تیرے نکاح میں دیا تم نے قبول کیا۔ تو حضرت علیؓ نے زور سے کہا میں نے قبول کیا اور سجدے میں گر گئے۔ اور زور سے دُعا کی اور آپ ﷺ نے آمین کہا اور تمام مجمعے کو شہد کا شربت پلایا اور کھجور کھلائی۔ سبحان اللہ کیا پیاری زندگی ہے۔ خوبصورت زندگی ہے۔ اس سے زیادہ عورت کے حقوق کوئی کیا بیان کرے گا۔

میرے محترم بھائیو اور بہنو!

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں پیدا کرکے بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ ہمارا آنا اپنی مرضی سے نہیں۔ مرنا اپنی مرضی سے نہیں۔ حالات وواقعات بھی ہم پر اس طرح اچانک حملہ کرتے ہیں کہ نہ ان کے حملوں سے کوئی غریب بچتا ہے نہ کوئی کروڑپتی اور نہ کوئی ارب پتی۔

مال سے اگر لوگ خوشیاں خرید سکتے تو مالداروں کے گھروں میں کبھی آہ و فغاں نہ ہوتی اور اگر حکومت و طاقت سے چین، سکون اور راحت خریدی جاسکتی تو حکمرانوں اور مالداروں کے گھر پریشانیوں کی آماجگاہ نہ بنتے۔

یہ کوئی اور طاقت ہے، جس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں جس کی قدرت بڑی کامل ہے کہ جس پر جو حال چاہتا ہے لے آتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے پھیر کر رکھ دیتا ہے۔

"یہ دن ہمارے ہاتھ میں ہیں ہم جیسے چاہیں انہیں پھیر کر رکھ دیں"۔

اَضْحَکَ وَاَبْکٰی مال سے کوئی خوشیاں نہیں خرید سکتا بلکہ میں جسے چاہوں ہنساؤں۔ خوش کردوں، فقر اور فاقہ سے رنج نہیں آتے بلکہ میں جسے چاہوں رنج میں مبتلا کردوں۔

اَضْحَکَ وَاَبْکٰی

ہنسانا بھی اللہ تعالیٰ کہتا ہے میرا کام ہے، رُلانا بھی اللہ تعالیٰ کہتا ہے میرا کام ہے، وہ خوشی لے آئے سارا جہان مل کر اسے رنجیدہ نہیں کرسکتا۔

وہ رنج ڈال دے تو سارا جہان مل کر اسے خوش نہیں کرسکتا۔

تین دن پہلے ایک کروڑوں پتی آدمی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میرا مرنے کو جی چاہتا ہے۔ میرا دنیا میں رہنے کو دل نہیں کرتا، مجھے پتہ نہیں کیا ہے۔ اس کا بیٹا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا، مولوی صاحب! دنیا کی ہر چیز موجود ہے کوئی چیز ایسی نہیں جس کی ہم تمنا کریں اور وہ نہ ملے۔ ہر چیز موجود ہے، ہر تمنا پوری، پھر پتہ نہیں یہ کیوں پریشان ہیں۔ وہ کہے بس میں مرنا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی زندگی نہیں کوئی عمل بتاؤ جس سے میری قبر ٹھیک ہو جائے۔ آخر میں جا کر اس کو خیال آتا ہے۔

تو کوئی اور ہے جو ہمارے حالات و واقعات پر قابض ہے کوئی اور ہے جو زندگیوں کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے۔ خوشیاں لاتا ہے، رنج لاتا ہے۔

محبتیں آتی ہیں، عداوتیں آتی ہیں۔

عزت آتی ہے، ذلت آتی ہے۔

”جسے چاہے عزت دے دے، جسے چاہے ذلیل کردے“۔

تُؤتِی المُلکَ مَنْ تَشَاءُ جسے چاہے بادشاہی دے دے۔

وَتَنزِعُ المُلکَ مَنْ تَشَاءُ جس سے چاہے ملک کو چھین لے۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ ذلت میں سے عزت نکال دے۔

جب اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ فلاں کو عزت دے دی جائے تو کائنات کی ہر ہر چیز اس کی عزت کے لیے استعمال ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ اس کو ذلیل کرتے ہیں اسی میں سے اللہ عزت نکالتا ہے۔

لوگ اس کو نیچا کرتے ہیں ہوائیں اس کو اٹھا کر اونچا لے جاتی ہیں۔

وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فلاں کو ذلیل کردیا جائے تو عزت کی ہر شکل اور عزت کی ہر تدبیر میں اسے اللہ ذلتیں نکالنا شروع کردیتا ہے۔ لوگ اسے اونچا کرنا چاہتے ہیں لیکن ہوائیں اسے نیچا کردیتی ہے۔

لوگ اسے اٹھانا چاہتے ہیں لیکن تقدیر اسے اٹھا کر پٹخ دیتی ہے۔

وہ عزت کی ہر تدبیر اختیار کرتا ہے لیکن اللہ عزت کی ہر تدبیر میں سے ذلت کو نکال کر باہر لے آتا ہے۔

فلاں کو صحت دے دی جائے۔ زہر میں سے اللہ اس کی زندگی کا سامان بناتا ہے۔ کانٹوں میں سے اللہ اس کے لیے پھول اُگاتا ہے۔

اور موت کے اسباب میں اللہ اس کے لیے شفاء ڈال دیتا ہے۔ فلاں کو بیمار کردیا جائے تو صحت کے اسباب میں سے ضعف آکر ڈیرے ڈال دیتا ہے۔

فلاں کی حفاظت کی جائے تو موت اگر اپنے پورے پروں کو پھیلا دے اور سارے پنجوں کو پھیلا دے، اللہ ساری چیزوں کو درہم برہم کرکے موت میں سے زندگی نکال کر لے آتا ہے۔

اللہ فرماتا ہے کہ فلاں کو پکڑ لیا جائے اور حفاظت کا نظام بنا لیا جائے تو تلواروں کی چھاؤں میں، لوہے کی دیواروں میں، لوہے کی [illegible] کے اندر سے اللہ کی

سالانہ اخراجات کا تخمینہ

قیمت فی شمارہ -/80 روپے ۔ سال بھر میں بارہ شماروں کی عام قیمت -/960 روپے

سال بھر کا ائیر میل رجسٹری ڈاک خرچ -/360 روپے ۔ کل رقم -/1320 روپے

آپ صرف -/800 روپے ہمیں ارسال کردیں۔
سال بھر سیارہ ڈائجسٹ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔
صرف یہ کوپن پُر کر کے حوالہ ڈاک کر دیجیے!

اس پیشکش سے فوراً فائدہ اٹھائیں

جناب منیجر صاحب۔ سیارہ ڈائجسٹ

براہ کرم مجھے ماہ........... سے سیارہ ڈائجسٹ ایک سال کیلئے جاری فرما دیں

-/800 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں/ آپ مجھے -/800 روپے کی

وی پی پی ارسال کردیں۔ میں وصول کرلوں گا۔ نوٹ:۔ چیک قبول نہیں کیا جائے گا

نام .... پتہ ....

آپ [illegible] (ATM) اور [illegible] کے دیگر طریقوں سے بھی ہمارے اکاؤنٹ نمبر -1720- ایم سی بی
ریواز گارڈن [illegible] 1222 [illegible] رابطہ نمبر 042-37245412

تقدیر نافذ ہو جاتی ہے۔

"جو اللہ چاہتا ہے وہ کر دیتا ہے، نہ چاہے تو وہ ہو نہیں سکتا۔

بالکل موت تھی آگے بھی پیچھے بھی۔ آگے سمندر پیچھے فرعون، دو موتوں کے درمیان بنی اسرائیل بولے اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ہم مارے گئے۔ مارے گئے کہ آگے سمندر ہے آگے جائیں تو مریں، پیچھے فرعون ہے بیٹھیں تو مریں، تو ہم مر گئے۔

تو جس کی نظر اللہ کے غیب پر جا چکی ہوتی ہے، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:۔

کَلَّا خبردار۔ خبردار۔ ہرگز نہیں۔ کیا موت فرعون کے ہاتھ میں ہے؟ نہیں۔ نہیں۔ کیا موت سمندر کے ہاتھ میں ہے؟ نہیں۔ نہیں بلکہ موت تو آسمان والے کے ہاتھ میں ہے۔

اَمَاتَ وَاَحْیٰ وہ ہے موت کے فیصلے کرنے والا۔

وہ ہے زندگی کے فیصلے کرنے والا اور وہ ہمارے ساتھ ہے ہمیں نہ سمندر مار سکتا ہے اور نہ فرعون ہمیں مار سکتا ہے اللہ جو ہمارے ساتھ ہے۔

"مارو لاٹھی سمندر پر۔ لاٹھی پڑی، جب سے دنیا بنی ہے اس سے لے کر آج دس محرم تک کسی نے پانی کو تھمتے نہ دیکھا، پھٹتے نہ دیکھا، جمتے نہ دیکھا، کھڑا ہوتے نہ دیکھا، سمندر کیا گئے؟ اور تھمنا اور ٹھہرنا کیا گئے، سمندر کیا گئے اور راستے کیا گئیں۔ یہ دو متضاد چیزیں ہیں لیکن جس اللہ نے پانی کو بہنے کا حکم دیا جس اللہ نے پانی میں موجوں کو رکھا جس اللہ نے پانی کا بہاؤ رکھا۔ اسی اللہ نے چند گھنٹوں کے لیے پانی سے اپنا حکم واپس لے لیا۔ نہ کسی کا بہاؤ ذاتی۔ نہ کسی کی سختی ذاتی۔ نہ کسی کی لطافت ذاتی...... نہ کسی کی کثافت ذاتی...... نہ کسی کی عزت ذاتی...... نہ کسی کا جمال ذاتی...... نہ کسی کی بڑائی ذاتی...... نہ کسی کا جمال ذاتی...... نہ کسی کی بڑائی ذاتی...... پیچھے تو اللہ ہے یہ مٹی کا نطفہ، انسان کی اوقات ہے۔

ایک نوجوان کی جوانی کو زوال

نجران میں ایک نوجوان کھڑا ہوا تھا جس کا لمبا چوڑا قد تھا اور ایک شخص اسے دیکھ رہا تھا۔ تو وہ کہنے لگا بابا جی کیا دیکھ رہے ہو۔

کہا بیٹا تیری جوانی دیکھ رہا ہوں۔

وہ کہنے لگا میری جوانی پہ تو اللہ بھی حیران ہوتا ہے۔

میرے حسن پہ تو اللہ بھی حیران ہوتا ہے! بس یہ بول بولنا تھا کہ سب کے سامنے اس کا قد گھٹنا شروع ہوا اور ساڑھے چھ سات فٹ کا آدمی تھا، گھٹتے گھٹتے ایک بالشت رہ گیا۔ ایک بالشت، ساڑھے چھ فٹ سے رب نے گھٹایا، نہ موت دی بلکہ زندہ رکھا اور اسے اس کی حیثیت بتائی کہ یہ تیری اوقات ہے۔ کس کو چیلنج کر رہے ہو؟ کس سے تکرار رہے ہو؟

جانتے بھی ہو یہ کون ہے؟ یہ کل کائنات کا شہنشاہ ہے، بادشاہ ہے، رب ہے، رب پالنے والا ہے۔ پالنے والا۔ زمین کے اندھیرے میں چھپی ہوئی چیونٹی کو بھی رزق پہنچا رہا ہے اور چیونٹی سے بھی ہزاروں گنا چھوٹے وجود کو رزق پہنچا رہا ہے۔

آنکھوں سے بڑی [illegible] سے نظر [illegible] رزق پہنچا رہا ہے۔ اب رب سے

ٹکر لے لی تم نے؟ کس سے ٹکرائے ہو؟

زمین اس لیے بچھائی کہ اس پر تم مست ہو کر چلو؟

اس لیے بچھائی کہ اس پر اکڑ کے چلتے رہو؟ اس پر ناچے، کودتے، گاتے ہو۔ کیا تمہیں خبر نہیں کہ اللہ وہ آنکھ رکھتا ہے جو نہ اونگھتی ہے اور نہ سوتی ہے۔

کیا اسے نظر نہیں آرہا جب تم بے پردہ ہو کر چلتی ہو۔

جب تم زیب و زینت کرکے نکلتی ہو۔

جب تم تکبر کے ساتھ اپنے مال کے گھمنڈ میں، اپنے حسن کے گھمنڈ میں، اپنی کمائیوں کے گھمنڈ میں، جب تم چلتے ہو تو کیا وہ آنکھ سو گئی ہے؟

کیا وہ غافل ہو گیا ہے؟

کیا اسے نظر نہیں آرہا؟

کیا موت تمہارا گلا نہیں دبائے گی؟

کیا قبر تمہیں زیر و زبر نہیں کرے گی۔

کیا اس حسن کو اللہ جبار کہ وقہار مٹی میں نہیں ملائے گا۔ وہ کیڑے بھی تیار ہو چکے ہیں جن میں تقسیم ہو چکی ہے کہ گالوں کا گوشت یہ کیڑے کھائیں گے۔ آنکھوں کا گوشت یہ کیڑے کھائیں گے۔ جسے کاجل سے سجایا اور گھنٹوں جن کی نوک پلک کو سنوارا۔ اس کے تو کیڑے بھی طے ہو چکے ہیں کہ یہ کیڑے اس کی آنکھوں کو کھائیں گے۔ وہ ماتھا جسے جھومر سے سجایا اس کو کھانے والے کیڑوں کی تعداد مقرر ہو چکی ہے۔ اس کا پیٹ، اس کی رانیں، اس کی ٹانگیں، اس کے بازو، اس کی انگلیاں..... کس نے کیا کھانا ہے، رزق بن کر ہمارے وجود میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ جس وجود کو کیڑے کھا جائیں۔

قبر کی گرمی..... جن ہڈیوں کو قبر کی گرمی گلا دے..... گلا دے۔

ابھی تک اے سی چل رہے ہیں..... حالانکہ موسم ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ فضاؤں کے رُخ بدل چکے ہیں لیکن ہماری طبیعتیں اتنی گرمی سہنے کی بھی اب سکت نہیں رکھتیں، اب بھی ایئر کنڈیشنڈ چل رہے ہیں۔ حالانکہ یہ وہی وجود ہے جس کو قبر کی خوفناک گرمی پگھلا دے گی۔ یہ ہڈیاں پگھل جائیں گی..... ریزہ ریزہ ہو جائیں گی پھر ایک زمانہ آئے گا کہ ہم اس طرح بھلا دیے جائیں گے جیسے کہ دنیا میں آئے ہی نہیں تھے۔ ہماری قبروں کے نشان بھی مٹ جائیں گے۔ پھر ایک دن بیٹھے بیٹھے زمین کروٹ بدلے گی نیچے کی مٹی اوپر کردے گی اور اوپر کی نیچے کردے گی۔ وہ حسین جسم، وہ بانکا جوان، وہ پہلوان، وہ شاہ زور وشہسوار جس کی ہڈیوں کو قبر کی گرمی نے پگھلا دیا.....!

پھر ریزہ ریزہ بنایا.....!

پھر مٹی بنا دیا..... یہی شہزادی تھی۔ آج اس کی مٹی نیچے سے اوپر آئی اور اوپر سے ہوا نے حملہ کیا۔ خوفناک جھونکا آیا اور اس کے وجود کو ہوا میں بکھیر دیا اور یہ اسی طرح فضا میں بکھر گئی جیسے کبھی فضاؤں میں بکھری ہوئی تھی۔

یہ اسی طرح مٹ گئی جس طرح مٹی ہی تھی..... کہانی کیا ختم ہوئی بلکہ بھلا دی گئی..... بھلائی کیا گئی بلکہ مٹا دی گئی اور ایسی مٹائی گئی جیسے دنیا میں آئی ہی نہ تھی۔

"ایسے مٹ گئے جیسے کبھی مل بیٹھے نہ تھے"۔
"جب جدائیاں ہوئیں تو ایسے ہو گئے جیسے کوئی مل بیٹھا ہی نہ تھا۔ کس چیز پر فخر ہے؟"

نادان معاشرہ!

وہ بادشاہ جو سوتا نہیں......وہ بادشاہ جو اونگھتا نہیں...... وہ بادشاہ جو غافل نہیں......وہ اللہ جو جاہل نہیں......وہ اللہ جس کے ہاتھ میں لگام......وہ اللہ جباری گردنوں کا مالک۔
وہ اللہ جو جسم کے ریشے ریشے اور روئیں روئیں کا مالک...... وہ اللہ جو جسم میں آنے والی چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی پر بھی نظر رکھے۔ عرش و فرش جس کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہو۔
پھر لوٹ کر بھی اسی کے پاس جانا ہو۔ کیا نادان معاشرہ ہے اسی سے ٹکر لے رہا ہے۔ کہتے ہیں کیا کریں جی سسرال والوں کو بھی خوش کرنا ہے۔
کیا کریں لوگ نہیں مانتے۔
یہ نہیں مانتا وہ نہیں مانتا۔

دربار خداوندی میں حاضری کی کیفیت

وہ کیا دن ہوگا جب اکیلی جان ہوگی اور اللہ کہے گا فلاں بنت فلانہ فلانہ بنت فلانہ۔ فلاں فلاں کی بیٹی حاضر کی جائے فلاں بن فلاں۔ فلاں فلاں کا بیٹا حاضر کیا جائے۔
"ایک ایک مرد و عورت کو فرشتے گھسیٹ کر لائیں گے، گردن میں ہاتھ ڈال کر اللہ کے سامنے کھڑا کریں گے"۔
اس کی حالت کیا ہوگی جیسے بکری کا بچہ ہوتا ہے۔ بکری کا بچہ شہری عورت کیا جانے کہ بکری کا بچہ کیا ہوتا ہے؟
بکری کا جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی ٹانگوں میں اتنی کمزوری ہوتی ہے کہ جب وہ کھڑا ہوتا ہے تو اس کی ٹانگیں کانپتی ہیں۔ کبھی یوں گر جاتا ہے اور کبھی یوں گر جاتا ہے۔
پھر کھڑا ہوتا ہے کبھی یوں گر جاتا ہے اور کبھی یوں گر جاتا ہے، ابھی ٹانگوں میں اتنی جان نہیں کہ وہ مضبوطی سے کھڑا ہو سکے اور چند گھنٹوں کے بعد اللہ تعالیٰ اس کی ٹانگوں میں طاقت پیدا کرتا ہے۔ بکری کے بچے کی وہ کیفیت جس میں جب وہ کھڑا ہو تو لرزے اور کانپے اور کبھی یوں گرے اور کبھی یوں گرے۔ اس کو جزع کہتے ہیں عربی میں جزع۔
تو آج کی بڑی بڑی شہزادیاں۔ بڑے بڑے شاہ زور اور بڑے بڑے شہسوار کو جب اللہ بلائے گا کہ فلاں فلاں کی بیٹی حساب کے لیے پیش ہو جائے۔
فلاں فلاں کا بیٹا حساب کے لیے پیش ہو جائے۔

دنیا اور آخرت کے امتحان کا فرق

جب سکول کا امتحان ہوتا ہے اگر تیاری نہ کی ہو تو کلیجہ باہر آتا ہے۔ اچھل اچھل کر منہ کو آتا ہے اور سینہ پھٹتا محسوس ہوتا ہے۔
میرا فزکس کا پرچہ تھا میٹرک کا۔ میں ساری رات پڑھتا رہا۔ ساری رات۔ مشکل سے کوئی گھنٹہ سویا ہوں گا یا آدھا گھنٹہ۔ اور صبح گیا امتحان دینے ساری رات کی نیند اور تھکاوٹ۔ پرچہ جب سامنے آیا تو سب بھول گیا۔

سب کچھ بھول گیا ایک لفظ بھی یاد نہیں رہا۔

اس بات کو اب چونتیس برس ہو چلے ہیں۔ اس وقت میری کیفیت یہ تھی کہ میرے روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ میں اگر میٹرک میں فیل بھی ہو جاتا تو کیا تھا؟ لیکن اس کے باوجود آپ یقین جانیں کہ پسینے میں میرا سارا وجود برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا اور میں نے قلم رکھ دیا، پرچہ رکھ دیا۔

Paper رکھ دیا اور آدھ گھنٹہ میں گم سم بیٹھا رہا کہ کیا بنے گا؟ کیا بنے گا؟ فیل ہو جاتا تو کیا ہو جاتا کون سا میرا رزق بند ہو جانا تھا یا میرے پیچھے کوئی سولی کھڑی تھی جس پر میں نے لٹک جانا تھا۔ لیکن ایک چھوٹے سے پرچے کے سوالات میری آنکھوں میں گم ہوئے میرے دماغ سے محو ہوئے۔ آج چونتیس برس کے بعد میں آج بھی اس تکلیف کو برداشت کرتا ہوں۔

وہ کیا دن ہوگا جب اللہ پوچھے گا اور سوالات ربانی کے جواب ذہن سے محو ہو جائیں گے۔ جب تیاری ہی نہیں کی ہوگی جواب تو اس وقت آئے گا نہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی تو نہیں ہے کہ میٹرک میں فیل ہو گئے چلو اگلے سال پھر تیاری کرو۔ ایم اے۔ بی اے میں فیل ہو گئے۔ اگلے سال تیاری کرو۔ یہ نہیں ہے بلکہ خوفناک جہنم کی آگ ہے بھڑک رہی ہے۔ بھڑک رہی ہے۔

اللہ کی نظر میں دنیا کی قیمت

میرے بھائیو اور دوستو! جہاں کا بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور بنانے والے کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کو بنانے میں سرمایہ کتنا لگا ہے، محنت کتنی ہوئی ہے، اس کی قیمت کتنی ہونی چاہیے۔ اللہ نے یہ جہاں بنایا ہے اور اس نے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ اس کی قیمت ایک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "اگر یہ دنیا میرے نزدیک مچھر کے برابر بھی قیمت رکھتی تو میں ایک کافر کو ایک گھونٹ پانی کے برابر بھی نہ دیتا"۔

یہاں تو ان کو زیادہ دیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب بات یہ بھی کی کہ:۔

"اور تمہارا خیال نہ ہوتا کہ تم بھی دین چھوڑ جاؤ گے"۔

"میں کیا کرتا کافروں کے دروازے اور سیڑھیاں سونے اور چاندی کے بنا دیتا، ان کی چارپائیاں ان کی کرسیاں، ان کی چھتیں، ان کے گھر، ان کی دیواریں، سونے اور چاندی کی ہوتیں"۔

حدیث میں آتا ہے کہ "ان کے جسم لوہے کے بنا دیتا"۔

لوہے کا مطلب، یہ کہ نہ بیمار ہوتے نہ بوڑھے ہوتے۔

یہ سارا کچھ کیوں نہیں کیا؟

اس لیے پھر خال ہی خال مسلمان رہ جاتے تو اکثر پھسل جاتے، اب بھی اتنے پھسل رہے ہیں کہ ان کو اتنا دے دیا ہمیں کچھ نہ دیا۔ اللہ نے کچھ ہمیں بھی دے دیا اور کچھ ان کو بھی دے دیا۔ کچھ ان پر حالات ڈال دیئے اور کچھ ہم پر حالات ڈال دیئے۔ ان کی مصیبتیں الگ کر دیں اور ہماری مصیبتیں الگ کر دیں، برابر برابر ۱۹، ۲۰ کا فرق رکھ دیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

"یہ دنیا میرے نزدیک اتنی گزری ہے ... [illegible] ... تمہیں پکڑ رکھتا"۔

"اے موسیٰ میرے بندے ایسے ہیں کہ جنت مانگیں تو ساری دے دوں"۔

میرے بھائیو! ایک حدیث میں آتا ہے کہ: جنت کی ایک عورت کا دوپٹہ ساتوں زمینوں کے خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔

صرف ایک دوپٹہ جو خزانے اس وقت ہیں اور جو استعمال ہو چکے ہیں، جو آئندہ استعمال ہوں گے اس کے بعد جو باقی رہیں گے اور قیامت آئے گی تو زمین کے خزانوں میں سے پھر بھی تھوڑا ہی حصہ استعمال ہوا ہوگا باقی حصہ پھر بھی پڑا ہوگا۔ اس کو نکال دیا جائے، جو نکل چکا ہے اس کو بھی واپس لایا جائے، ان سب کو اکٹھا کیا جائے تو ایک دوپٹے کی قیمت زیادہ ہے، تو ساری جنت کیسی ہوگی؟

اللہ کہتا ہے جنت مانگیں تو ساری دے دوں، اور دنیا کے بارے میں کہا کہ کپڑا لٹکانے کے لیے ایک لکڑی چاہیے تو وہ بھی نہیں دوں گا اے اللہ ایک لکڑی دے دے تاکہ اس سے کپڑے لٹکاؤں تو کہتا ہے وہ بھی نہیں دوں گا۔

"اس لیے نہیں کہ وہ میری نظروں میں چھوٹا ہے"۔

"اس لیے کہ میں اس کو قیامت کے دن کی عزت دینا چاہتا ہوں"۔

اللہ کے حبیب کی حالت

حضور اکرم ﷺ ایک باغ میں تشریف لے گئے اور عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ تھے۔ تو جو کھجوریں درخت سے ٹپک جاتی ہیں وہ نیچے گر پڑی ہوتی ہیں۔ ان کو کون اٹھاتا مگر ان کو آپ ﷺ اٹھا کر صاف کر کے کھانے لگے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فرمایا:۔

تُو کیوں نہیں کھاتا؟

انہوں نے کہا "مجھے بھوک نہیں"۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا "آج چوتھا دن ہے میں نے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا"۔

اللہ کو اپنے حبیب سے پیارا تو کائنات میں کوئی نہیں، سب سے محبوب ترین اللہ کو اپنا حبیب ہی ہے، بھلا اپنے حبیب کو کوئی مشکل میں ڈال کر خوش ہو سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے چاہے کافر ہو یا مسلمان ہو، ماں سے ستر گنا زیادہ پیار کرتا ہے۔ تو اپنے حبیب ﷺ سے کتنا پیار کرتا ہوگا۔ اللہ کے حبیب ﷺ نے فرمایا کہ چوتھا دن ہے میں نے ایک لقمہ نہیں چکھا۔

اگر میں چاہتا تو میرا اللہ مجھے ساری دنیا کے خزانے دے دیتا۔ اگر میں چاہتا تو اللہ تعالیٰ میرے قدموں میں روم اور فارس کے خزانے ڈھیر کر دیتا لیکن میں نے نہیں مانگا۔

اے عبداللہ! ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگوں کے گھروں میں سال سال کی روٹی پڑی ہوگی، پھر بھی کہیں گے کہ مزید کہاں سے آئے گی، کہاں سے آئے گی، ان کا یقین برباد ہو جائے گا۔

اور سن لے میں کل کے لیے بھی جمع نہیں کرتا۔

تو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی حیثیت ایسی رکھی ہے کہ مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو ان کافروں کو پانی کا گھونٹ بھی نہ ملتا اور حقیقت بتائی کہ اگر تمہارا خطرہ نہ ہوتا کہ چونکہ اکثر مسلمان کچے ہی ہیں، بہت تھوڑے پکے ہیں، تو اکثر مسلمان [illegible] اگر تم سارے پکے ہو [illegible] تمہیں [illegible] نہ دیتا

یہ تو سارے کا سارا دنیا کا چند روزہ کھیل تماشہ ہے، اصل انجام میرے پاس اللہ سے ڈرنے والوں کا ہے۔
اب اس دنیا کو بنانے والا اس دنیا کی قیمت ہمیں بتا رہا ہے کہ:۔
"یہ ایک دھوکہ ہے"۔
دھوکہ کسے کہتے ہیں؟ ہوتا نہیں مگر نظر آتا ہے، اسی کو دھوکہ کہتے ہیں۔ یہ دنیا نظر آتی ہے، جوانی نظر آتی ہے،
اللہ کہتا ہے، نہیں نہیں تمہاری نظر کا دھوکہ ہے۔
آسٹریلیا کی خوبصورت وادیاں نظر آتی ہیں،
یہ دھوکہ ہے، بڑی بلڈنگیں نظر آرہی ہیں،
حکومت نظر آرہی ہے،
طاقت نظر آرہی ہے
دولت نظر آرہی ہے،
جھوٹی شکل ہے اچھی یا بُری،
حسن کے نقشے ہوں یا بدصورتی کے نقشے ہوں،
عزت کی چوٹی ہو یا ذلت کی پستی ہو،
اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ تمہاری نظر کا دھوکہ ہے، حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔
دھوکے کا گھر، مچھر کا پر۔
اللہ نے اس دنیا کے تین نام دیئے ہیں

1۔ دھوکے کا گھر۔
2۔ مچھر کا پر۔
3۔ مکڑی کا جالا۔

اگر کوئی آدمی مچھر کے پروں سے جھولی بھر لے تو آپ کہیں گے کہ دیکھو بھائی کتنا خوش نصیب ہے، مال لے کر جا رہا ہے یا یہ کہیں گے کہ کتنا پاگل ہے مچھر کے پروں سے جھولی بھر کے جا رہا ہے؟

ایک کلمہ والے کی قیمت

تو بھائی اللہ نے ہمیں ایمان دیا ہے، اللہ کی رحمت کی اتنی بڑی بارش ہمارے اوپر ہوئی ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان بنایا ہے، ساری دنیا کے کافر مسلمانوں کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ساری دنیا کے مشرک، عیسائی، یہودی، مسلمان کی وجہ سے زندہ ہیں، ایمان نہ ہو تو ساری کائنات توڑ دی جائے، مسلمان نہ ہو تو زمین و آسمان کا نقشہ ٹوٹ جائے۔

"اللہ اللہ، جب تک ایک ایک مسلمان بھی زندہ ہے، آپ اندازہ لگائیں اور یہ مسلمان بھی وہ ہوگا: جس کو نہ نماز کا پتہ ہے اور نہ روزے کا۔ نہ حلال کا پتہ ہے نہ حرام کا پتہ ہے، صرف وہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتا ہے۔

اور اسے کچھ پتہ نہیں۔ یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ ہم اس سطح کے نہیں ہیں کچھ اچھے کام بھی کرتے ہیں۔ کچھ بُرے کام بھی کرتے ہیں تو جب تک مسلمان زندہ ہے۔

یہ سورج چمکے گا،
یہ چاند گھٹے اور بڑھے گا،
یہ ہوائیں چلتی رہیں گی،
یہ بادل اٹھتے رہیں گے،
یہ بارشیں برستی رہیں گی،
اور یہ زمین اپنے فلیے اگلتی رہے گی،
یہ موسم بدلتے رہیں گے،
زمین و آسمان کی گردش چلتی رہے گی،
فرشتوں کا آنا جانا ہوتا رہے گا،
یہ پورا نظام چلتا رہے گا۔

یہ بند نہیں ہو سکتا جب تک یہ مسلمان موجود ہے۔ جب یہ مرے گا تو اب اللہ کو اس کائنات کی کوئی ضرورت نہیں، ساری کائنات کے اوپر پوندہ پھیر دے گا، تو مسلمان اتنا قیمتی ہے۔ ہم اپنی قیمت کو محسوس کریں، احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں، آسٹریلیا والے آپ کی برکت سے کھا رہے ہیں، یہ نہیں کہ ہم ان کی برکت کی وجہ سے کھا رہے ہیں، امریکہ والے، یورپ والے، ساتوں براعظم چیونٹیاں تک مسلمان کی برکت سے روزی کھا رہی ہیں۔
شیطان کو بھی رزق مسلمانوں کی وجہ سے مل رہا ہے۔

کافرجنات کو بھی مسلمانوں کی وجہ سے مل رہا ہے،
پرندے چرندے، سانپ کیڑے مکوڑے مسلمان کی وجہ سے رزق کھا رہے ہیں۔

سب سے زیادہ خوش قسمت

جب حضور اکرم ﷺ کا امتی دنیا سے مٹ جائے گا تو ساری کائنات کا نظام توڑ دیا جائے گا۔ اللہ کی کسی کے ساتھ رشتہ داری نہیں ہے اور اللہ نے یہ دولت ہمیں مفت دی ہے۔ بغیر مانگے دی ہے۔ اب ہمارا فقیر سے فقیر آدمی بھی امریکہ کے صدر سے زیادہ خوش قسمت ہے کہ اس نے اللہ کو پہچان لیا اور حضور اکرم ﷺ کو بھی پہچان لیا۔ ہمارا ان پڑھ جاہل، جو انگوٹھے لگانا بھی نہیں جانتا وہ بھی دنیا کے بڑے سائنس دان آئن سٹائن سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ اس نے اللہ اور رسول ﷺ کو پہچان لیا اور اس پاگل نے اللہ کو پہچانا اور نہ رسول اللہ ﷺ کو پہچانا۔ سارے آسٹریلیا کے سائنسدانوں سے ہماری ریڑھی چلانے والا مسلمان زیادہ سمجھدار ہے۔ وہ آخرت کو جان گیا حضور اکرم ﷺ پر اور اللہ پر ایمان لایا، وہ اس کائنات کے رب کو جان گیا اور حضور اکرم ﷺ کو اس کا آخری رسول مان لیا اور اس سے زیادہ دنیا میں کوئی عقل مند نہیں۔

کامیاب اور ناکام انسان

آج کی دنیا میں تصور زندگی یہ ہے کہ مال و دولت ہے، بڑی گاڑیاں ہیں، بڑی بڑی بلڈنگز ہے تو بڑی بہترین زندگی ہے، عام آدمی کے بارے میں پوچھو تو کہتے ہیں کچھ نہیں جی اس کا کیا پوچھنا، بڑا ذلیل آدمی ہے، چھوٹا آدمی ہے، گھٹیا سا آدمی، زندگی کا رُخ ہمیں اللہ کی طرف سے نہیں ملا۔

اللہ نے جو رُخ دیا ہے وہ یہ ہے کہ جو میری مان کے چل رہا ہے اور میرے نبی کی مان کے چل رہا ہے وہ دنیا کا سب سے کامیاب انسان ہے جو مجھ سے ہٹ کر چل رہا ہے اور میرے نبی کے طریقوں سے دُور چل رہا ہے وہ دنیا کا ناکام ترین انسان ہے۔

اللہ کہہ رہا ہے: ”کیا تمہیں پتہ نہیں ہے؟“
”تمہیں پتہ نہیں جو میرا اور میرے رسول کا دشمن ہو جائے وہ جہنم کی آگ میں جائے گا“۔
یہی اصل ناکامی ہے۔
یہی بڑی ذلت و رسوائی ہے۔
ہم سمجھتے ہیں کہ فقیر ہو گئے تو ذلیل ہو گئے، جب کہ اللہ کہتا ہے کہ ”میرے اور میرے رسول کے نافرمان ہو گئے تو ذلیل ہو گئے“۔

حضور ﷺ مسجد میں بیٹھ کے نماز پڑھ رہے ہیں ایک نبی میں چالیس آدمیوں کی طاقت ہوتی ہے اور حضور اکرم ﷺ میں کتنی طاقت ہوگی، آپ ﷺ بیٹھ کے نماز پڑھ رہے ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ آئے اور فرمایا:۔
یا رسول اللہ ﷺ ”میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ بیٹھ کر کیوں نماز پڑھ رہے ہیں؟“
پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ”بھوک، بھوک کی وجہ سے، ہمت نہیں ہے پاؤں میں کھڑے ہونے کی“۔ یہ جو میرا اور آپ کا ذہن ہے اس کے مطابق بڑی ذلت کی بات یہ ہے کہ روٹی نہیں مل رہی۔

سب سے اونچی ذات جس کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو جائے، جہاں ساری کائنات کی وسعتیں ختم ہو جائیں، کائنات کی [illegible] سے بڑی مخلوق جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ جبرائیل علیہ السلام کی جہاں جسمانی اور روحانی

طاقتیں ختم ہوئیں وہاں سے حضورﷺ کی جسمانی پرواز شروع ہوئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر عرش سے ایک تجلی پڑی تو چالیس دن بے ہوش رہے اور ہوش نہیں آیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کو سامنے کھڑا کر کے خطاب فرمایا اور آپﷺ نے ساری تجلیات کو برداشت کیا ہے۔

مسلمان ہونا بہت بڑی دولت ہے

میرے بھائیو! میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان ہونا بہت بڑی دولت ہے، ڈالر سے پاؤنڈ سے، گاڑیوں سے، بنگلوں سے، سب سے اعلیٰ چیز یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں ایمان کی دولت دی ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے لیے حضورﷺ کا آنسو نکلا ہوا ہے لہٰذا کسی کو بھی گھٹیا نہیں سمجھنا چاہیے۔

مسلمان کو ذلیل کرنا بیت اللہ کو گرانے سے بڑا گناہ ہے (الحدیث)

بیت اللہ کو کسی نے توڑ دیا یہ چھوٹا گناہ ہے بانسبت اس بات کہ کسی مسلمان کو بے عزت کر دیا یہ بڑا گناہ ہے۔

کمزور سے کمزور مسلمان کے لیے بھی قیامت کے دن حضورﷺ کی شفاعت ہوگی۔ دنیا کی سب سے قیمتی متاع مسلمان ہیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی جہنم میں رہیں گے تو اللہ پاک انبیاء علیہ السلام سے صدیقین سے، شہداء سے کہے گا جاؤ جتنے انسان جہنم سے نکال کر لا سکتے ہو تو نکالو۔

حضور اکرمﷺ کی شفاعت سے بے شمار مخلوق نکلے گی، اب اللہ پاک فرمائیں گے کہ اب میری باری ہے تم سب فارغ ہو گئے۔

اب اللہ پاک جہنم کے اندر سے ایمان والوں کو نکالے گا۔ اسی طرح تین دفعہ نکالیں گے اور جس کے دل میں سینٹی میٹر کے کروڑواں حصے کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ پھر بھی رہ جائے گا اس کے بعد جہنم سے جبرائیل علیہ السلام کو یا حنان یا منان کی آواز آئے گی کہیں گے ایک ابھی باقی ہے اس کی باری نہیں آئی، تو اللہ پاک کہیں گے جاؤ اس کو نکال لے آؤ تو وہ آئیں گے اور داروغہ جہنم سے کہیں گے، ارے بھائی! ایک الٹا ہوا آخری قیدی ہے اس کو نکال دو، تو وہ جہنم کے اندر جا کر واپس آئیں گے اور کہیں گے کہ دوزخ نے اب کروٹ بدل دی ہے اور ہر چیز پلٹ دی ہے پتہ نہیں وہ کہاں ہے؟ دوزخ کا ایک پتھر ساتوں بڑاعظم کے پہاڑوں پر رکھ دیا جائے تو سارے پہاڑ پگھل کر سیاہ پانی میں تبدیل ہو جائیں گے اور دوزخ کی ایک چٹان ساری دنیا کے پہاڑوں سے وزنی اور بڑی ہے دوزخ میں اگر سوئی کے برابر بھی سوراخ ہو جائے تو اس کی تپک سارے جہان کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ دوزخ سے ایک آدمی کو بھی نکال کر ایک لاکھ آدمیوں میں بٹھایا جائے اور وہ ایک سانس بھی لے تو اس کی ایک سانس کی وجہ سے ایک لاکھ آدمی مر کے ختم ہو جائیں گے۔

یہ قید خانہ ہے کوئی معمولی چیز نہیں ہے کہ دو چار تھپڑ لگیں گے پھر اٹھا کر جنت میں لے آئیں گے، آسان مسئلہ نہیں ہے، اگر ڈھلائی ہوگی تو بڑی زبردست ہوگی تو جبرائیل علیہ السلام آئیں گے اللہ سے عرض کریں گے کہ پتہ نہیں چل رہا وہ کہاں ہے؟

جنت میں جانے والا آخری انسان

اللہ تعالیٰ بتا دے گا کہ جہنم میں فلاں چٹان کے نیچے پڑا ہے، تو وہ آئیں گے چٹان کو اٹھائیں گے تو نیچے سانپ اور بچھو میں پھنسا پڑا ہوگا۔ ایک دفعہ دوزخ کا سانپ ڈنگ مارے تو چالیس [illegible] سال تک [illegible] بخار رہے گا۔ اس کو جھٹکا دے کر [illegible] پھر صاف ہو جائے گا [illegible] نہر حیات میں [illegible] اللہ [illegible] سے وہ [illegible] کی طرح چمکتا ہوا

نکلے گا۔ پل صراط سے اس کو گزارا جائے گا اور پل صراط فقط مسلمانوں کے لیے ہے کافروں کے لیے نہیں ان کو تو سیدھا جہنم کے گیٹ سے داخل کیا جائے گا۔

یہ کافر کے لیے ضابطہ ہے، کہ اندھے گونگے بن کر ان کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ پل صراط مسلمانوں کے لئے ہے، اس پر ان کو گزارا جائے گا تا کہ ان کے ایمان کا پتہ چل جائے۔ بعض ایسے گزریں گے کہ جہنم کی آگ نیچے سے پکارے گی ارے اللہ کے واسطے جلدی چل جلدی "تیرے ایمان نے مجھے ٹھنڈا کر دیا"۔

اور بعض ایسے گزریں گے، مقصود یہ کہ ان کے دونوں طرف آریاں لگ جائیں گی اس کے کانٹے اس کے اندر پھنسیں گے اس کو کہا جائے گا کہ چل وہ کبھی گرے گا کبھی چلے گا۔

وہ پکارے گا کہ: "یا اللہ! پار لگا دے، یا اللہ پار لگا دے"۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا ایک وعدہ کرلے تو پار لگا دوں گا۔

وہ کہے گا کیا؟

اللہ فرمائیں گے کہ: تُو باہر جا کر اپنے سارے گناہ مان لے تو پار لگا دوں گا،

تو وہ کہے گا: پار لگا دیں میں سارے گناہ مان جاؤں گا۔

اب اللہ تعالیٰ پار لگا دیں گے تو سامنے جنت نظر آرہی ہوگی اور پیچھے دوزخ نظر آرہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب بتا کیا کیا تھا دنیا میں، تو اب وہ ڈرے گا کہ مان گیا تو دوبارہ نہ پھینک دیں تو وہ کہے گا کہ میں نے کچھ کیا ہی نہیں، یعنی آخری وقت تک دغا بازی۔

اللہ تعالیٰ کہے گا: گواہ لاؤں۔

تو وہ تسلی کے لیے اِدھر اُدھر دیکھے گا تو کوئی نہیں نظر آئے گا۔ جنت والے جنت میں ہیں اور دوزخ والے دوزخ میں ہیں، وہاں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ پھر اللہ پاک اس کی زبان کو بند کر دے گا اور اس کے جسم سے کہے گا تو بول، پھر اس کے ہاتھوں سے اس کی رانوں سے آوازیں آئیں گی۔ تو وہ کہے گا کہ میرا وجود ہی میرا دشمن ہو گیا۔

وہ کہے گا "یا اللہ بڑے بڑے گناہ کیے تُو معاف کر دے، دوبارہ نہ بھیج" تو اس سے کہا جائے گا کہ جا جنت میں چلا جا، جب جائے گا تو اللہ پاک اس کو ایسے جنت دکھائے گا جیسے کہ وہ ساری کی ساری جنتیوں سے بھری ہوئی ہے۔

تو وہ دیکھ کر واپس آجائے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ارے تُو جاتا کیوں نہیں؟

تو پھر جنت دیکھ کر واپس آجائے گا۔ پھر کہا جائے گا تُو جاتا کیوں نہیں؟

کہے گا آپ نے کوئی جگہ خالی چھوڑی ہی نہیں میں کہاں جاؤں۔

سب سے کم درجہ کی جنت

اب اللہ تعالیٰ اس کی قیمت دے گا، اچھا تُو راضی ہے کہ میں نے جب سے دنیا بنائی تھی اور جس وقت وہ ختم ہوئی اس کا دس گنا کر کے تمہیں دوں گا، کیا تو راضی ہے؟

تو اس کا منہ کھلا رہ جائے گا:

"آپ ہم سے [illegible] مذاق کرتے ہیں حالانکہ آپ تمام جہاں کے رب ہیں تو اس کو یقین [illegible] آئے گا"۔

اللہ تعالیٰ [illegible]

"مجھے اس پر قدرت ہے، جا میں نے تجھے دنیا اور اس کا دس گنا دے دیا۔
کتنی بڑی دولت ہے ایمان کی جو اللہ نے ہمیں عطا فرمائی، فرض نماز کا ایک سجدہ زمین و آسمان سے زیادہ قیمتی ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے:
"جس نے نفل روزہ رکھا، اور اس نفل روزے کے بدلے میں سات بڑا اعظم کو سونے سے بھر کر کہا جائے کہ یہ تیرے روزے کا بدلہ ہے"۔

تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا یہ سب اس کے روزے کا بدلہ نہیں بن سکتا، یہ تو نفل روزہ ہے تو فرض، پھر نماز روزہ سے بھی زیادہ طاقتور اور زیادہ قیمتی ہے، یہ ادنیٰ درجہ کا جنتی جنت میں جائے گا، تو اس کے لیے جنت کا دروازہ جنت کا خادم کھولے گا تو وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر ہی سر جھکائے گا، اور وہ کہے گا: تم کیا کر رہے ہو؟ تو یہ کہے گا تم فرشتے ہو تو وہ کہے گا کہ: میں آپ کا خادم ہوں، اور نوکر ہوں اور اس کے لیے جنت میں قالین ہوں گے اس پر یہ چالیس سال تک چل سکتا ہے اور اس کے دونوں طرف اسی ہزار خادم ہوں گے۔ اور وہ کہیں گے کہ: اے ہمارے آقا آپ اتنی دیر سے آئے، تو وہ کہے گا کہ: شکر کرو میں آ گیا، تمہیں کیا خبر کہ میں کہاں پھنسا ہوا تھا؟ ایسی دھلائی ہو رہی تھی کہ مت پوچھو، اسی ہزار نوکر کوئی تنخواہ ان کو نہیں دینی پڑے گی، ان کا سارا خرچ اللہ کے ذمہ ہے۔

پھر آگے جائے گا تو بڑا چوڑا میدان ہے، جس کے وسط میں ایک تخت بچھا ہوا ہے، اس پر اس کو بٹھایا جائے گا ہر نوکر ایک کھانے کی قسم پیش کرے گا اور ایک مشروب کی قسم پیش کرے گا۔ اسی ہزار قسم کے کھانے، اسی ہزار قسم کے مشروبات، نہ پیٹ تھکے، نہ آنت تھکے، نہ دانت تھکیں، نہ جبڑا تھکے نہ زبان دانتوں کے اندر آئے، یہ سارا نظام اس کے لیے چل رہا ہے اور ہر لقمہ کی لذت اس کے لیے بڑھتی جائے گی بڑھتی چلی جائے گی۔ ہر مشروب کی لذت بھی بڑھتی ہی جائے گی۔ دنیا کا پہلا نوالہ زیادہ مزیدار ہوتا ہے پھر اس سے کم پھر اس سے کم پھر نہ پینے کو جی چاہتا ہے نہ کھانے کو، لیکن جنت میں اس کے برعکس ہوگا، اللہ تعالیٰ ایسی قوت دے گا کہ کھاتا اور پیتا رہے گا۔ پیشاب کوئی نہیں، پاخانہ کوئی نہیں، پھر خادم کہیں گے اب اس کو اس کے گھر والوں سے ملنے دو، وہ سب واپس چلے جائیں گے پھر سامنے سے پردہ ہٹے گا۔

ایک اور پورا جہاں نظر آیا۔

پوری جنت جیسے یہ تخت ایسا ہی آئے گا ایک تخت، اس پر ایک لڑکی جنت کی حور بیٹھی ہوگی اس کے جسم پر ستر جوڑے ہوں گے، ہر جوڑے کا رنگ الگ ہوگا، خوشبو الگ ہوگی، ستر جوڑوں میں اس کا جسم نظر آئیگا، جب چہرے پر دیکھے گا تو اس میں اپنا چہرہ نظر آئے گا اس کے سینے پر نظر پڑے گی تو اس پر بھی اپنا چہرہ نظر آئے گا۔ ایسا شفاف جسم اس کا ہوگا، چالیس سال اس کو دیکھنے میں گم سم رہے گا۔ ابھی ابھی جہنم کے کالے کالے فرشتے دیکھ کر آیا تھا ابھی ایک حور کو دیکھ کر اپنے آپ کو بھی بھول جائے گا۔ چالیس سال دیکھنے میں لگا ہوا ہے، پھر وہ حور اس کی بیہوشی کو توڑے گی۔

"ارے ولی کیا آپ کو میری ضرورت ہے"۔

پھر اس کو جنت [illegible] وہاں بیٹھا [illegible] کہے گی [illegible] اللہ [illegible] تیری آنکھوں کی

ٹھنڈک کے لیے بنایا ہے۔
تو بھائی یہ تو اس سینٹی میٹر کے کروڑواں ایمان کا حصہ ہے، جو اس کے اندر لگا ہوا ہے۔ یہ جنت اس کی قیمت ہے۔
اب امریکہ والوں کے پاس کیا ہے، آسٹریلیا والوں کے پاس کیا ہے تو ہمیں احساس کمتری سے نکلنا چاہیے ہماری برکت سے ساری کائنات کو رزق مل رہا ہے۔ ہم حضورﷺ کی امت ہیں ساری اُمتوں کی سردار اُمت۔
تم سب سے بہترین اُمت ہو سب سے افضل ترین اُمت ہو اللہ کی نظر میں۔
ایک دفعہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ میری اُمت سے کوئی اچھی اُمت ہے؟ میری اُمت پر من و سلویٰ اور بادلوں کا سایہ جیسی نعمتیں رہی ہیں۔
اللہ نے فرمایا:۔
"آپ کو پتہ نہیں محمد (ﷺ) کی اُمت کو ساری اُمتوں پر وہ عزت حاصل ہے جو میری ذات کو میری مخلوق سے عزت حاصل ہے۔ ہمارے تو مزے ہو گئے کہ ہم حضور اکرمﷺ کے اُمتی بن گئے۔
جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس دوں گا۔
مجھے عبدالرزاق نے بتایا اس کو معمر نے بتایا اسے زہری نے بتایا اسے عروہ نے بتایا اسے حضرت عائشہؓ نے بتایا انہیں حضور اکرمﷺ نے بتایا انہیں جبرائیل علیہ السلام نے بتایا۔ جبرائیل علیہ السلام نے بتایا کہ جب کوئی مسلمان اسلام میں بوڑھا ہو کے مرتا ہے تو عذاب دیتے ہوئے میں اس سے شرماتا ہوں،
اے اللہ تجھے پتہ ہے کہ میں اسلام میں بوڑھا ہوں،
میں ستر سال کا بوڑھا ہوں۔
تو اللہ نے فرمایا: ان سب راویوں نے سچ کہا۔ حضورﷺ نے بھی سچ کہا اور جبرائیل علیہ السلام نے سچ کہا اور میں سارے سچوں کا سچ ہوں اس لیے تجھے معاف کیا۔

سارے خزانوں میں قیمتی دولت

اللہ نے بہت بڑا انعام فرمایا کہ ایمان کی دولت ہمیں دے دی، بے مانگے دے دی سارے خزانوں سے قیمتی دولت۔
بھائی یہ قیمت ہے کس لیے۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے اللہ نے ہمارے ذمے بہت بڑا کام لگایا ہے جو ہر مسلمان کرسکتا ہے، اپنے دین کی دعوت دینا اور اپنے دین پر جمنا یہ ہمارا کام ہے، بطور مقصد کے یہ ہمیں ملا، یہ سارے فضائل اس لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کا سلسلہ چلایا اور اس کا عروج محمدﷺ پر ختم فرمایا۔ آپﷺ پر اختتام ہوا، اب تو انسانیت کو ہر وقت ضرورت ہے نبوت کی۔
اس کے اندر برائی بھی ہے اور اچھائی بھی ہے۔
لہٰذا یہ دونوں مادے ٹکراتے رہیں گے نبوت تو ختم ہوگئی حضورﷺ پر اب کون ہے جو انسانیت کی رہبری کا کام کرے؟ اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو منتخب فرما کے اس پوری امت کو مخاطب فرمایا۔
اب میں نے تیری اُمت کو لے لیا ہے۔
اس کا نام بھی [illegible]

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور فخریہ کاوش
لازوال اسلامی واقعات نمبر
قیمت: 160 روپے
شائع ہو گیا ہے۔
☆ رسولِ خدا، خلفاء راشدینؓ، صحابہ کرامؓ اور صالحینؒ کی قابلِ تقلید زندگیوں سے لیے گئے سنہری واقعات
☆ دورِ نبوت، خلافتِ راشدہ اور تاریخ میں موجود عدل و انصاف کی عظیم روایات
☆ مسلم خواتین کی ذہانت متانت اور شجاعت کے حیرت انگیز قصے
☆ دورِ جدید میں نئی نسل کے جذبہ ایمانی کو ازسرِ نو تازہ کر دینے والے روح پرور واقعات
☆ ہر مسلم گھرانے کی لائبریری کی زینت، نوجوانوں کے لئے مشعل راہ۔ دعاؤں کے ساتھ
سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 042-7245412

حضور ﷺ نے فرمایا:

اللہ نے میری اُمت کا نام بھی اپنے نام پر رکھا ہے۔

اللہ کا نام سلام ہے۔

اللہ نے میری اُمت کا نام مسلمین رکھا ہے۔

ہم سے پہلے کسی اُمت کا نام مسلمین نہیں رکھا گیا، یہود، نصاریٰ، مسلم صرف اس امت کو خطاب ملا ہے،

اللہ کا نام مومن ہے میری اُمت کا نام اللہ نے مومنین رکھا ہے۔

سارے نبیوں پر جب تک میں نہ چلا جاؤں اور ساری اُمتوں پر بھی جب تک میری اُمت جنت میں نہ چلی جائے وہ کہیں گے کہ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے یہ لوگ آئے ہمارے بعد اور جا رہے ہیں ہم سے پہلے تو اللہ پاک فرمائیں گے:

یہ میرا فضل ہے جسے چاہوں دوں۔

ارے بھائی بحیثیت مسلمان، اللہ اکبر، خدا کی قسم سات زمین و آسمان کی دولت اس کے سامنے ہیچ ہے کہ میں مسلمان ہوں میرے پاؤں میں جوتے نہ ہوں جسم پر کپڑے نہ ہوں، کھانے کو روٹی نہ ملے دردر کی ٹھوکر کھایا ہوا ہوں پھر بھی میرے پاس آسمان و زمین سے قیمتی دولت ہے۔

اللہ نے ایمان دیا اور ایمان کی محنت دی اب اللہ کا تعارف کرانا اس اُمت کا کام بن گیا۔ پہلے نبی کا کام ہوتا تھا کہ جاؤ لوگوں کو بتاؤ کہ تمہارا رب اللہ ہے اور آگے موت ہے اور حشر ہے، آگے حساب و کتاب ہے لہٰذا اللہ کی مان کے چلو یہ اللہ کا بھیجا نظام ہے۔ خبردار کرنا نبی کا ذمہ تھا، جنت سے جہنم سے خبردار کرنا ہر نبی کا کام ہے۔

اللہ نے حضرت محمد ﷺ کی ختم نبوت کے طفیل یہ کام اس اُمت کو دیا ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا تعارف کروائے یہ ہمیں بطور کام کے ملا ہے۔ یہ جو کمپنیوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں یہ کمپنی کی دوا بیچتے ہیں کمپنی ان کو پیسہ بھی دیتی ہے اور لائسنس بھی دیتی ہے، گھر بھی دیتی ہے اور گاڑی بھی دیتی ہے، اس طرح ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سفیر ہیں اللہ کا تعارف کرانا ہمارا کام ہے۔

ہمارے بڑے کا بھی چھوٹے کا بھی،

نوجوان کا بھی بوڑھے کا بھی،

ان پڑھ کا بھی، پڑھے لکھے کا بھی،

ڈاکٹر کا بھی، انجینئر کا بھی،

عورت کا بھی، مرد کا بھی،

غریب کا بھی، امیر کا بھی،

چاہے ہم افریقہ میں چلے جائیں یا دنیا کے کسی گوشے میں چلے جائیں تو ہمارا کام نہیں بدلے گا۔

حضور اکرم ﷺ کے امتی ہونے کے ناطے ہمیں بڑا عزت والا کام دیا گیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ہمیں اپنا سفیر بنایا، سفیر کی طاقت اس کی حکومت کی طاقت کے برابر ہوتی ہے، ہم اللہ کے سفیر ہیں ہمارے پیچھے اللہ کی طاقت ہے، آپ جہاں کہیں بھی رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سفارت کا کام دیا ہے۔

ارے بھائی [illegible] سمجھانا کہ [illegible] اللہ تعالیٰ کے [illegible] ہمارا کام ہے اس وقت

سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ کمائیں گے تو پیسہ آئے گا، پیسہ آئے گا تو ضرورتیں پوری ہوں گی، ضرورتیں پوری ہونے سے ہمارے حالات درست ہو جائیں گے، ہم ان کو یہ سمجھائیں کہ ساری کائنات پر بادشاہی صرف ایک اللہ کی ہے۔

یہ بات ہر انسان کو سمجھانی ہے، آسمان پر اللہ بادشاہ ہے اور زمین پر بھی اللہ بادشاہ ہے اور تحت ثریٰ میں بھی اللہ بادشاہ ہے۔

یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم ہر گھر میں جا کر ان کو بتا دیں کہ اللہ کی مان کر اس کی زمین پر چلنا ہی کامیابی ہے، اللہ کا یہ نظام بھی عجیب ہے کہ اپنے دین کا کام اکثر غریبوں سے لیتا ہے اور مالداروں سے زیادہ نہیں لیتا کیونکہ ان کا گمان ہے کہ جب پیسہ آئے گا تو تبلیغ کریں گے، اللہ کہتا ہے دنیا میں تو جتنا تھوڑا ہو گا اتنا ہی آسانی سے میرا قرب نصیب ہو گا۔

صحابہؓ کا مقام اللہ کے ہاں

دو سردار آئے اقرع بن حابس اور عیینہ بن حسن فزاری حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں کہ ہم آپ کی بات سن لیتے ہیں لیکن ان غریبوں کو اٹھا دو، بلالؓ ہے، صہیبؓ ہے، عمار بن یاسرؓ ہے، عبداللہ بن مسعودؓ ہے۔ یہ غریب لوگ ہیں چھوٹے ہیں، ان کو اٹھاؤ، ان کے ساتھ بیٹھنا ہماری ہتک ہے (ہماری شان کے خلاف ہے)۔ پھر ہم آپ کی بات سنیں گے، ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم تو آپ کے غلام ہیں، ہم کو اٹھا لیں یا ہم کو بٹھا لیں تو بھی ہم آپ ہی کے ہیں تو ممکن ہے ہم کو اٹھانے سے وہ بیٹھ جائیں اور بات سن کر ایمان لے آئیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: بات تو ٹھیک ہے تم آؤ گے تو یہ نہیں ہوں گے، انہوں نے کہا ہمیں لکھ کر دو کہ آپ نے ان سے کہا کہ لکھو، لکھنے والے کے آنے سے پہلے اللہ نے جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا۔

ان کو آپ نہیں اٹھا سکتے، وہ آئے یا نہ آئے۔

حضور اکرم ﷺ امیہ بن خلف سے بات کر رہے ہیں اور عبداللہؓ ابن مکتوم آ گئے جو نابینا بھی ہیں اور غریب بھی، حضور اکرم ﷺ ان کو سمجھا رہے تھے اور وہ بڑی توجہ سے آپ کی باتیں سن رہے تھے اتنے میں عبداللہ ابن مکتوم آ کے فرمانے لگے۔

"یا رسول اللہ ﷺ علمنی ما علمک اللہ"

اتنا سا خیال آیا تو ادھر سے جبرائیل علیہ السلام آئے۔

"عبس وتولیٰ، ان جاءہ الاعمیٰ....." آخر تک یہ کلام پڑھا۔

جس کا مطلب ہے کہ اچھا، آپ ﷺ کے ماتھے پر تیوری چڑھ گئی، منہ پھیر لیا، کیونکہ یہ غریب آپ ﷺ کے پاس آ گیا اندھا آ گیا، جو کہ آپ ﷺ کی ہدایت کا طلب گار ہے، اور آپ ﷺ سے کچھ سیکھنا چاہتا ہے اور یہ بدبخت اس کو نہ آپ ﷺ کی قدر نہ دین کی قدر نہ میری پہچان اور اس کی وجہ سے آپ اس غریب کو چھوڑ رہے ہیں۔

یہ مسلمان چاہے غریب ہو یا امیر ہو، اگر یہ ٹھان لیں کہ مجھے دین زندہ کرنا ہے تو اللہ اس سے کام لے گا، اس کی غریبی نہ آڑے آئے گی نہ اس کا پیسہ آڑے آئے گا۔

وہ سٹے بازی کا شکار ہوگیا

سید سجاد حسین کاظمی

وہ رقم لے کر رفو چکر ہو گئے۔ بیس ہزار روپے ہاتھوں سے نکل گئے۔ کاروبار ختم ہو کر رہ گیا۔ ایک خوش حال خاندان پر مفلسی کی گھٹائیں چھا گئیں راتوں رات امیر بننے کا خواب تباہی کا موجب بن گیا!

ایک شخص کا ماجرا، وہ راتوں رات امیر بننے چلا تھا

صبح سات بجے کا وقت تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور مئی کا مہینہ ہوا میں کچھ خنکی سی تھی۔ گرمی کی حدت سے بچنے کے لیے لوگ اپنے اپنے کاروبار پر جا رہے تھے۔ نعیم صاحب بھی اپنی دکان پر پہنچے۔ نوکر نے دکان کھول کر صفائی کر دی تھی اور ابھی جھاڑ کا کر رہا تھا کہ ایک خوش پوش نوجوان آیا۔ نعیم صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ دکان کے باہر ہی دو کرسیاں منگوائیں اور دونوں بیٹھ گئے۔ نوکر کو چائے منگوانے بھیج دیا۔ نعیم صاحب کا لوہے کا کاروبار تھا۔ کل سرمایہ پچیس اور تیس ہزار کے لگ بھگ تھا۔ وہ اپنے آٹھ بچوں، بیوی، والدہ، ایک بیوہ

بھن اور اس کے دو بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت بڑی خوش اسلوبی سے کر رہے تھے۔ وقت بڑا اچھا گزر رہا تھا۔ تفکرات کی دنیا سے بہت دور ہنسی خوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ چائے آگئی نعیم صاحب نے پیالیوں میں چائے انڈیل کر نوجوان دوست کو پیش کی اور ساتھ ہی باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ نوجوان جس کا نام اسلم تھا، کہنے لگا "نعیم صاحب میرے ایک دوست کو سریے اور دیگر عمارتی لوہے کی ضرورت ہے۔ وہ ایک امیر کبیر سیٹھ کا مختار عام ہے۔ سیٹھ صاحب اپنی دو کوٹھیاں بنا رہے ہیں۔ سارا لین دین میرے دوست کی معرفت ہوتا ہے۔ وہ ہی خرید فروخت کرتا ہے کل اس نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ اسی وقت مجھے آپ کا خیال آگیا۔ آپ اس سے مل کر معاملہ طے کرلیں"۔

چونکہ نعیم صاحب کے مطلب کی بات تھی کہنے لگے "اسلم صاحب میں آپ کا نہایت مشکور ہوں جو آپ نے میرے مفاد کو مدنظر رکھا۔ آپ کل دو بجے ان کو لے کر میری دکان پر آجائیں"۔

دو بجے اسلم صاحب ایک آدمی کو لیے وارد ہوئے اچھا خوش پوش معزز آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اسلم صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ ہیں میرے دوست مختار صاحب جن کا ذکر میں نے کل صبح آپ سے کیا تھا"۔

نعیم صاحب نے بڑے احترام سے ان کو بٹھایا چائے منگوائی اور سلسلہ کلام شروع کیا۔ مختار صاحب کہنے لگے "نعیم صاحب سرسری ذکر تو اسلم صاحب نے کردیا ہوگا دراصل بات یہ ہے کہ مال تو اور بھی بہت سی دکانوں سے مل سکتا ہے، اسلم صاحب کی معرفت آپ سے ملنے کا مطلب یہ ہے آپ میرے ہمراز بن جائیں اور مل کر فائدہ اٹھائیں۔ میرا مالک نہایت عیاش، فضول [illegible] ہے۔ دولت [illegible]

طرح اُڑا رہا ہے۔ اللہ تعالٰی نے اسے بے اندازہ دولت دے رکھی ہے مجھ پر کامل بھروسا کرتا ہے۔ ضرورت کی ہر چیز میں ہی خریدتا ہوں۔ تنخواہ صرف دس ہزار روپے ماہوار ہے۔ بڑی مشکل سے خرچ پورا ہوتا ہے۔ آپ ایسے حالات پیدا کریں جس سے آپ بھی فائدہ اُٹھائیں اور میں بھی۔ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہو۔ میرے اندازے کے مطابق سات یا آٹھ لاکھ روپے کا سریا کھپ سکے گا۔ اس میں سے معقول رقم مجھے ملنی چاہیے۔ کل میں اپنے مالک سے آپ کی ملاقات بھی کروا دوں گا اور کم از کم دو لاکھ روپے پیشگی بھی لے دوں گا۔ آپ کل پانچ بجے تیار رہیں۔ میں اسلم صاحب کو بھیج دوں گا۔ آپ دکان سے فارغ ہوکر ان کے ساتھ آجائیں لیکن دیکھنا بڑے محتاط رہیں"۔ "جی آپ بالکل فکر نہ کریں میں ہر طرح آپ کا تابعدار ہوں"۔ نعیم صاحب بڑے ممنون ہوکر کہنے لگے۔

ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ دو تین لاکھ روپے نفع کی توقع تھی پھر کل دو لاکھ روپے پیشگی بھی ملنے والے تھے۔ کبھی اسلم کے ممنون ہو رہے تھے کبھی مختار صاحب کے۔

دوسرے دن ٹھیک پانچ بجے اسلم صاحب پہنچ گئے۔ نعیم صاحب نے دکان کو مقفل کیا۔ نوکر کو بلا کر دو روپے انعام دیے کہ جاؤ فلم دیکھو۔ آج دو لاکھ روپے کی رقم ملنے والی ہے۔ بڑی خوشی خوشی اسلم کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ ابھی تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ سامنے سے آتے ہوئے ایک صاحب مل گئے جنہوں نے ملتے ہی شکایتوں کا دفتر کھول دیا۔ کہنے لگے "اسلم صاحب آپ کے دولت خانے پر کئی بار گیا وائے قسمت کہ ملاقات نہ ہوسکی"۔

[illegible] صاحب [illegible] کہنے لگے "ہاں یار بچوں نے بتایا

تھا وہ آپ ہی تھے اچھا اچھا فرمائیے"۔

وہ صاحب کہنے لگے "کوئی جیے یا مرے آپ کو کیا بس آپ تو اپنے حال میں مست ہیں"۔

اسلم صاحب کہنے لگے "نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں آپ حکم کریں"۔ "جی چھوڑیے حکم کیا میں عرض کرتا ہوں اور وہ بھی دست بدستہ میرے بچوں پر رحم کھائیے۔ زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا"۔

ایسے میں اسلم صاحب ایک دکان سے سگریٹ لینے چلے گئے اور وہ صاحب جن کا نام مسٹر اشفاق تھا اور جن کے چہرے بشرے سے پریشانی نمایاں تھی۔ نعیم صاحب سے گویا ہوئے۔ اسلم صاحب آپ کے دوست ہیں نا۔ برائے مہربانی ان کو کہیے کہ میرا کام کرادیں ان کی تھوڑی سی کوشش میری زندگی سنوار دے گی۔ میں اس کے لیے پانچ ہزار روپیہ خرچ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ خواہ یہ رشوت نہیں بلکہ ایک ٹی پارٹی دینے کے لیے تیار ہوں لیکن میرا کام ضرور ہونا چاہیے۔

نعیم صاحب کہنے لگے "بھائی یہ تو بتاؤ کام کیا ہے اور کس سے متعلق ہے" اسلم صاحب کے ایک دوست مختار صاحب ہیں میرا اور ان کا ایک کاروباری جھگڑا ہو گیا ہے۔ بس میری ان سے صلح کرادیں تاکہ میرا کاروبار بحال ہو سکے میں زندگی بھر آپ کا بھی اور ان کا بھی احسان مند رہوں گا"۔ اسلم صاحب بھی سگریٹ لے کر آ گئے۔ نعیم صاحب اسلم کو لے کر ذرا پرے چلے گئے کہنے لگے "دوست پانچ ہزار روپے بھی دیتا ہے اور بے چارہ منتیں بھی کر رہا ہے اس کا کام ضرور کرو"۔ اسلم کہنے لگا "کام تو اس کا مختار کرے گا۔ اسے جو کچھ کہہ دوں کرے گا۔ آپ نے میرے... اور اس کے تعلقات بھی دیکھے ہیں میں کام کرادوں گا لیکن آپ اس سے پانچ ہزار روپے کا وعدہ لے لیں۔ کام ہونے پر ہمیں دے دے۔ میں خود اس سے روپے کی بات چیت نہیں کر سکتا۔ یہ کام آپ سرانجام دیں۔ نعیم صاحب نے اشفاق سے بات پکی کر لی اور اس کو بھی ساتھ لے لیا۔ تینوں ایک ہوٹل میں پہنچ گئے۔ مختار صاحب انتظار کر رہے تھے۔ اسلم اور نعیم کہنے لگے "مختار صاحب ایک آدمی راستے میں مل گیا تھا جس کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ اس آدمی کو آپ سے کچھ کام ہے۔ پہلے وہ کریں اور ہمارا بعد میں۔ بہت ہی مجبور انسان ہے یہ بھی نیکی کا کام ہے۔ وہ باہر کھڑا ہے حکم ہو تو بلوا لیجیے"۔ نعیم صاحب اشفاق کو لے کر اندر آ گئے۔ اشفاق نے آتے ہی بڑے رحم طلب انداز سے مختار کو سلام کیا اور اس انداز سے بیٹھا جیسے نہایت شرمندہ ہو۔ نعیم اور اسلم نے پرزور سفارش کی کہ اس کا کام کردیں لیکن مختار کہنے لگا "اب اس کا کام نہیں ہو سکتا کیونکہ اس نے خود ہی کام بگاڑ دیا ہے"۔ اسلم کہنے لگا "آخر کام کیا ہے جو نہیں ہو سکتا ہمیں بھی تو پتہ چلے" مختار کہنے لگا کہ "اچھا سنو یہ آدمی ایک دن مجھے ریس کورس میں ملا تھا۔ میں اپنے مالک خان امتیاز کے ساتھ گیا تھا۔ ریس کے بعد جب ہم لوٹنے لگے تو یہ صاحب میرے پاس آئے۔ کہنے لگے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ میں نے کہا اس وقت خان صاحب ساتھ ہیں لہٰذا کل بارہ بجے آپ کو مکو میں ملوں گا۔ میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ یہ صاحب میرا انتظار کر رہے تھے مجھے بڑے تپاک سے ملے خوب دل کھول کر تواضع کی۔ میں حیران تھا کہ آخر ایک اجنبی آدمی میری اس قدر خاطر کیوں کر رہا ہے ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ کہنے لگے مختار صاحب آپ میری تھوڑی سی مدد کریں تو بڑے آسان طریقے سے

کافی روپیہ کمایا جا سکتا ہے۔ زندگی سدھر جائے گی۔ بس آپ تھوڑا سا تعاون کریں۔ میں نے کہا بتایئے۔ کہنے لگے پہلے وعدہ کریں۔ میں نے کہا اتنا وعدہ کرتا ہوں کہ میرے بس کا روگ ہوا تو پورا پورا تعاون کروں گا۔ یہ بڑی لمبی تمہید کے بعد کہنے لگے۔ آپ کے خان صاحب کلب میں جا کر جو فلاش کھیلتے ہیں۔ میں اس کا ماہر ہوں۔ آپ مجھے ان سے ملا دیں کیونکہ وہ آپ کے بغیر مجھ سے میرے ساتھ نہیں کھیلیں گے۔ آپ کا کیا جائے گا۔ وہ کیسے بھی اس قدر دولت ضائع کر رہے ہیں اگر میرے جیسے آدمی کے کچھ روپیہ ہاتھ لگ جائے تو اس مال کا صحیح مصرف کروں گا اور اچھی جگہ پر لگاؤں گا۔ میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا۔ میں نے کہا کہ اپنی مرضی سے جتنی دولت چاہیں ضائع کریں میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا جس کی وجہ سے کل کو تنگی ہو۔ ملازمت بھی جاتی رہے۔ اس وقت انہوں نے بڑا فصیح و بلیغ لیکچر دیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس قسم کے عیاش آدمی جس کی دولت کا زیادہ حصہ بُرے کاموں پر صرف ہوتا ہو اگر جائز طریقے سے لے کر کسی اچھے طریق پر صرف کی جائے تو کوئی گناہ نہیں۔ جب یہ بات کر رہے تھے تو میرے اور خان صاحب کے درمیان گزرے ہوئے لمحات میری آنکھوں کے سامنے بالکل فلم کی طرح گزر رہے تھے۔ خان صاحب کی ذہنیت خالص سرمایہ دارانہ ہے۔ اپنی ذات پر ایک رات میں خواہ لاکھوں روپے خرچ کر دیں مگر دوسرے کی ذات پر دس روپے بھی خرچ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ بُرے کاموں میں دولت روئی کے گالوں کی طرح اُڑا رہے ہیں کسی نیک کام میں ایک روپیہ بھی خرچ کرنا ان کے لیے بڑا مشکل ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر میں نے

ان سے حامی بھر لی پھر انہوں نے مجھے کہا کہ روپیہ پیچھے پڑے جیسی پیسے آپ کو بھی ملیں گے۔ میں دوسرے دن ان کو لے کر خان صاحب کی کوٹھی چلا گیا اور بڑے موزوں لفظوں میں تعارف کرایا۔ خان صاحب کو جب پتہ چلا کہ میری قماش کے ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ شراب کے دور چلنے لگے اور اسی دوران میں انہوں نے تاش نکال لی اور خان صاحب کو فلاش کھیلنے پر آمادہ کر لیا۔ بس یہ کھیلنے لگے اور میں کسی کام سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو ان کے سامنے ڈھیر سارے نوٹ پڑے تھے اور فلاش جاری تھی۔ نشے میں وحشت شرطیں بند رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے خان صاحب سے دو لاکھ روپے جیت لیے اور کھیل ختم کر دیا۔ خان صاحب سے اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب میں اپنی جگہ بڑا خوش تھا کہ اچھی خاصی رقم ہاتھ لگی۔ کہاں تھوڑی تھوڑی کمیشن لینے والا آدمی اور کہاں اتنی بڑی رقم۔ میں جلدی جلدی ان کو رخصت کرنے کے لیے باہر آیا اور انہوں نے مجھے نوٹوں کا بنڈل کھول کر کچھ نوٹ اندازے سے دے دیئے۔ جب میں نے آ کر گنے تو چالیس ہزار روپے تھے حالانکہ معاہدے کی رو سے مجھے پچاس ہزار ملنے تھے۔ خیر میں نے کہا کل دے جائے گا۔ اس کا انتظار چار دن تک کرتا رہا لیکن یہ نہ آیا۔ مجھے تو یہ پتا تھی کہ آ کے دوبارہ کھیلے لیکن یہ تو عیاشی میں لگا ہوا تھا۔ ایک دن مجھے اچانک مل گیا۔ میں نے سلام کیا تو اس نے مجھے بجائے روپے دینے کے بہت بے عزت کیا۔ میں نے واپس آ کر خان صاحب سے کہہ دیا کہ اب اس آدمی کے ساتھ نہ کھیلا کریں چنانچہ یہ ایک دن خود ہی ان کے پاس گیا [illegible] انہوں نے [illegible] سا جواب دیا تو پھر اس کی

آنکھیں کھلیں۔ اب آیا یہ اپنی اصلیت پر لیکن میں تو خان صاحب کو بتا چکا تھا کہ یہ شار پر ہے۔ اب آپ بتائیں کہ میں کیا کروں۔ اشفاق کہنے لگا "اچھا پھر ایسا کرو کہ میرا ایک بھائی ہے اس کو بٹھا دیتے ہیں"۔

مختار کہنے لگا "نہیں تو نے بھی ایسا کیا اور اگر تیرا بھائی سارے روپے لے کر چلتا ہے تو کون ذمہ دار ہے مجھے تم پر بھروسا نہیں۔ ہاں..... اگر فائدہ حاصل کرنا ہے تو میرے آدمی کو گر بتادو۔ اسے بٹھا دیں گے"۔

اشفاق کہنے لگا "یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ خربوزہ آپ کے پاس رہے اور چھری میرے پاس۔ اگر میں چھری بھی آپ کو دے دوں تو میرے پاس کیا رہ جائے گا، آدمی میرا ہی بٹھایئے"۔

اب نعیم اور اسلم بھی خاصی دلچسپی لے رہے تھے۔ قصہ مختصر کافی رد و کد کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ کسی غیر جانبدار آدمی کو لے لیں۔ نعیم اور اسلم اُسے ساتھ لے کر آئے ہیں ان کے اوپر بھروسہ کر سکتا ہے۔ کہنے لگا "ہاں کر سکتا ہوں"۔

اسلم کو تو خان صاحب جانتے ہیں نعیم صاحب کو نہیں جانتے یہ ان کے لیے اجنبی ہیں۔ تو اپنا آرٹ ان کو بتا دے۔ پہلے تو پچھتر پیسے لے گیا تھا اور میں نے پچیس لیے تھے۔ ہم دو آدمی تھے۔ اب ہم چار آدمی ہیں چار حصے برابر کے کریں گے۔ پچیس پچیس پیسے سب لیں گے"۔

تھوڑی سی بحث کے بعد اشفاق راضی ہو گیا۔ اب مختار صاحب کہنے لگے، نعیم صاحب، خان صاحب سے ویسے بھی آپ کو ملنا ہے ماشاء اللہ آپ کی شخصیت بھی اچھی ہے آپ ان سے آرٹ سیکھ لیں اگر آپ ماہر ہو جائیں تو میں گیم کرا دوں گا اور ساتھ ہی کاروباری بات بھی ہو جائے گی۔ وہ [illegible] بھی لے لیں گے اور [illegible] سے [illegible] لو اور اُدھر سے [illegible]۔

اب تو پانچوں گھی میں ہوں گی"۔

نعیم صاحب بڑے خوش ہوئے اور خود کو خوش نصیب سمجھنے لگے۔ طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکانے لگے۔ ایک ہوٹل میں جا کر کمرہ نعیم صاحب کے نام بک کرالیا۔ پتہ ہوٹل میں کسی دوسرے شہر کا لکھوا دیا۔ کمرے میں پہنچ کر پہلے تو چاروں نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کلمہ شریف پڑھا اور معاہدہ کیا کہ راز صرف ہم چاروں تک رہے گا۔ اس کے بعد اشفاق نے جو کہ اب اس کا استاد تھا۔ نعیم صاحب سے علیحدہ حلف لیا کہ میرا آرٹ کسی اور کو یا ان کو بالکل نہیں بتایا جائے گا۔ اب استاد نے نعیم صاحب کو سکھانا شروع کیا۔ نعیم صاحب تقریباً بیس منٹ میں ماہر ہو گئے۔ بڑے خوش ہوئے، کہنے لگے اب تو میں خان صاحب کی ساری جائیداد جیت لوں گا۔ چند ہی دنوں میں لکھ پتی بن جائیں گے"۔

اس وقت کمرے میں صرف دونوں استاد اور شاگرد تھے۔ اب مختار اور اسلم بھی آ گئے۔ مختار صاحب نے انٹرویو لیا تو نعیم صاحب کو تیار پایا۔ کہنے لگا "دوست مبارک ہو اب سمجھ لو کہ دولت ہمارے قدم چومے گی۔ اب تم اور مشق کرو اور میں خان کو لے آؤں۔ میں ان سے آپ کا تعارف غائبانہ کرا دوں گا اور آپ کو بھی بہت بڑا زمیندار اور کاروباری ظاہر کروں گا۔ ساتھ ہی ان سے کہہ دوں گا کہ ان کا لوہے کا کارخانہ ہے اور بیس ہزار ٹنگی بھی دلوا دوں گا۔ اب میں جاتا ہوں خان صاحب کے آنے پر استاد کو باہر نکال دینا۔ یہ تو ان کے سامنے نہیں آسکتا"۔

پچیس منٹ بعد خان کو لیے مختار بھی آ گیا۔ آتے ہی بڑے اچھے طریقے سے نعیم صاحب کا تعارف کرایا اور کہنے لگے "خان [illegible] احب نعیم صاحب بھی [illegible] پ ہی کی طرح [illegible] فلاش [illegible] بڑے رسیا

ہیں۔ اگر دو دو ہاتھ ہو جائیں تو بڑا لطف آئے گا“۔

خان صاحب کہنے لگے ”خوب بہت خوب، چلیے شروع کیجیے“ جب نعیم صاحب نے شرط قبول کی تو خان صاحب کہنے لگے ”ٹھہریے یہ دیکھیں اور ساتھ ہی اپنے بیگ سے نوٹوں کے ہزار ہزار روپے کے دو بنڈل نکال کر دکھاتے ہوئے کہا: ”میرے پاس تو کیش ہے کیا آپ کے پاس بھی ہے۔ گیم کا مزہ تب ہی آتا ہے کہ لین دین برابر ہوتا رہے“۔

قبل اس کے نعیم صاحب کچھ بولیں، مختار صاحب کہنے لگے خان صاحب اس وقت ان کا خزانچی کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ ان کی طرف سے ہر طرح کا ذمہ دار میں ہوں۔ آپ میری ذمہ داری پر کھیلیں اگر یہ ہار گئے تو میں آپ کو ادا کروں گا فکر نہ کریں“۔

خان صاحب کہنے لگے ”اچھا میں گیم شروع کرتا ہوں لیکن لین دین کیش دیکھ کر ہوگا۔ جتنا یہ جیت لیں مجھ کو اسی قدر دکھا کر لے سکیں گے“۔

یہ شرط طے ہونے کے بعد نعیم صاحب نے چار لاکھ روپے جیت لیے۔ اب سوال تھا اتنا ہی روپیہ دکھاؤ اور لے لو۔ مختار صاحب کہنے لگے آپ کل صبح نعیم صاحب کا کیش دیکھ لیں اور ادائیگی کر دیں“۔

خان صاحب کہنے لگے ”اچھا نعیم صاحب کل مجھے چار لاکھ دکھا کر لے لیں۔ یہ کل شام تک میرے لیے حرام اور آپ کے لیے حلال۔ اس کے بعد میرا اور آپکا معاہدہ ختم ہاں مجھے بلانے کے لیے ایک رقعہ مختار صاحب اپنی طرف سے لکھ دیں میں حاضر ہو جاؤں گا اور کیش دیکھ کر ادائیگی کر دوں گا اور صرف آپ ہی کو ادا کروں گا۔ آپ [illegible] طرف سے آئے ہو۔ [illegible] اور دی گولی دوں گا“۔

خان صاحب رخصت ہو کر چلے گئے اب پھر نعیم صاحب، مختار، اسلم اور استاد رہ گئے۔ اب سوال یہ تھا کہ اتنا ہی کیش کل دکھائیں اور لے لیں۔ اب پھر چاروں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا اور کلمہ پڑھ کر وعدہ کیا کہ راز ہم میں ہی رہے گا۔ اب سب کل اتنا روپیہ اکٹھا کریں۔ نعیم صاحب کہنے لگے کہ میرے پاس تو صرف دو لاکھ ہے باقی آپ کر لیں۔

دوسرے دن نعیم صاحب ادھر اُدھر سے روپیہ اکٹھا کر کے لے آئے اور خان صاحب بھی آ گئے۔ اب روپیہ صرف تین لاکھ اسی ہزار جمع ہوا۔ اس لیے معاہدے کی رو سے نعیم صاحب لینے کے حقدار نہ تھے۔ لہٰذا طے ہوا کہ دوبارہ کھیلا جائے چونکہ نعیم صاحب سمجھتے تھے کہ میں ہار سکتا ہی نہیں لہٰذا وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔ اب کے کھیلتے کھیلتے ایک پتہ تاش سے کم ہو گیا۔

پتہ چالبازی سے کم کیا گیا اس لیے تمام گیم چوپٹ ہو کر لاکھوں روپے نعیم کے سر چڑھ گئے۔ ان کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ استاد کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس نے غلطی نکالی۔ غلطی بھی نعیم صاحب کی نکلی۔ اب کل کا چار لاکھ اس رقم میں ڈالا گیا۔ تین لاکھ اسی ہزار نقد ادائیگی کی گئی۔ خان صاحب نے کھیلنا بند کر دیا۔ کہنے لگے کیش لے آؤ کھیل لو“۔

وہ تو رقم لے کر رفو چکر ہو گئے اور نعیم صاحب سر پیٹ کر رہ گئے۔ دو لاکھ روپے ہاتھوں سے نکل گئے۔ کاروبار ختم ہو کر رہ گیا۔ اس طرح ایک خوش حال خاندان پر مفلسی کی گھٹائیں چھا گئیں۔ راتوں [illegible] مہلت اسے شطرنج کا خواب [illegible] کا مسودہ بن گیا۔

سفرِ آگہی

(رسالت مآب ﷺ کی خدمتِ اقدس میں)

کون و مکاں کا حاصل
وہ نورِ ماہِ کامل
اک ذرّۂ بیش قیمت
اک جوہرِ گراں
اک نورِ سحر گاہی
اک روشنی کا دھارا
وہ ذاتِ مصطفیٰ
کہ جسے چنا گیا
یہ عقیدتِ مسلسل
جو چراغِ شب کا بن کر
ذرا دھیمی دھیمی لو میں
کہیں دل میں جل رہی ہے
یہی عشقِ مصطفیٰ ہے
یہی سوزِ مصطفیٰ ہے
تسلیمِ جان بھی ہے
تسلیمِ جاں کی راہ میں
ہے سلوک کا تقاضا
اُن سے وفا کی تکمیل
اک چادرِ تسلی
چپ چاپ اوڑھ لیں
اور نورِ مصطفیٰ سے
آنکھیں نمی میں جلا کر
وہاں کا سفر
اور آنگن کی منزل
ہم ایسے طے کریں
کہ جہاں کے آقا
ہر سمت سے نکل کر
سوئے حرم چلیں

رحمتوں کا خزینہ

ڈاکٹر سید نعیم احمد ادیب جعفری

رمضان المبارک

مومنین کیلئے روزہ خداوند عالم کی بارگاہ سے عطا کردہ ایسا تحفہ ہے کہ جس کی نظیر ممکن نہیں۔

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔
"یاایہا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون"
ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح سے پہلی (امتوں) پر فرض تھے تاکہ تم پرہیزگار (متقی) بن جاؤ۔
روزے کا مقصد اولین یہ ہے کہ انسانی سیرت میں تقویٰ کا جوہر پیدا اور نمایاں ہو جائے اور مومن

اے اللہ! مجھے رمضان المبارک کے لیئے سلامت رکھ
اور رمضان المبارک کو میرے لیئے رحمت بنا۔ آمین

کے قلب و باطن کو روحانی نورانیت سے جلا حاصل ہو جائے۔ صبر اور پھر شکر کرنا یہ بھی تقویٰ ہی کا عکس و نتیجہ ہوتا ہے۔۔۔۔ مومنین کیلئے روزہ خداوند عالم کی بارگاہ سے عطا کردہ ایسا تحفہ ہے کہ جس کی نظیر ممکن نہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، بے شک تمہارا رب فرماتا ہے کہ ہر نیکی کا اجر دس گنا سے سات سو گنا تک ہے لیکن روزہ صرف میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا۔ روزہ آتش (جہنم) کے مقابلے میں ڈھال ہے۔ روزہ دار کے منہ کی بُو اللہ تعالیٰ کے ہاں مشک (کستوری) کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ حدیث مبارک سے یہ تو ثابت اور واضح ہو گیا کہ ہر نیکی کا اجر دس سے سات سو گنا ہے مگر روزے کے اجر کی کوئی تصریح و وضاحت نہیں کی گئی کیونکہ روزہ وہ منفرد عمل ہے جو بندے اور خدا کے مابین ایک مخفی حقیقت ہے اور اس کا اجر بھی خدا نے خود دینے کا وعدہ فرمالیا ہے۔ وہ غنی ہے جو چاہے عطا فرما دے۔ بندہ روزہ کے اجر کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ گویا روزہ خدا کو راضی کرنے کا ذریعہ ہے اور رضائے الٰہی کی پہچان خدا نے خود بتلا دی۔

"اذا وجدت قلبک راضی عنی فاعلم ان اللہ راضی عنک"

ترجمہ: "جب تُو اپنے دل کو اپنے رب کے ساتھ راضی پائے تو سمجھ جا کہ اللہ تجھ سے راضی ہے"۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جب رمضان کی پہلی رات ہوئی تو خاتم الانبیاء ﷺ کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کر کے ارشاد فرمایا کہ "اے لوگو! تمہاری طرف سے تمہارے دشمن جنات کے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تم سے دُعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے"۔ ارشاد ہے

"ادعونی استجب لکم"

کوئل کی کوکو

یہ ننھا سا خانہ بدوش پرندہ ہر برس دس ہزار میل پرواز کرتا ہے۔ اگر آپ صبح سویرے سیر پر جاتے ہیں تو آپ نے درختوں کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک پرندے کی خوبصورت اور سریلی آواز ضرور سنی ہوگی۔ دل کو چھو لینے والی یہ آواز ایک لمحے کے لیے ٹرک پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ خوبصورت آواز ایک چھوٹے سے پرندے کوئل کی ہے۔ کوئل اور ہر گھنٹے کے بعد کوئل جیسی آواز نکالنے والے کلاک اب ماضی کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ زیادہ دور پرے کی بات نہیں کہ باغوں اور پارکوں میں کوئل کی سریلی اور خوبصورت آواز اکثر سنائی دیتی تھی اور بہت سے گھروں کی دیواروں پر ایسے کلاک نظر آتے تھے، جن میں ہر گھنٹے کے بعد ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلتی تھی اور ایک ننھی سی کوئل اپنی چونچ باہر نکال کر وقت کا اعلان کرتی تھی۔ کوکو کلاک، موبائل فونز اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے دیگر گھریلو آلات کی بھینٹ چڑھ چکا ہے، جبکہ آب و ہوا کی تبدیلیاں ہمارے باغوں اور پارکوں کو کوئل کے سریلے نغموں سے محروم کر رہی ہیں۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ نر اور مادہ کوئل کی عادات کافی مختلف ہیں۔ برطانیہ میں نر پرندوں کی آمد پہلے شروع ہوتی ہے اور وہ گرمیاں گزارنے کے لیے ایسی جگہوں کا انتخاب کرتے ہیں جہاں انہیں اپنے لیے اچھے جیون ساتھی ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ جبکہ مادہ پرندے کئی ہفتوں کے بعد وہاں پہنچتے ہیں اور ان کی پرواز کے راستے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ہگسن کی ٹیم مادہ کوئل کی پرواز کے راستوں کا نقشہ بنانے کے لیے اس سال اس پر تحقیق کر رہی ہے۔

(مرسلہ: زبیدہ احمد۔ قصور)

ترجمہ: مجھ سے مانگو میں تمہاری دُعا قبول کروں گا"۔

خوب سُن لو اللہ تعالیٰ نے ہر سرکش شیطان پر سات فرشتے (نگرانی کے لیے) مقرر فرما دیے ہیں۔ لہٰذا اب وہ ماہ رمضان گزرنے تک چھوٹنے والے نہیں اور یہ بھی سُن لو رمضان شریف کی پہلی رات سے آخری رات تک آسمان کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور اس مہینہ میں دُعا قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص روزہ رکھ کر بھی جھوٹے کردار و گفتار سے باز نہ آیا تو اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے سے کوئی غرض نہیں" (بخاری)۔ "بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جن کا روزہ صرف بھوکا رہنے کے سوا اور کچھ نہیں اور بہت سے شب بیدار ایسے ہیں جن کے لیے شب بیداری کا بدلہ سوائے جاگنے کے اور کچھ نہیں"۔ (ابن ماجہ)۔ علمائے کرام اور مشائخ عظام کے نزدیک روزے کے چھ آداب یعنی نگاہ کی حفاظت، زبان کی حفاظت، کان کی حفاظت، جسم کے تمام اعضاء کی حفاظت، زیادہ شکم سیری سے حفاظت اور مکمل روزے کی حفاظت کا ہمہ وقت خیال رکھنا ہیں۔ صبح صادق سے غروب آفتاب تک عبادت کی نیت سے کھانے پینے اور جماع سے رُکے رہنا روزہ کہلاتا ہے۔ اس ماہ کے روزے رکھنا ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد و عورت، غیر معذور شخص پر فرض ہے۔

روزہ میں درد کی دوا مثلاً کیپسول وغیرہ حلق میں ڈالنا' جان بوجھ کر قے کرنا' نکسیر کا خون حلق میں چلا جانا' منہ میں پان دبا کر سو جانا' کُلی کرتے وقت حلق میں پانی جانا' بھول کر یا دھمکی کی وجہ سے روزہ ٹوٹ جانا، پتھر کی کنکری یا مٹی کھانا' کان یا ناک میں دوا ڈالنا' رمضان کے مہینے کے روزے میں اگر بیوی کے ساتھ [illegible] بلا عذر مجامعت کرے تو [illegible] پر قضا لازم جبکہ مرد پر قضا کفارہ دونوں لازم ہیں۔ یہ تمام مذکرہ بالا امور مفسدات روزہ ہیں جن میں سے کچھ کا کفارہ اور کچھ کی قضا مقرر ہے۔

رمضان المبارک آخرت کی کمائی کا بہترین ذریعہ اور نیکیوں' رحمتوں' مغفرتوں' بخششوں کے حصول کا موسم بہار ہے۔ دنیاوی' کاروباری اور ملازمتی مصروفیات کم سے کم کرکے اور غیر ضروری تعلیمات ختم کرکے زیادہ سے زیادہ ماہ مبارک میں اسلامی زندگی اختیار کی جائے۔

☆ صدق دل سے تمام گناہوں سے توبہ کریں اور کثرت سے توبہ و استغفار کا اہتمام کریں۔

☆ روزہ رکھنے اور تراویح پڑھنے کا پورا اہتمام کریں۔ بلا عذر شرعی ترک نہ کریں۔

☆ روزے میں آنکھ' کان' ناک' زبان' دل' دماغ اور تمام اعضاء کو ہر ہر گناہ سے مکمل طور پر بچائیں۔

☆ نماز باجماعت کا مکمل اہتمام کریں۔ اشراق' چاشت' اوابین' صلوٰۃ التسبیح' تحیۃ المسجد' تحیۃ الوضو اور تہجد کے نوافل معمول بنائیں۔

☆ رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کا مطالعہ کریں۔

☆ تلاوت قرآن مجید کو جس قدر زیادہ ہو سکے معمول بنائیں۔ صدقہ و خیرات' دُکھی انسانیت کی خدمت' حسن اخلاق' بہترین طرز معاشرت اعتدال کے ساتھ نیز دعاؤں میں جنت الفردوس کی آرزو کیجئے اور عذاب دوزخ سے پناہ مانگیں۔

یہ ایک سچے مومن مسلمان کی روحانی و جسمانی تربیت کا مہینہ ہے۔ سو تربیت جتنی اچھی ہوگی عملی میدان میں اتنی ہی کامیابی ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سبھی کو اس ماہ مبارک کی سعادتوں سے سرفراز فرماتے ہوئے ہم پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دے۔ (آمین)

”خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں“

husain_sayyed2001@yahoo.com

قلندر حسین سیّد سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ اپنی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جارہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سیّد نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیرِ نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی کھٹاس، کوڑ تما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

حاصل مطالعہ

☆ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تم میری تعریف میں تجاوز نہ کرو۔ جیسے نصاریٰ نے ابن مریم علیہ السلام کے سلسلہ میں مبالغہ سے کام لیا۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس لیے مجھے اللہ کا بندہ اور رسول کہو (صحیح بخاری)۔

☆ ایک غلطی کی نشاندہی

اس خیال میں ہمیشہ مگن رہنا کہ جوانی اور تندرستی ہمیشہ رہے گی۔

☆ امریکہ کی موجودہ حکمران پارٹی کا نشان گدھا ہے۔ اس لحاظ سے [illegible] سے بڑا گدھا اوباما ہے۔

اب صورتحال [illegible] ہے کہ [illegible]ستان کی حکمران پارٹی کا نشان ”شیر“ ہے مگر یہ ایک ایسا عجیب شیر ہے جو گدھے کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا (مستنصر حسین تارڑ) فیس بک ڈاٹ کام۔

☆ لوگ مسجد کو دلہن بناتے رہے اور مفلس کی بیٹی کنواری رہی۔

☆ الیکشن سے پہلے صدر زرداری کو سڑکوں پہ گھسیٹنے کی باتیں کی جارہی تھیں اور الیکشن کے بعد اب عوام کو سڑکوں پہ گھسیٹا جارہا ہے۔

☆ دنیا ستاروں پہ پہنچ چکی ہے اور ہم اللہ کی کائنات میں غوطہ زن ہونے کی بجائے ایک دوسرے کے خون میں غوطہ زن [illegible] ہیں۔

☆ میرے خیال میں لڑکے [illegible] باقاعدگی سے

کالج نہیں جاتے جتنی باقاعدگی سے وہ لڑکیوں کے پیچھے جاتے ہیں۔

☆ تقدیر ایک تاریک مسئلہ ہے تم اس پر نہ چلو یہ ایک گہرا دریا ہے اس میں نہ گھسو اور یہ اللہ کا بھید ہے تم اس کے سمجھنے کے پیچھے نہ پڑو۔

☆ نجاست جب تک انسان کے اندر مخفی ہے یعنی پیٹ میں ہے۔ نجاست کے باوجود نجاست نہیں ہے۔ یعنی جب تک پیشاب مثانے کے اندر ہے انسان کے نماز پڑھنے میں رکاوٹ نہیں ہے۔ اس کا اخراج طہارت کی ضرورت پیدا کرتا ہے یعنی جب تک بات مخفی رکھو کوئی مسئلہ نہیں۔

☆ موت نہ ہو تو شاید زندگی ایک طویل المیہ بن جائے۔

....

"مسجد قرطبہ کو چرچ کے حوالے نہ کیا جائے"

سپین کی معروف عمارت مسجد قرطبہ جسے مشترکہ طور پر مسجد اور گرجا گھر کہا جاتا ہے، ان دنوں تنازعے کا باعث بنی ہوئی ہے۔ اس کے متعلق لاکھوں افراد نے آن لائن پٹیشن داخل کی ہے کہ قرطبہ کا یہ گرجا گھر کیتھولک چرچ کی ملکیت نہ بنایا جائے۔ سپین کے شہر قرطبہ میں واقع مسجد قرطبہ کو اسلامی فنِ تعمیر کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ عمارت پندرھویں صدی عیسوی سے قبل دراصل مسجد ہوا کرتی تھی۔ اس کی تعمیر آٹھویں صدی میں مسلم سلاطین نے کی تھی جو اس زمانے میں سپین کے اس حصے میں حکمران تھے جسے آج اندلس کہا جاتا ہے۔

اس عمارت کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے مرکز میں ایک گرجا گھر واقع ہے جس کی تعمیر پندرھویں اور سولھویں صدی میں کیتھولک مسیحی برادری نے کی تھی۔ جہاں اس میں روزانہ مسیحی عبادات ہوتی ہے۔ اب یہ عمارت کسی کی ملکیت نہیں ہے، تاہم سپین کا چرچ اس کے انتظام و انصرام کا ذمہ دار ہے اور ملک کے قانون کے تحت یہ تاریخی عمارت آئندہ دو برسوں میں چرچ کی ملکیت بن جائے گی۔

تقریباً سوا تین لاکھ افراد نے آن لائن عرضی میں درخواست کی ہے کہ اس فیصلے کو روک دیا جائے۔

سپین کے ایک شہری مارتا نے کہا کہ "اس کے بعد یہ عمارت صرف کیتھڈرل رہ جائے گی اور اس کے ساتھ منسلک مسجد کا نام ہٹا دیا جائے گا۔ ہمارے خیال میں یہ تاریخ اور اس عمارت کی یادگار کے ساتھ زیادتی ہوگی"۔

سپین کا کیتھولک چرچ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ یہاں مسجد ہوا کرتی تھی، لیکن یہ عمارت اب صدیوں سے کیتھڈرل ہے۔ چرچ کا کہنا ہے کہ اس عمارت کے اس کی ملکیت بننے پر جو تنقید ہو رہی ہے، وہ انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ ایک پادری نے کہا کہ "اس عمارت کی اسلامی تاریخ کو مٹانا ناممکن ہے، یہ قرطبہ اور سپین کی تاریخ کی علامت ہے"۔

دنیا بھر سے اس میں لاکھوں کی تعداد میں سیاح آتے ہیں اور بی بی سی کے نام برینج کا کہنا ہے کہ سیاحوں کے لیے اس عمارت میں دلچسپی اس بات میں پنہاں ہے کہ یہ مسجد اور گرجا گھر دونوں ہیں۔

یہاں ہر سال 14 لاکھ سیاح آتے ہیں۔

سپین: "مسجد قرطبہ کو چرچ کے حوالے نہ کیا جائے"۔ (بی بی سی ڈاٹ کام سے)

....

"داد رسی اور انصاف"

جس معاشرے میں داد رسی اور انصاف کی فراہمی کی رفتار اتنی سست ہو۔ اس میں جرائم کی شرح کا بڑھنا ایک فطری عمل ہے۔ ہماری معزز عدالتوں کے محترم جج صاحبان کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ ان معاملے میں ہونے والی تاخیر

معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے اور اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کررہی ہے۔ جیلوں میں ایسے ایسے افراد بھی ملتے ہیں، جو دس دس برس سے سلاخوں کے پیچھے ہیں اور عدالتوں میں ان کے مقدموں کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ ارکان اسمبلی کو فرصت ہو تو انہیں اس معاملے میں قانون سازی کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ بلکہ سیاسی جماعتوں کو اسے اپنے منشور میں شامل کرنا چاہیے۔ کم از کم یہ تو ہو کہ سزا ہونے پر وہ مدت مجرم کی سزائے قید سے منہا کردی جائے جو اس نے بطور حوالاتی جیل میں گزاری ہو اور جو برسوں جیل میں رہنے کے بعد "باعزت" بری ہو۔ اسے حکومت کی طرف سے تلافی کے طور پر ایک معقول رقم ادا کی جائے کہ وہ باعزت طور پر دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکے۔

....

"کلام پروین شاکر"

دینے والے کی مشیت پہ ہے سب کچھ موقوف
مانگنے والے کی حاجت نہیں دیکھی جاتی
خدا کرے کہ ہوا کو ابھی پتہ نہ چلے
کہ چراغ مرے بام و در پہ زندہ ہیں

....

"کلام میر تقی میرؔ"

دیکھ تو دل جان سے اُٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے
گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یاں سے اُٹھتا ہے

(فیس بک ڈاٹ کام)

....

"ریموٹ کنٹرول"

زمانے کی گردش نے انسان کے لیے ان گنت سہولتیں اس کے قدموں میں ڈھیر کردی ہیں۔ نت نئی ایجادات نے [illegible] کی دیرینہ خواب [illegible] ہے۔ وہ آسائشیں جس کا انسان کبھی محض تصور ہی کرسکتا تھا آج اس کی محض انگلیوں کے اشارے کے تابع ہیں۔ بٹن دبایا اور سہولت حاضر۔ بلکہ اب تو انسان اس سے ایک اور قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ اب اسے اُٹھ کر جانے اور بٹن دبانے کی بھی ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ وہیں بستر پر لیٹے لیٹے یا کرسی پر بیٹھے بیٹھے اشارہ کیا اور کرامتیں ظاہر ہونا شروع ہو گئیں۔ یہ ریموٹ (Remote) کنٹرول کا دور ہے۔ انگلیوں کے ہلکے سے اشارے سے پنکھے چل پڑے۔ ٹیلی ویژن آن ہوگیا۔ چینلز (Channels) تبدیل ہوگئے اور دروازے کا تالا کھل گیا۔ یہ انسانی زندگی کا پُرآسائش دور ہے۔ اس کی کرشماتی سہولتوں کی معراج کا دور ہے۔

ہاں اس سے عملی محنت کی عادت خواتین میں کم ہوتی جارہی ہے۔ آٹا گوندھنے، مسالہ پیسنے، جھاڑو لگانے، کپڑے دھونے اور برتن مانجھنے کی جو مشقت کبھی خواتین کا طرہ امتیاز ہوتی تھی اب وہ غائب ہوتی جارہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ خواتین میں بیماریاں کثرت سے پیدا ہورہی ہیں۔ ان کا وزن بڑھ رہا ہے۔ شوگر کی شکایتیں جنم لے رہی ہیں۔ دل کے امراض حملہ آور ہورہے ہیں اور تھکن کم ہونے کی وجہ سے ان کی راتوں کی نیندیں غائب ہورہی ہیں۔ جدید خوش نما زندگی کا یہ دوسرا تاریک روپ ہے۔

بڑے گھرانے کی خواتین میں کام نہ کرنے اور انہیں خادماؤں کے سپرد کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ یہ خواتین ان گھریلو کاموں کو اپنے لیے کسرِ شان سمجھتی ہیں۔ یہ کام تو نوکرانیوں اور ماسیوں کی ذمہ داریاں ہیں۔ ان کا کام تو شاید مسہریوں (پلنگوں) پر لیٹے رہنا اور ٹی وی دیکھتے رہنا ہے۔ چنانچہ وہ یہ تمام کام [illegible] جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اپنی [illegible] کے حوالے کردیتی ہیں اور حاصل شدہ

فرصت کو وہ شاپنگ کرنے اور موبائل پر اپنی سہیلیوں سے چیٹنگ کرنے میں صرف کرتی ہیں۔ دوسری طرف انہیں اپنی صحت کی بھی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ اس لیے شام کے اوقات میں وہ جاگنگ کرتی ہیں۔ جاگنگ کرنا فی زمانہ اسٹیٹس سمبل بن گیا ہے جبکہ گھریلو کام کرنا پس ماندگی کی نشانی قرار پایا ہے۔

کرکٹ کے کھلاڑی بیٹسمین (Batsman) اگر یہ سوچ کر فیلڈنگ اور بیٹنگ کرنے سے انکار کر دیں کہ یہ کام ان کی حیثیت کے منافی ہیں تو یہ احساس محض ان کی حماقت قرار پائے گا۔ فیلڈر اور بیٹسمین کہلائے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ وہ عملی طور پر میدان میں گیندوں کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس مثال پر قیاس کرکے خواتین کو بھی اپنے امور خانہ داری سے اجتناب نہیں برتنا چاہئے۔ اس ضمن میں ایک اور سادہ سی مشق ان کے لیے یہ بھی ہے کہ وہ دن بھر میں کم از کم دو تین دفعہ سیڑھیاں لازماً اترا چڑھا کریں۔ اس پابندی سے انہیں اچھے نتائج دیکھنے کو ملیں گے۔

گھریلو کام کاج کی عادت کم ہوتے رہنے کی وجہ سے بیماریاں ہمارے گھروں میں داخل ہوگئی ہیں۔ معالجوں نے ہمارے گھر دیکھ لیے ہیں۔ یاد رکھیے! زائد چربی اور شکر ہماری صحت کے بڑے دشمن ہیں۔ ان کی تحلیل کا بہترین حل روزمرہ کی نجی مصروفیات ہیں۔ ہم فطرت سے جتنا دور ہوں گے اتنی ہی پریشانیاں اپنے دامن میں سمیٹیں گے۔

(ماخوذ)

"مدرز ڈے"

مئی کے مہینے میں دنیا بھر میں "مدرز ڈے" ماؤں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ اس دن کے منانے کا پیغام مغربی دنیا کے اس معاشرے سے ملا ہے، جو مادی آسائشوں اور بنیادی [illegible] سہولتوں پر [illegible] زندگی، [illegible] جائیداد کی فراہمی اور پرفریب معاشرتی نظام اور ٹوٹتے بکھرتے خاندانی نظام میں زندگی کی اعلیٰ قدروں اور اخلاقی حدود وقیود کو فراموش کر چکے ہیں۔ جن کے نزدیک مادیت ہی سب کچھ ہے، جو اپنے اسٹیٹس، ذاتی مفادات اور پرفریب دنیوی مال ومتاع کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ وہ اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے اس قدر دور ہو چکے ہیں کہ انہیں مقدس رشتوں کا بھی پاس نہیں۔ وہ ماں کی عظمت، اس کے تقدس اور حرمت کو فراموش کر چکے ہیں، وہاں تڑپتے سسکتے بوڑھے والدین کے زندگی کے ایام پورے کرنے کے لیے آخری ٹھکانہ "اولڈ ہاؤسز" ہیں، جہاں سال میں، جی ہاں صرف سال میں ہی ایک دن وہ بھی رسمی طور پر دور سے ہی یا صرف ہاتھ کے اشاروں سے ہیلو ہائے کہنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ صرف اس رسمی رشتے پر قائم نظر آتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک "ماں" کے تقدس، اس کی عظمت اور مقام ومرتبے کا کوئی تصور نہیں، وہ آج دنیا کو بھی اس رنگ میں رنگنے اور اسی روایت کو پروان چڑھانے کے خواہش مند ہیں، وہ اپنے مخصوص کلچر، منفی تصورات اور اپنی ٹوٹتی بکھرتی تہذیبی روایات کو مسلط کردینا چاہتے ہیں لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہم ایک عظیم مثالی مذہب اور قابل فخر تہذیبی اور اخلاقی قدروں کے علمبردار ہیں، ہم اس خاندانی نظام کے امین ہیں۔ جس میں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ "ماں" پیکر ہے لازوال محبت کا۔ مجسمہ ہے، رحم وکرم کا۔ سرچشمہ ہے حمایت وشفقت اور محبت ومودت کا، حقیقت یہ ہے کہ "ماں" بے مثال ہے، اس کا خلوص بے مثال ہے، اس کی محبت بے مثال ہے، اس کی مامتا بے مثال ہے۔

انسانی رشتوں کی کہکشاں میں سب سے روشن ستارہ ماں ہے۔ اس دنیا میں آتے ہی بچہ جو لفظ بولتا ہے وہ ماں ہے۔ ایک عورت کی [illegible] ہونا ہی دراصل اس کا [illegible] سب [illegible] ہوتا ہے۔ ماں کی گود

"دُعا تقدیر بدل دیتی ہے" (حدیثِ رسولؐ)

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک ایمان افروز پیشکش

دُعا نمبر

شائع ہو گیا ہے

- قرآنی دُعائیں۔
- عظیم پیغمبرانِ خدا کی وہ دُعائیں جو نسلِ انسانی کے لیے نجات اور ہدایت کا باعث بنیں۔
- خالقِ کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہؐ کی تمام مسنون دُعائیں جو رحمت اللعالمینؐ کی ذاتِ برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی دُعائیں۔
- آئمہ اکرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دُعائیں۔

جدید دُنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تشفی آمیز رُوحانی اور ایمانی علاج

قیمت: 160 روپے

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

بچے کی پہلی تربیت گاہ ہے یا اسے سکول کہہ لیجیے۔ بچے کے لیے باپ کی درشتی کو ماں اپنی شفقت اور شگفتگی سے ختم کرتی ہے۔ جب قدرت باپ کا سایہ چھین لیتی ہے تو میری ماں کی طرح سب مائیں باپ کا کردار بھی ادا کرتی ہیں۔ زندگی میں قدم قدم پر وہ ماں ہی نہیں ایک مہربان دوست کی مانند زندگی کے ہر موڑ پر اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ وہ اپنی کسی تکلیف یا دکھ کا تذکرہ زبان تک نہیں لاتی کہ اس کے بچے کہیں آزردہ خاطر نہ ہوں اس لیے وہ گھر میں بچوں کی آسائش کے لیے مشقت کو اپنا وطیرہ بنا تی ہے۔ اس ماں کا قرض وہ اولاد کیسے اُتار سکتی ہے جس نے زندگی کی تپتی ہوئی دھوپ میں ایک سائبان کی طرح ان کی حفاظت کی ہے۔

ماں نے جیسے اپنے بچوں کے ناز اٹھائے ان کی ضرورتیں پوری کیں۔ اسی طرح بچے بھی اپنی ماں کے لیے اسی جیسے کردار کو اختیار کریں اور اپنی ماں سے قربت ہی نہ رکھیں بلکہ اس کے دل کو ٹھیس بھی نہ پہنچائیں اور اس کے آرام کا خاص خیال رکھیں۔ ماں کا اولاد کے ساتھ ہونا خدا کا خاص انعام ہے۔ کوئی اس کی قدر کرتا ہے اکثر خود کفیل ہوتے ہی ماں کے ایثار و وفا کو بھول جاتے ہیں۔ لفظ ماں کو عربی میں ام کہتے ہیں لفظ "ام" قرآن مجید میں 84 بار جبکہ اس کی جمع "امہات" گیارہ مرتبہ آئی ہے۔ ویسے ام کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی اصل، ہر وہ چیز جس کے اندر اس کے جملہ متعلقات سما جائیں وہ ان کی ام کہلاتی ہے۔ جیسے لوح محفوظ کو ام الکتاب کہا گیا کیونکہ وہ تمام علوم کا منبع ہے۔ مکہ مکرمہ کو ام القریٰ کہتے ہیں کیونکہ وہ خطہ عرب کا مرکز ہے۔ کہکشاں کو ام النجوم کہتے ہیں کیونکہ اس میں بہت سے ستارے سمائے ہوئے ہیں۔ تاہم ماں کے تعلق ممتا کی وضاحت کسی ڈکشنری میں نہیں ملتی ۔۔۔ لیے بس ایک ماں نہیں پوری زندگی ہونی چاہیے۔ اسی لیے ماں کے قدموں تلے جنت کو قرار دیا گیا ہے۔

(جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

....

"تحقیق کیا ہے؟"

تحقیق سے مراد کسی شئے کی حقیقت کے ثبات' حقائق کی بازیافت' حقائق کا تعین اور ان سے نتائج کا استخراج' حق کی تلاش، حق کی جستجو، تحیر یا شک کو دور کرنا، یقین کو حاصل کرنا، بار بار تلاش و جستجو کرنا تاکہ حقیقت یا حق واضح ہو جائے۔ موجودہ دور کی سائنسی ایجادات تحقیق ہی کی مرہون منت ہیں لیکن مواد جمع کرنا ہی تحقیق نہیں بلکہ متعلقہ جمع شدہ مواد سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا تحقیق کہلاتا ہے۔

ادبی حوالے سے تحقیق (Research) کو ہمیشہ ایک فن (ART) تسلیم کیا گیا ہے اور تحقیق کار (Researcher) کے لیے فنی اصطلاح 'محقق' مدتوں سے رائج ہے۔ تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے اس لفظ کا اصل 'حق' ہے۔ جس کے حروف ح ق ق ہیں۔ حق سے تحقیق بنا ہے۔ جس کا مطلب ہے حق کو تلاش کرنا یا حق کی طرف پھیرنا۔ حق کے معنی سچ ہیں۔ مادہ حق سے دوسرا لفظ حقیقت بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ تحقیق سچ یا حقیقت کی دریافت کا عمل ہے۔ تحقیق کے لیے انگریزی زبان میں جو لفظ مستعمل ہے وہ (Research) ہے۔ جس کے معنی ہیں تحقیق، حقائق یا اصول کی تلاش میں پر مغز تفتیش/ کھوج ایک تجرباتی تحقیق/ چھان بین' تحقیقی عمل ...... جبکہ تحقیق کرنے والا (Researcher) کہلاتا ہے۔ اُردو میں محقق کے لیے کھوجی یا تفتیش کنندہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

ریسرچ دو الفاظ (Re) اور (Search) کا مجموعہ ہے۔ ۔۔۔ (Re) کا مطلب ہے دوبارہ اور

(Search) کا مطلب ہے تلاش، جستجو، کھوج۔ لفظی معنی پر غور کریں تو ریسرچ کا مطلب ہے "دوبارہ تلاش" کرنا لیکن اصطلاح میں (Research) انتہائی سچائی اور حقائق کی تلاش کا نام ہے۔ انسان چونکہ فطرتاً اور طبعاً حقیقت کی جستجو میں سرگرم عمل رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ حاصل شدہ علم اور معلومات کی تصدیق کا خواہش مند رہتا ہے لہٰذا اس تشنگی کو دور کرنے کے لیے (Research) کی جاتی ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری نے تحقیق کے یہ معنی بتائے ہیں۔

1۔ کسی مخصوص چیز یا شخص سے متعلق گہری یا محتاط تلاش کا عمل۔

2۔ کسی حقیقت کے انکشاف کی غرض سے محتاط غور و فکر یا کسی مضمون کے مطالعہ کے ذریعے تلاش یا چھان بین، ناقدانہ یا سائنسی سلسلہ تلاش، 3۔ کسی مضمون کی چھان بین یا مسلسل مطالعہ۔

4۔ دوسری بار یا بار بار کی تلاش (ترجمہ)

مالک رام تحقیق کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے اس کا مادہ ح ق ق ہے۔ جس کے معنی ہیں کھرے کھوٹے کی چھان بین یا کسی بات کی تصدیق کرنا۔ دوسرے لفظوں میں تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے علم و ادب میں کھرے کو کھوٹے سے، مغز کو چھلکے سے، حق کو باطل سے الگ کریں۔ انگریزی لفظ ریسرچ کے بھی یہی معنی اور مقاصد ہیں۔

مقصود ایس۔ اے حسینی لکھتے ہیں:۔

تحقیق کا مادہ حق ہے انگریزی میں اس کا متبادل (Right) ہے ایسا فعل، بیج یا نظریہ جو حق (Right) پر مبنی ہو پیش کرنا تحقیق کہلائے گا۔

("ابجد تحقیق" ڈاکٹر محمد ہارون قادر کی کتاب سے اقتباس)

"ناقص طبی نسخے موت کے پروانے"

انسانی صحت کے حوالے سے طب، ایک اہم اور حساس شعبہ ہے، دیگر شعبوں کی بہ نسبت، اس سے وابستہ افراد سے، خواہ ڈاکٹرز ہوں یا فارماسسٹ، نرسنگ اسٹاف ہو یا لیبارٹری ٹیکنیشنز، زیادہ ذمہ داری اور فرض شناسی کی توقع رکھی جاتی ہے۔ خصوصاً ڈاکٹرز کے بارے میں غیر ذمہ داری یا لاپروائی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا کے بعد مریض کا سب سے بڑا آسرا اس کا معالج ہوتا ہے۔ جتنی اُمیدیں اور توقعات مریض کی اپنے معالج کی ذات اور کارکردگی سے وابستہ ہوتی ہیں دُنیا میں کسی اور فرد سے نہیں ہوتیں لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں صحت عامہ کا شعبہ دیگر شعبوں کی مانند ابتری، تنزلی اور ہو... ... سے دوچار ہے۔ ایک طرف عوام کو مناسب طبی سہولتیں میسر نہیں تو دوسری طرف سرکاری اور نجی ہسپتالوں میں لاپروائی، غفلت اور بد انتظامی عروج پر ہے۔ اخبارات میں آئے دن یہ خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ غلط انجکشن لگنے سے مریض دم توڑ گیا۔ ڈاکٹر یا نیم طبی عملے کی غفلت سے مریض ہلاک ہوگیا یا غلط دوا کے ری ایکشن سے مریض کی حالت بگڑ گئی اور وہ چل بسا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپریشن کے دوران کوئی اوزار یا تولیے کا ٹکڑا مریض کے جسم کے اندر رہ جاتا ہے۔ تواتر کے ساتھ پیش آنے والے ان واقعات کے اصل حقائق بالعموم کبھی سامنے نہیں آتے۔ اکثر و بیشتر انہیں دبا ہی دیا جاتا ہے۔ یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ غلط انجکشن یا دوا دینے کا ذمہ دار کون تھا؟ ڈاکٹر نے غلط دوا تجویز کی یا اس سے تشخیص میں غلطی ہوئی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر نے نسخہ صحیح لکھا تھا مگر فارمیسی سے نام کی مماثلت کے باعث کوئی دوسری دوا یا انجکشن دے دیا گیا ہو یا نرسنگ اسٹاف کی بے احتیاطی اور غیر ذمہ

داری کی وجہ سے چیک نہیں کیا جاسکا پھر ایک مسئلہ زائد المعیاد کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جعلی اور غیر معیاری ادویہ کی بات بھی نکلتی ہے۔ وجوہ خواہ کچھ رہی ہوں اول تو اس قسم کے واقعات کی چھان بین کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی اور اگر کسی کے دباؤ کے زیر اثر تحقیقات کی نوبت آجائے تو حقیقت کی تہہ تک پہنچنا اور اصل ذمہ دار کا تعین نا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے۔ ایسے واقعات رسمی خانہ پری کے مرحلے سے گزرتے ہیں اور بھلا دیئے جاتے ہیں۔ ذمہ داروں کو نہ تو کوئی سزا ملتی ہے اور نہ ہی اس جان لیوا غلطی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جو ایک انسان کا ایک قیمتی جان کی ہلاکت کا سبب بن گئی۔

لندن سکول آف ہائی جین اینڈ ٹراپیکل میڈیسن کے ہیلتھ پالیسی ڈیپارٹمنٹ کی پروفیسر این ملز نے ایک عشرہ قبل عالمی ادارہ صحت کے لیے ایک رپورٹ مرتب کی تھی۔ جو نجی ہسپتالوں کی کارکردگی اور طریقہ کار سے متعلق تھی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ نجی طبی ادارے بہت بڑی تجارتی کمپنی کے انداز میں کام کرتے ہیں جب کہ کچھ کا سٹائل دکان داروں اور سڑکوں پر سامان بیچنے والوں جیسا ہے۔ تاہم ان سب میں ایک قدر مشترک ہے کہ یہ سب تجارتی انداز میں کم وقت میں زیادہ سے زیادہ منافع کمانا چاہتے ہیں۔ جس میں درست ادویہ کی مقدار اور مریض کی قوت خرچ کے مطابق درست علاج شامل ہے۔

ڈاکٹروں کو خراب کرنے میں ایک بڑا کردار فارما میڈیکل انڈسٹری کا ہے۔ وہی ڈاکٹروں کو زیادہ سے زیادہ ادویہ لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ خواہ ضرورت ہو یا نہ ہو یہ کمپنیاں ڈاکٹرز کو ان کی خدمات کے عوض نئے ماڈل کی گاڑیوں کی چابیاں تک پیش کرتے ہیں۔ موبائل فون ہوٹلوں کے [illegible] ڈنر تو معمولی باتیں [illegible]۔ پہلے ڈاکٹرز کو فائیو سٹار [illegible] میں [illegible] کیا جاتا تھا [illegible] پھر

بھوربن' سوات اور مری میں دعوتیں ہونے لگیں۔ اب یہ دعوتیں استنبول' بنکاک اور دبئی وغیرہ میں ہوتی ہیں۔

(طاہر حبیب کا کالم جنگ میگزین 04/5/14 سے اقتباس)

....

"صاحب ایمان' صاحب بصیرت قیادت کی ضرورت"

یہ ایک تاریخی سانحہ ہے کہ مملکت خداداد جس کا وجود میں آنا ایک مصلحت خداوندی تھی، اپنے وجود میں آنے کے بعد اس کو قائم رکھنے اور مضبوط و مستحکم کرنے کے اسباب و ذرائع سے ہنوز محروم ہے۔ اس میں سرفہرست یہ کہ اس مملکت کو اس کی اصل حیثیت کے مطابق یعنی اس کی نظریاتی اساس' خصوصی جغرافیائی محل وقوع' اس کی سرزمین مع اپنے ذرائع و وسائل کے اس کے عوام کی وافر صلاحیتیں اور اس کے متوقع بین الاقوامی کردار کی مناسبت سے جس قسم کی صاحب ایمان و صاحب بصیرت قیادت کی ضرورت تھی، ابھی تک تو اس کے کوئی خدوخال دکھائی نہیں دیتے۔ میں نے بھٹو صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات میں ان سے کہا تھا اگرچہ ایک اچھی حکومت بھی کسی ملک کی بڑی اہم اور بنیادی ضرورت ہے مگر اس ملک میں ابھی حکومت سے زیادہ اچھی قیادت کی ضرورت ہے۔

جب ہم اپنے عوام، ملک اور نظریئے وغیرہ کی نسبت سے حکمرانوں کے طرز عمل کا جائزہ لیتے ہیں تو سابق غیر ملکی حکمرانوں سے کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ نااہلیت' بے یقینی، بدذوقی' عدم استحکام اور کم کوشی کی مثالیں اس پر مستزاد ہیں۔ چالیس سال ہونے کو ہیں (یہ کتاب جنگ پبلشرز نے 1987ء میں شائع کی تھی) مگر ابھی تک ہمارا کوئی دستور عملاً موجود نہیں ہے۔ قوانین کا احترام سرے [illegible] ہے۔ جو بھی [illegible] کوئی ایک قانون [illegible] نہیں [illegible]۔ اور قانون

سازی کا مقصد بھی ذاتی مفادات رہ گیا ہے۔

قانون ساز خود کسی قانون کے پابند نہیں ہیں۔ اس وقت تو بیک وقت چند مختلف اور باہم متضاد و متناقض قوانین نافذ ہیں۔ مارشل لاء سول لاء شریعت اور ڈنڈا' بداخلاقی اور بے راہ روی کی رفتار تو جیٹ طیارے سے بھی تیز ہے۔ قومی یکجہتی اور ہم آہنگی تو محض کتابی محاورے رہ گئے ہیں۔ انتظامی صلاحیتوں میں ترقی کی بجائے انحطاط ہو رہا ہے۔ میں نے جنرل رحیم خان کو لکھا تھا "اگر آپ پی آئی اے کو ترقی دینے کی بجائے اس کو بیس سال پیچھے لے جاسکیں تو یہ بڑی قومی خدمت ہوگی"۔ باہمی تعاون کی فضا سرے سے مفقود ہے۔ کوئی دوسرے کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ ادنیٰ سے اختلافات بھی دشمنی سمجھے جاتے ہیں۔ اصولی اختلاف رائے ہو کہ غیر اصولی، صحت مند ہو کہ غیر صحت مند سب ایک ہی کھاتے میں ہیں۔ حکومت اتحاد و یکجہتی کے نام سے ڈرتی ہے۔ حکومت یہ ہو یا کوئی اور عوام اسی طرح محکوم ہیں۔ مظلوم مظلوم تر ہے۔ غریب غریب تر۔ حکمران خود کو ہی عقل کل سمجھتے ہیں اور اپنی یہ حیثیت دوسروں سے بھی منوانا چاہتے ہیں۔ جس میں ادنیٰ سی بھی صلاحیت ہے وہ اپنی پارٹی علیحدہ بنائے بیٹھا ہے۔ ملک پر قرضوں اور لداوں کا بوجھ روز بروز بڑھ رہا ہے اور ترقیاتی منصوبہ بندی ایسی ہے جو خود ہی اپنے آپ کو کھا جاتی ہے۔ جس کو انگریزی میں (Counter Productive) کہتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ قیادت کا کوئی ادارہ موجود نہیں ہے۔ یہ ادارہ خواہ کیسا بھی ہو جبکہ اس کے بغیر کسی ملک کا قائم رہنا یا مستحکم ہونا ناممکن ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے تمام خاندان کو قتل کرنے کا جو جرم کیا، وہ اپنی جگہ' مگر تاریخی جرم یہ تھا کہ اس نے قیادت کا ادارہ ہی ختم کر دیا [illegible] وہ حکومت بھی ختم ہو کر رہ گئی۔ کسی لیڈر کی موت [illegible] اثرات پوری قوم کی [illegible] بھی جاتی ہے مگر ادارہ باقی ہو تو زندگی کی اُمید باقی رہتی ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک پر ایک ادارہ موجود تھا جس نے بلاتاخیر حکومت کے خلاء کو پُر کر دیا۔ اس لیے کسی قوم یا ملک کی اصل موت قیادت کے ادارے کا قتل ہے۔ چنانچہ میں نے ضیاء الحق سے بھی کہا تھا کہ غلط ہی سہی مگر فوج کو ہی قیادت کا ادارہ مقرر کر دیں تاکہ یہ خلاء پورا ہو جائے۔ اس کے لیے لیڈروں کو بھی آنریری جرنیل بنا دیں۔

جو دوسرے ادارے ہیں ان کا بھی کوئی تقدس نہیں رہنے دیا گیا۔ اپنے ماضی کی تاریخ، تہذیب و ثقافت غرضیکہ ہر شئے کے ساتھ رشتے اگر ٹوٹ نہ رہے ہوں تو ڈھیلے ضرور ہو رہے ہیں اور وہی گہری وابستگی ہے جو کسی بھی قوم کو ایک امتیاز اور تشخص عطا کرتی ہے۔ غرضیکہ ہمارے اس خداداد ملک کا ڈھانچہ صرف اس لیے کھڑا ہے کہ دست قدرت کسی کو گرانے کی اجازت نہیں دے رہا۔ معلوم نہیں علامہ مرحوم کی اس زرخیز مٹی میں نم کب پڑے گی۔

اس وقت تو حالت کچھ ایسی ہے کہ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کون کیا ہے؟ مرد ہے یا عورت' ملازم ہے یا بدمعاش، تاجر ہے یا چور' سیاستدان ہے یا چور' مسلمان ہے یا منافق، وفادار ہے یا غدار۔ عجیب حالت ہے۔ اس کو کوئی ادیب اور شاعر ہی صحیح بیان کرے تو کرے قلندر صاحب کے اس مجذوب کی بات یاد آرہی ہے کہ جس نے خود فراموشی کی وجہ سے اپنی پہچان کے لیے اپنے گلے میں سرخ رومال باندھا ہوا تھا۔ اس کو سویا ہوا دیکھ کر کسی نے ازراہ شرارت وہ رومال کھولا اور اپنے گلے میں ڈال لیا۔ جب وہ بے دار ہوا تو اس کو دیکھ کر پوچھتا ہے "تو میں ہے یا میں تو ہوں" اگر ہمارے حالات کا شب و روز یہی رہا تو ہماری حالت بھی اس سے مختلف نہیں ہوگی۔

[illegible] اثرات [illegible] مارشل لاء تک" سردار

عبدالقیوم خاں کی کتاب سے اقتباس)

....

"میں کبھی لاجواب نہیں ہوا"

پہلے کہتے تھے بھاگ چوہے بلی آئی۔ اب کہتے ہیں بلی تیری شامت آئی کہ شیر آیا۔ خلیل جبران نے کہا تھا کہ میں کبھی لاجواب نہیں ہوا لیکن : ب مجھ سے پوچھا گیا کہ تم کون ہو؟ پی پی پی کا دور حکومت اب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ نئی حکومت مسلم لیگ (ن) اپنے بھاری مینڈیٹ کے ساتھ تشکیل پا چکی ہے۔ الیکشن کے بعد عالمی میڈیا پر ان خبروں کی بازگشت بھی سنی کہ بعض حلقوں میں ووٹوں کی تعداد وہاں درج ووٹروں سے بھی زیادہ تھی۔ اسے کہتے ہیں نیلی لداد ۔نئی حکومت سابقہ حکومت کے Statuesquo کو قائم رکھنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔

گزشتہ دنوں بلوچستان میں کیا کچھ نہ ہوا۔ کون سا دکھ بڑا ہے۔ ایک سو گیارہ برس پرانی زیارت ریذیڈنسی کا جسے شدت پسندوں نے مسمار کر دیا جہاں بانی پاکستان نے اپنا آخری ماہ گزارا یا ان پچیس عورتوں' مردوں اور بچیوں کا دکھ جو اس زمین پر چند برس گزار گئے پھر یہ سوچتا ہوں کہ مجھے اور تمھیں کیا حق ہے کسی ایسی عمارت یا انسانوں کی موت کا سوگ منانے کا جن سے ہمارا تعلق سوائے لفاظی کے کچھ بھی نہیں۔ وہی بابائے قوم نا..... جن کے تصور ریاست و حکومت کو ان کی زندگی میں ہی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا اور خود انھیں بھی ایک آہنی ڈھانچہ سمجھ کر پر فضا قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ جہاں ہمشیرہ، ایک ذاتی معالج اور چناروں سے ٹکراتی ہوا کہ سوا کوئی اور نہ تھا اور جناح کی تصویر پہلے کرنسی نوٹوں پر چھاپی گئی اور پھر ان نوٹوں سے ضمیر ٹریڈنگ کمپنی کھول لی گئی۔ ایک روپیہ کے سکہ پر بھی ان کی تصویر نمایاں دیکھی جا [illegible] ہم فقیروں کی [illegible]

کرتے ہیں۔ وہ بھی حقارت سے یہ ایک روپیہ کا سکہ لینا بعض اوقات قبول نہیں کرتے۔ ان کی شیروانی بھانت بھانت کے آمروں میں بٹ گئی۔ ان کے فرمودات 23 مارچ' 14 اگست' 11 ستمبر اور 25 دسمبر کے بوسیدہ سرکاری پیغامات اور فرسودہ اخباری ضمیموں میں تاحیات قید ہو کر رہ گئے۔ تب سے اب تک کوئی کہاڑی جناح کے خوابوں کو نیا پاکستان کوئی چھابڑی والا انقلابی پاکستان، کوئی کنگلا اسلامی پاکستان اور کوئی روشن پاکستان کہہ کر اپنا الو سیدھا کر رہا ہے اور پیٹ پال رہا ہے۔

لانبے لاغر کر جداؤ اصولی، خوش پوش، قوم پرست، روشن خیال جمہوریت پسند، حاضر جواب وکیل محمد علی جناح کے ساتھ گزشتہ چھیاسٹھ برسوں میں جو کچھ ہوا اس کے دہرانے کی چنداں ضرورت نہ ہے۔ کیوں نہ موجودہ پاکستان کی لاپتا نوجوان بیٹی کی مقدمہ فائل بھی اوریجنل پاکستان کے خالق کے تعویذ پہ رکھ دی جائے۔ جس کا پانچ برس پہلے ان ہی کے مزار کے احاطے میں اس کے محافظوں کے ہاتھوں ریپ ہوا۔ کاش یہ لڑکی چار معتبر گواہ پیش کر سکتی۔ کیونکہ DNA رپورٹ کوئی معتبر عدالتی گواہی نہیں ہے لہٰذا فاضل جج نے پانچ برس شنوائی کے بعد تین ملزموں کو مجبوراً بری کر دیا۔ مقدمہ اتنا شفاف ہے کہ بیرسٹر صاحب آپ بھی اگر مزار سے نکل آئیں تب بھی ملزموں کو سزا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ باقی تین گواہ کہاں سے لائیں گے؟ کچھ اور خواتین کو بھی یہی معاملہ درپیش ہے کچھ اس لیے بھی وہ آپ کی طرح خاموش ہیں۔

1948ء میں کراچی میں چند ہندوؤں کی کچھ املاک کو آگ لگائی گئی تو آپ نے چند گھنٹوں کے اندر انتظامیہ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا اور بے نقاب کر دیا۔ آپ چاہتے تو محض دکھ اور صدمے کا ایک پریس ریلیز جاری کروا [illegible] واقعی [illegible] کر سکتے تھے

(سیلنس کو جاری رکھنے کا عزم قلندر حسین سید کا کالم نوائے وقت ملتان 23 جون 2013ء سے اقتباس)

"شادی میں"

ایک بچے نے شادی میں رخصتی کے وقت اپنی ماں سے پوچھا: "امی دلہن بہت رو رہی ہے دولہا کیوں نہیں رو رہا؟"

ماں! "بیٹا! دلہن گیٹ تک روئے گی اس کے بعد دولہا قبر تک روئے گا!"۔

"حقائق"

چین کی آبادی ایک ارب 35 کروڑ۔ اس کے 14 منسٹر۔

انڈیا کی آبادی ایک ارب 27 کروڑ اس کے 32 منسٹر۔

امریکہ کی آبادی 32 کروڑ اس کے 14 منسٹر۔

پاکستان کی آبادی 18 کروڑ اس کے 96 منسٹر۔

ایک منسٹر کا سالانہ خرچہ 16 کروڑ روپے غریب عوام کے امیر حکمران، پاکستان زندہ باد!

"ماں"

وطن عزیز کے نامور سفارت کار آغا شاہی جن کے نام پر اسلام آباد کی ایک معروف ایونیو بھی ہے۔ گھرداری کے جھنجھٹ میں نہیں پڑے تھے۔ ساری زندگی تن تنہا زندگی گزار دی۔

کسی نے وجہ پوچھی تو بولے کہ یہ کام ماؤں کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ ماں نے تو ایک بار پوچھا تو ہم نے نخرہ دکھا لیا۔ اب ماں نہ رہی تو پھر کسی نے پوچھا ہی نہیں۔

"تعلیم"

امریکی یونیورسٹی [illegible]

تقریب تھی ایک خوشی کی لہر اور ایک جشن کا سماں۔ طلباء اور طالبات ہوا میں اپنی اپنی دستار ہائے فضیلت اچھال رہے تھے کہ ایک چلایا "شکر ہے کہ تعلیم مکمل ہو گئی" سینئر ٹیکنکلیٹی ممبر رابرٹ کلے نے سنا تو کہا "آپ کو مغالطہ ہوا ہے" ڈگری مکمل ہوئی ہے تعلیم نہیں"۔ تعلیم تو مہد سے لحد تک مکمل نہیں ہوتی۔

شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدہ اغیار کو بینا کر دیں

(اقبال)

"بیٹی"

والدین شاید بیٹیوں سے اسی لیے زیادہ پیار کرتے ہیں کہ نہ جانے ان کی آئندہ زندگی میں انہیں اتنا پیار، لاڈ اور مان میسر آ بھی سکے گا کہ نہیں؟ جس شخص کے ہاتھوں میں وہ اپنی ہیرے کی بیٹی دے رہے ہیں وہ اس کی قدر کر سکے گا کہ نہیں؟ کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بیاہی بیٹیوں کے دکھ بابل کی دہلیز کے اندر بیٹھی بیٹیوں سے کہیں زیادہ دل شکن اور اعصاب توڑ ہوتے ہیں جو اچھے خاصے والدین کو ریت کی بھربھری دیوار کی طرح آہستہ آہستہ زمین بوس کرتے چلے جاتے ہیں یہی وجہ ہے دعاؤں میں نصیب کے اچھے ہونے کی دعا سر فہرست رہی ہے۔

"پروین شاکر"

یہ تو ہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

سو اسلامی کیلنڈر ہو گریگورین یا کوئی اور ...... وقت کے حوالے سے ہر تقسیم اسی "اعتبار" سے رشتہ آرا ہے۔ ورنہ اقبال تو کہہ گئے ہیں [illegible]

[illegible] ہے تو ہم [illegible] رواں کے سوا

اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

اور یہ کہ...... ایک زمانے کی رو جس میں شہ دن ہے

شہ دات دسمبر کے آخری چند دنوں کے حوالے سے گزشتہ پانچ برس سے جو یاد ہماری ذات اور اردو شاعری کے لاکھوں قارئین کی زندگی کا حصہ بن چکی ہے، ملک تمام کی شاعرہ پروین شاکر کی رحلت ہے۔ ہم اسے بے وقت یا قبل از وقت نہیں کہیں گے کیونکہ موت کا دن تعیین کرنے کا اختیار جس دربار میں ہے وہاں ہماری آپ کی منطق یا خواہشات نہ چلتی ہیں اور نہ کسی شمار میں آتی ہیں۔ پیارے دوست دلدار بھٹی کے جنازے پر ایک ان پڑھ دیہاتی نے بڑے سادہ مگر واضح لفظوں میں ہمیں ٹوکا تھا کہ آدمی کسی موت کو بے وقت صرف اس وقت کہہ سکتا ہے اگر اس کے صحیح وقت کا علم ہو!!

ابھی چند دن قبل پروین کے بیٹے مراد المعروف گیتو سے بیگم پروین قادر آغا کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ ذہانت میں بالکل اپنی ماں پر گیا ہے۔ اس کی تازہ تر کامیابیوں سے آگاہی کے دوران بار بار پروین کا چہرہ ہماری آنکھوں میں گھومتا رہا اور کئی باریوں لگا جیسے وہ بھی نہ صرف ان باتوں کو سن رہی ہے بلکہ خوشی سے مسکرا رہی ہے۔

پروین 26 دسمبر 1994ء کو اسلام آباد کی ایک بڑی سڑک پر ٹریفک کے حادثے میں اس وقت جاں بحق ہوئی تھی جب اس کا ڈرائیور بارش اور دھند کے باعث کار کو موڑنے کے لیے مقررہ جگہ سے کچھ آگے نکل گیا تھا اور دوسری طرف سے آنے والی تیز رفتار بس کے ڈرائیور نے جو خود بھی غلط لائن میں آ رہا تھا۔ بجائے رُک کر اسے جگہ دینے کے تیزی سے آگے نکلتا چلا اور یوں موسم، تقدیر اور تدبیر کی خرابی نے اردو دنیا سے اس کی سب سے خوبصورت اور باہنر شاعرہ چھین لی۔

بتانے والے بتاتے ہیں کہ اگرچہ غلطی دونوں ڈرائیوروں کی تھی مگر بس ڈرائیور جس طرح تیز رفتاری سے تک پروین کی کار کو گھسیٹتا چلا گیا وہ اس کی نااہلی اور ناتجربہ کاری کا کھلا ثبوت تھا۔ جس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ہمارے یہاں گاڑیوں کے سٹیئرنگ پر بیٹھنے والے بیشتر افراد یا تو سرے سے لائسنس ہولڈرز نہیں ہوتے یا پھر یہ لائسنس انہیں بغیر ڈرائیونگ ٹیسٹ پاس کیے مل گیا ہوتا ہے (جو ایک الگ افسوسناک کہانی ہے) زیادہ تر ویگنوں اور بسوں کے ڈرائیور کلینرز سے شروع ہوتے ہیں اور فارغ وقت میں اپنے ہی جیسے کسی استاد ڈرائیور سے مختلف قسطوں میں ایک ایسی بے ضابطہ سی ڈرائیونگ سیکھتے ہیں جس کا کوئی تعلق ٹریفک کے قوانین کے علم اور شعور سے نہیں ہوتا اور اس کے بعد چل سو چل۔

پروین کے انتقال پر پورے ملک میں جو ایک ہلچل سی مچی اور اخبارات کی شہ سرخیوں میں اس حادثے کو جگہ ملی تو اس کا اثر متعلقہ بس کے ڈرائیور پر بھی پڑا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ بڑے بڑے لوگوں اور اعلیٰ مراتب پر فائز سرکاری افسران نے حادثے کی تحقیقات کرانے کے سلسلے میں زوردار اور جذباتی بیانات بھی دیئے اور یوں لگتا تھا کہ جیسے اس حادثے کے ذمہ دار افراد کا کڑا محاسبہ کیا جائے گا اور مجرم کو قرار واقعی سزا ملے گی۔ بس کے مالکان اور متعلقہ ڈرائیور تک بھی ان بیانات کا دباؤ پہنچ رہا تھا لیکن بتانے والے بتاتے ہیں کہ وہ اس صورتحال سے قطعاً پریشان نہیں تھے کسی نے وجہ پوچھی تو انہوں نے مبینہ طور پر ایک ایسا جواب دیا جو سوسائٹی کے منہ پر ایک طمانچے سے کم نہیں وہ جواب کچھ یوں تھا۔

"ہم اس لیے پریشان نہیں کہ یہ سب پڑھے لکھے عزت دار اور معروف لوگ ہیں باتیں کریں گے اور خاموش ہو جائیں گے۔ کیس کا پیچھا کرنے والے اور طرح کے ہوتے ہیں... مرنے والوں کو اپنا کہتے ہیں... اور پھر ایسا ہی ہوا......!

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیش کش
عبادات رمضان المبارک
شائع ہو گیا ہے
قیمت: 160 روپے
رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جس نے رمضان المبارک کے آنے کی خوشی منائی اللہ تعالیٰ اسے ایک سال تک خوشیاں عطا فرماتا ہے
اور جس نے رمضان المبارک کے جانے کا غم منایا اس سے ایک سال غم دور ہٹا دیتا ہے۔
رمضان کیا ہے۔
رمضان اور روزہ
رمضان اور قرآن
رمضان اور شب قدر
رمضان اور اعتکاف
رمضان اور تراویح
رمضان کی عبادات
وظائف اور دعائیں
رمضان اور نوافل
رمضان کی عبادات کا اثر تمام سال کیسے رہتا ہے۔
رمضان میں عورتوں کے مسائل اور ذمہ داریاں
ایک مکمل اور جامع گائیڈ۔ گھر کے ہر فرد کیلئے۔ آپ کے دوست احباب کیلئے رمضان کا بہترین تحفہ!
اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں۔
خود پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں
سیارہ ڈائجسٹ 240 ریاض مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور فون: 5412 372

("چھاؤں" امجد اسلام امجد کی کتاب سے اقتباس)

"ایک حکایت"

ہنس اور ہنسی کا ایک جوڑا ایک گاؤں میں پہنچے جہاں کے بیشتر گھر خالی اور لوگ پریشان حال تھے۔ اس صورت حال کی وجہ پوچھی گئی تو گاؤں والوں نے بتایا کہ یہ سب کچھ اس اُلو کی نحوست کی وجہ سے ہے جو گاؤں کے کونے پر ایک بڑھ کے درخت پر رہتا ہے اور یہ کہ وہ سب اس کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ ہنس اور ہنسی از راہ تجسس کچھ دن بعد اُڑتے اُڑتے اس پیڑ کی شاخوں پر جا بیٹھے۔ اُلو نے انہیں خوش آمدید کہا، اپنے ہمسائے میں رہنے کی پیش کش کی اور ان کی خوب خاطر تواضع کی۔ ہنسوں کا جوڑا اس حُسن سلوک سے بہت خوش ہوا اور وہیں رہ پڑا۔ اگلے دن ہنس اپنی مادہ کو وہیں چھوڑ کر تلاش رزق میں نکلا واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اُلو نے اس کی مادہ پر قبضہ کر رکھا ہے اور اسے اپنے گھونسلے میں لے جا کر بیٹھا یا ہے۔ جب ہنس نے اپنی مادہ کی واپسی کا تقاضہ کیا تو اُلو نے جواب دیا کہ وہ تو اس کی بیوی ہے اور ہنسی نہیں بلکہ ایک مادہ اُلو ہے۔ یہ بحث بڑھ گئی تو اُلو نے کہا کہ ہنس میاں تم گاؤں والوں کی پنچائیت بلا لو جو فیصلہ وہ کریں گے اسے منظور ہوگا۔ ہنس اس بات پر راضی ہو گیا۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب گاؤں والوں نے پورا کیس اور اُلو اور ہنس کا بیان سن کر اُلو کے حق میں فیصلہ دے دیا اور ہنس کو کہا کہ وہ شام سے پہلے یہ علاقہ چھوڑ دے۔ پریشان حال ہنس الوداعی ملاقات کے لیے اُلو کے پیڑ پر گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ جانے سے پہلے ایک بار اپنی مادہ (ہنسی) کو اس سے ملوا دے۔

اُلو نے مسکرا کر کہا کہ وہ تمہاری ہی بیوی ہے تم چاہو تو اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ ہنس نے حیرت سے پوچھا کہ ... سب کیا ہے ... پہلے تم اسے اپنی بیوی بتا رہے تھے اور پنچائیت نے بھی تمہارے حق میں فیصلہ دے دیا اور اب تم یک دم بدل گئے ہو۔ اس پر اُلو نے ایک آہ بھری اور کہا " اس بستی کی بربادی کا سبب میں یا میری نحوست نہیں ،خود اس بستی کے لوگ ہیں کہ جن میں سے انصاف اُٹھ گیا ہے اور جب کسی بستی سے انصاف اُٹھ جائے تو وہاں جھوٹ سچ کی پہچان اور کھرے کھوٹے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔

"کلام قتیل شفائی"

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمین پر نہیں گرتا

گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا

سمجھو وہاں پھل دار شجر کوئی نہیں ہے
وہ صحن کہ جس میں کوئی پتھر نہیں گرتا

اتنا تو ہوا فائدہ بارش کی کمی سے
اس شہر میں اب کوئی پھسل کر نہیں گرتا

مشکوک نظر سے مجھے تکتی ہے یہ دھرتی
کیوں عرش معلیٰ مرے سر پر نہیں گرتا

انعام کے لالچ میں لکھے مدح کسی کی
اتنا تو کبھی کوئی سخنور نہیں گرتا

اس بندہ خوددار پہ نبیوں کا ہے سایہ
جو بھوک میں بھی لقمہ تر پر نہیں گرتا

کرتا ہے جو سر معرکہ زیست تو سن لے
بے بازوئے حیدرؓ درِ خیبر نہیں گرتا

("رنگ، خوشبو، روشنی" کلیات غزلیں سے)

ڈرامہ نگار اور دانشور۔ طنز و مزاح نگار انور مقصود سے کسی نے پوچھا کہ پاکستانی سیاستدان کو الیکشن میں کیسے چنا جائے...؟

انور مقصود نے برجستہ جواب دیا "جیسے اکبر

بادشاہ نے انارکلی کو "چنا" تھا دیوار میں۔

"ڈیل نہیں کی تھی"

جب نواز شریف نے گفتگو شروع کی تو لگ رہا تھا کہ وہ مزاحمت کے موڈ میں تھے۔ وہ اب پیچھے آنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ سعودی حکمرانوں کو بھی ناراض کرنے پر تل گئے تھے۔ اب ان کا راستہ نہیں روکا جاسکتا تھا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن جب میاں صاحب نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک کاغذ سے یہ پڑھنا شروع کیا کہ ان کا جنرل مشرف کے ساتھ باہر رہنے کا معاہدہ پانچ سال کا تھا نہ کہ دس سال کا تو ہم سب چونک پڑے۔ ہمارے خیال میں میاں صاحب ایک ایسی بات کہہ گئے تھے جس کا خمیازہ انہیں سیاسی طور پر بھگتنا ہوگا کیونکہ اب تک ان پچھلے آٹھ سالوں میں وہ مکہ اور مدینہ میں بیٹھ کر یہ قسمیں کھاتے رہے تھے کہ انہوں نے جنرل پرویز مشرف سے کوئی ڈیل نہیں کی تھی اور آج وہ سب کو یہ بتا رہے تھے کہ ان کی ڈیل پانچ سال کے لیے تھی۔

پاکستان میں تمام ٹی وی چینل اس وقت موبائل ٹیلی فون کے ذریعے نواز شریف کی یہ لائیو گفتگو نشر کررہے تھے۔

میں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ سعودی شہزادے کا اسلام آباد میں بیٹھ کر انہیں واپس لے جانے کا انتظار کرنا پاکستان کی خودمختاری پر ایک ضرب ہے۔

میاں نواز شریف نے میری طرف دیکھا اور انہوں نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ شاید وہ دینا بھی چاہتے تو نہ دے پاتے۔

نواز شریف صاحب اور ان کے حامیوں کا خیال تھا کہ پانچ سال کی ڈیل کی بات کرکے وہ اپنی واپسی کا جواب تلاش کرلیں گے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کو بھی ان دونوں بھائیوں نے یہ لکھ دیا تھا کہ انہوں نے جنرل مشرف کے ساتھ کوئی ڈیل نہیں کی تھی اور آج اس سپریم کورٹ اور پاکستان کے عوام کو یہ بتایا جارہا تھا کہ ڈیل تو ہوئی تھی لیکن دس سال کے لیے نہیں بلکہ پانچ سال کے لیے تھی۔

وہی کچھ ہوا جس کی توقع تھی جنرل مشرف اور ان کی کابینہ کے وزیروں نے اسلام آباد میں آسمان سر پر اٹھالیا۔ وفاقی وزیر شیخ رشید سب سے آگے تھے باقی وزیروں نے بھی میاں صاحب پر لعن طعن کرنی شروع کی کہ دیکھیں آٹھ سال تک وہ جھوٹ بولتے رہے کہ انہوں نے ڈیل نہیں کی تھی اور آج واپسی سے ایک دن پہلے انہوں نے خود اپنی زبان سے یہ اعتراف کرلیا تھا۔

یوں پاکستان میں بارہ گھنٹے کے اندر اندر نواز شریف کے اس اعتراف کو اس طریقے سے جنرل مشرف کے وزیروں نے استعمال کیا کہ پی ایم ایل کے لیڈروں اور ورکروں کا سارا جوش بڑی حد تک ٹھنڈا ہوگیا اور رائے عامہ بڑی حد تک جنرل مشرف کے حق میں ہموار ہوگئی۔

میں نے کانفرنس سے نکلنے کے بعد نواز شریف کے قریبی لیڈر سے یہ کہا کہ حضور! یہ سمجھدار مشورہ میاں صاحب کو کس نے دیا تھا؟ تو انہوں نے نہایت سیاسی جواب دیا۔ بولے کہ یہ سب کا مشترکہ فیصلہ تھا اگرچہ دو ایک لوگ اس کے خلاف تھے لیکن میاں صاحب کا خیال تھا کہ وہ کوئی جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ وہ کہنا یہ چاہ رہے تھے کہ یہ ڈیل جنرل مشرف اور سعودی حکمرانوں کے درمیان ہوئی تھی جو کہ پانچ سال کے لیے تھی۔ یہ ڈیل نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان نہیں تھی۔

میں نے ان سے بڑے ادب سے کہا کہ حضور! اب آپ یہ بات پاکستان میں کس کس کو بارہ گھنٹوں میں سمجھاتے رہیں گے کہ یہ ڈیل جنرل مشرف اور سعودی حکمرانوں کے درمیان تھی اور نواز شریف کو اس کی خبر

آج آٹھ سال بعد لندن میں بیٹھ کر پہلی دفعہ ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ ظفر اقبال کا شعر اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا کہ

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی اس پہ رہو ظفر
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے

میں نے کہا کہ صاحب اگر آٹھ سال تک یہ جھوٹ بولا تھا تو اگلے بارہ گھنٹے بھی اس جھوٹ پر قائم رہتے۔ کیا ضرورت آن پڑی تھی کہ آپ خود بیٹھ کر اس کا اعتراف کریں کہ ڈیل پانچ سال کے لیے تھی۔

تیر کمان سے نکل چکا تھا نواز شریف کے حامیوں کا ابھی بھی خیال تھا کہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر پورا پاکستان نواز شریف کا استقبال کرنے کے لیے لڈ آئے گا۔ لکی لکی جذباتی باتیں سننے کو مل رہی تھیں کہ حیران ہو رہا تھا۔

غلام مصطفیٰ کھر بھی پاکستان سے خصوصی طور پر لندن پہنچ چکے تھے۔ ان کا وہاں آنے کا ایک ہی مقصد تھا کہ دنیا بھر کے کیمرے وہاں اکٹھے ہوں گے اور ٹی وی سکرین کے کسی کونے کھدرے میں میاں صاحب کے پیچھے ان کی شکل بھی نظر آ جائے گی۔ مجھے بڑی حیرانی ہو رہی تھی کہ کچھ ماہ قبل غلام مصطفیٰ کھر کی بیوی تہمینہ درانی سے شہباز شریف نے شادی کی تھی اور آج کھر صاحب اپنی سابقہ بیوی کے نئے شوہر کو لندن سے اسلام آباد لانے کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ جس غیرت اور عزت کا مظاہرہ کھر صاحب کر رہے تھے اس سے ہم بہت سوں کے سر شرم سے جھک گئے تھے کیا انسان اتنا بھی گر سکتا ہے کہ محض ٹی وی کیمروں میں اپنی شکل دکھانے کے لیے وہ اس حد تک جانے کو تیار ہو جاتا ہے جو اپنی بیوی کے نئے شوہر کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر ایک کونے میں بیٹھ کر سفر کرے۔

مصطفیٰ کھر سوال ایک ایکٹنگ کر رہے تھے پیچھے

وہ ذوالفقار علی بھٹو کو لندن آ کر نہیں بچا سکے تھے لیکن اپنے گناہوں کا کفارا ادا کرنے کے لیے وہ نواز شریف کو ضرور لندن سے پاکستان لے جائیں گے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو تو جنرل ضیاء جیسے ڈکٹیٹر کے ہاتھوں پھانسی لگنے سے اس لیے نہیں بچا سکے تھے کہ انہیں اپنی جان عزیز تھی لیکن لگتا تھا کہ اب کی دفعہ وہ ضرور نواز شریف کو جنرل مشرف کے ہاتھوں بچا کر ضرور پاکستان لے جائیں گے۔

مجھے مصطفیٰ کھر کی ہیتھرو ایئرپورٹ پر حرکتیں دیکھ کر بڑی ہنسی آ رہی تھی کہ پچھتر سال کی عمر میں بھی موصوف ایک بوڑھی نائیکہ کی طرح اپنے جوان عاشقوں سے تھوڑی سی توجہ لینے میں مصروف تھے۔ مصطفیٰ کھر سے زیادہ مجھے نواز شریف اور شہباز شریف کی عقل پر ہنسی آ رہی تھی جنہوں نے بغیر دانتوں اور دُم کے اس کاغذی شیر کو اپنے ساتھ جہاز میں لے جانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

مجھے شہباز شریف اور مصطفیٰ کھر کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہیتھرو ایئرپورٹ پر چلتے دیکھ کر یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ تہمینہ درانی نے مصطفیٰ کھر کو چھوڑ کر شہباز شریف سے کیوں شادی کر لی تھی یا یہ بھی ممکن تھا کہ تہمینہ درانی بھی سیاستدانوں کے ساتھ رہتے ہوئے یہ سیکھ گئی تھی کہ ہر سمجھ دار شخص کو چڑھتے سورج کو سلام کرنا چاہیے۔ مصطفیٰ کھر کا سیاسی فیوچر کب کا ختم ہو چکا تھا اور شہباز شریف کا ابھی باقی تھا۔ یوں تہمینہ درانی کا فیصلہ زیادہ غلط بھی نہیں تھا۔ خصوصاً جب شہباز شریف اور مصطفیٰ کھر لندن کی سڑکوں پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے وطن واپسی کے پروگرام ڈسکس کر رہے تھے۔

("ایک سیاست کئی کہانیاں" رؤف کلاسرا کی کتاب۔ سے اقتباس)

رمضان، کیا کھائیں کیا نہ کھائیں

صابرہ بانو شیریں

افطاری پر اور سحری پر ڈٹ کر کھایا جاتا ہے۔ صبح ہوتے ہی ڈکاروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پیٹ بھاری اور گیس کی وجہ سے پھول جاتا ہے۔ جمائیاں آتی ہیں۔ غذائی احتیاط برتی جائے۔ حفظان صحت کا خیال رکھا جائے تو روزے گراں نہیں محسوس ہوتے بلکہ عبادت ریاضت میں بھی زیادہ لطف آتا ہے!

رمضان المبارک نیکیوں، رحمتوں کا موسم بہار ہے۔ نیکیوں پر ستر گنا زیادہ ثواب ملتا ہے۔ دیکھا جائے تو وہ شخص بہت ہی بدقسمت اور بدنصیب ہے۔ جو اس کی برکتوں سے محروم رہے۔ روزہ جو لوگ رکھتے ہیں اس کا اجر اللہ تعالیٰ ہی عنایت فرماتے ہیں۔ ضبط نفس اور احساس [illegible] بندگی [illegible] اصل روزے [illegible] کی روح ہے۔ اس سے ہماری جسمانی صحت کی تربیت ہوتی ہے۔ صحت کے حوالے سے روزے کا جائزہ لیا جائے تو ہمارے جسمانی اعضاء تک آکسیجن کی ترسیل بہتر ہو جاتی ہے۔ مضر صحت کولیسٹرول (ایل ڈی ایل) کم ہو جاتا ہے اور مفید کولیسٹرول (ایچ ڈی ایل) کا [illegible] جا [illegible] بھوک اور پیاس کی شدت

برداشت کی جاتی ہے۔ کھانے پینے میں اعتدال رکھا جائے تو ماہ صیام بہت اچھا گزرتا ہے۔ سحری اور افطاری میں غذائی احتیاط برتی جائے۔ حفظان صحت کا خیال رکھا جائے تو روزے گراں نہیں محسوس ہوتے بلکہ عبادت ریاضت میں بھی زیادہ لطف آتا ہے۔ تراویح اور تہجد کی پابندی ہو جاتی ہے۔ ایک خاتون خانہ اپنے سگھڑاپے سے رمضان میں سحری اور افطاری کے وقت کھانے پینے کی خاص احتیاط سے پورے گھرانے کی کو صحت مند رکھنے میں نمایاں کردار ادا کر سکتی ہے۔ سحری اور افطاری میں کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں۔ کن چیزوں سے پرہیز کریں تو روزے بہت اچھے گزرتے ہیں۔ ان باتوں کا خیال رکھ کر ہم رمضان المبارک کی برکتوں سے بہتر طور پر فیضیاب ہوسکتے ہیں۔

ہمارے ہاں افطاری پر اور سحری پر ڈٹ کر کھایا جاتا ہے۔ حالانکہ روزے میں اس طرح کھانا صحت کے لیے مفید نہیں۔ صبح ہوتے ہی ڈکاروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پیٹ بھاری اور گیس کی وجہ سے پھول جاتا ہے۔ جمائیاں آتی ہیں۔ ظہر کے بعد پیٹ کا تناؤ قدرے کم ہوتا ہے۔ اسی طرح افطاری کے وقت پکوڑے' کچوریاں' دہی بھلے' چاٹ کے بغیر روزہ روزہ ہی نہیں لگتا۔ اس کے بعد کھانے کی گنجائش بھی نکالی جاتی ہے۔ سحری کے وقت پراٹھے سالن آملیٹ کے ساتھ ہی لسی' پانی خوب پی کر وقت کم ہونے کی بناء پر گرما گرم چائے ضرور پی جاتی ہے۔ بعض دفعہ چائے پیتے پیتے روزے کا ٹائم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح پہلے ٹھنڈا پانی پھر گرم چائے اور پھر ٹھنڈے پانی سے ٹوتھ پیسٹ کرنے سے دانتوں اور مسوڑھوں پر بھی اثر پڑتا ہے۔ ہمارا معدہ بے چارہ پہلے ہی بھرا ہوا لگتا ہے۔ جمائیاں' ڈکاریں' پھر کھٹی ڈکاریں، پیٹ میں [illegible] تناؤ [illegible] جاتی ہے۔

اگر ہم اعتدال سے کھائیں۔ صبح کی نماز پڑھ کر تھوڑی چہل قدمی کریں۔ قرآن پاک کی تلاوت کریں تو چہرہ بھی ہشاش بشاش نظر آتا ہے۔ کام کاج میں بھی کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ چلچلاتی دھوپ میں کام کرتے ہوئے مزدوروں کو دیکھیے۔ ننگا جسم، پسینہ بہتا ہوا مگر وہ روزے کے ساتھ محنت کرتے ہیں۔

چکنائی کا استعمال کم کریں

ہمارے ہاں پکوانوں میں چکنائی کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ پکوڑے بناسپتی گھی میں بناتے ہیں۔ پراٹھے پر ڈھیر سارا گھی لگاتے ہیں۔ سالن پکاتے وقت بھی اچھا خاصا کوکنگ آئل ڈالا جاتا ہے تاکہ سالن کی رنگت اور ذائقہ اچھا رہے۔ سورج مکھی کا تیل صحت کے لیے اچھا ہے۔ اسی طرح زیتون کا کھانا پکانے والا تیل بھی بازار میں دستیاب ہے۔ کچھ خواتین فرائی پین میں تیل بھر کر رکھتی ہیں۔ روزانہ اس کو گرم کر کے پکوڑے تلتی ہیں۔ آٹھ دس دن بعد تیل گاڑھا ہو جاتا ہے۔ رنگ بھی بدلتا ہے۔ آپ تھوڑا سا تیل ڈال کر استعمال میں لائیں۔ دو تین دن بعد تازہ تیل ڈالیے۔ اسی طرح گوشت بھی چکنائی کے بغیر خریدیے۔ عموماً متوسط طبقہ گائے کا گوشت خریدتا ہے۔ خیال ہے کہ گوشت کھانے سے توانائی ملتی ہے حالانکہ عالمی ادارہ صحت کے ماہرین اچھی صحت کے لیے تازہ موسم کی سبزیاں اور پھل کھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ گوشت بغیر چکنائی کا لیں۔ اس میں سبزی ضرور ڈالیں۔ گھی یا تیل تھوڑا ڈالیں۔

شوگر کے مریض روزہ رکھتے ہیں۔ ان کی غذا کا خاص خیال رکھیں۔ ان کے کھانے میں کم سے کم چکنائی ہونی چاہیے۔ تلی ہوئی میٹھی چیزوں سے افطاری میں گریز کریں۔ ایک سے دو کھجوریں لیں اور ایک سیب ایک امرود کی چاٹ بنائیے۔ سادہ [illegible] کھائیے، [illegible] امرود پابندی سے کھائیے۔ [illegible] رمضان

اچھا گزر سکے۔ بیسن کی سادہ چھوٹی پکوڑیاں تل کر پانی میں دو منٹ کے لیے ڈال لیے۔ پھر انہیں نچوڑ کر رکھیے۔ دہی میں ملا کر پسا ہوا سفید زیرہ، پسی مرچ تھوڑا سا نمک ملائیے۔ صرف چاٹ مصالحہ بھی ڈال سکتے ہیں۔ ایک پیاز کاٹ کر دو ہری مرچیں اور ہرا دھنیا کاٹ کر ملائیے۔ پکوڑیاں پانی میں بھگونے سے چکنائی نکل جائے گی۔ اسی طرح آپ ٹیشو پیپر پر یا اخبار کے کاغذ پر پکوڑے تل کر رکھیے۔ چکنائی کاغذ پر آجائے گی۔ تھوڑی سی احتیاط کرنے سے آپ چکنائی کے مضر اثرات سے بچ سکتے ہیں۔

دہی

دہی کا استعمال ہمارے ہاں ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی کیا جاتا ہے۔ اب تو مغربی ممالک یورپ اور امریکہ میں بھی دہی شوق سے کھایا جاتا ہے۔ جدید طریقوں سے اسے مختلف پھلوں کے ذائقہ کے ساتھ کھاتے ہیں۔ سلاد میں شامل کرتے ہیں ۔دہی میں پروٹین، صحت کے لیے ضروری وٹامن، معدنی اجزا کے ساتھ ساتھ کیلشیم، ریبو فلاوین بھی موجود ہے۔ بچوں اور بڑی عمر کے لوگوں کے لیے مفید غذا ہے۔ دہی کی لسی بھی غذائیت فراہم کرتی ہے۔ جو لوگ دہی کا استعمال کرتے ہیں ان کی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور وہ طویل عمر پاتے ہیں، دہی سے کڑھی بنتی ہے، دہی بھلے بناتے ہیں، دہی کا رائتہ بنتا ہے، آلو کا رائتہ، بینگن کا رائتہ، کھیرے کا رائتہ شوق سے کھایا جاتا ہے۔ تازے کچے کھیرے کدوکش کرکے دہی میں ڈال کر رائتہ بنائیے۔ پودینہ، سفید زیرہ، نمک، کالی مرچ، تھوڑی سی سرخ مرچ ڈال کر کھائیے۔ افطاری کے بعد کھانے میں دہی ضرور شامل کریں۔ یہ ایک الکلائن غذا ہے۔ غذا کو ہضم کرنے میں مدد [illegible] ہے بلکہ معدے کی تبخیر اور خشکی دور کرتا ہے۔ [illegible] کے وقت [illegible]

پراٹھے کھائے جاتے ہیں۔ دہی کی پتلی نمکین لسی بنتی ہے جس سے تمام دن روزے میں نقاہت محسوس نہیں ہوتی اور روزے آسان لگتے ہیں۔

لیموں پانی

لیموں کی سکنجبین ایک اچھا مشروب ہے۔ اسے پینے سے سکون ملتا ہے۔ رمضان میں روزہ کھولنے کے لیے بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ نمکین اور میٹھی سکنجبین تقریباً ہر گھر میں بنتی ہے۔ اب تو لوگ چینی کے بجائے روح افزا، جام شیریں میں بھی لیموں کا رس نچوڑ کر پیتے ہیں۔ اس سے اچھا ذائقہ آجاتا ہے۔ چھوٹے لیموں میں وٹامن سی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ کیلشیم فاسفورس اور قدرتی شکر بھی اس میں موجود ہے۔ آپ چھوٹے درمیانی لیموں خرید کر رکھ سکتے ہیں۔ لیموں کا رس نکالنے سے پہلے اگر اسے کچن میں ثابت ہی رکھ کر ہاتھ سے دو چار بار ہلکا سا دباؤ دے کر رگڑ لیں تو کاٹنے کے بعد رس زیادہ نکلتا ہے۔ لیموں کھانے میں سلاد میں چاٹ میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ قدیم حکیموں نے اس کے فوائد پیش نظر رکھتے ہوئے سکنجبین کا تعارف صحت و توانائی کو مدنظر رکھتے ہوئے ذائقہ دار لذیذ مشروب کے طور پر پیش کیا۔ شفائی اثرات اس کے رس، بیج، چھلکے میں شامل ہیں۔ روزوں میں عموماً لوگ اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیموں گلے کی خراش کو ٹھیک کرتا ہے۔ ہمارے دانتوں مسوڑھوں کو مضبوط بناتا ہے۔ گیس ختم کرتا ہے۔ بدہضمی، قبض پیٹ کی بیماریوں کے لیے مفید ہے۔ بھوک لگاتا ہے۔ سینے کی جلن کو دور کرتا ہے۔ ہائی بلڈ پریشر، خون کی نالیوں کے سکڑ جانے اور شریانوں کے نظام کو متوازن رکھتا ہے۔ ہیضہ جیسی بیماری میں لیموں پانی مفید ہے۔ لیموں پانی روزوں میں کولا مشروبات سے بدرجہا بہتر ہے۔

کھجور

[illegible] رمضان میں کھجور افطاری

کے وقت ضرور کھائی جاتی ہے۔ اس سے روزہ افطار کرنا سنت رسول ﷺ ہے۔ طبی غذائی افادیت کا جائزہ لیا جائے تو اس میں شفا ہی شفا ہے۔ تمام دن کی نقاہت اور کمزوری کھجور دُور کردیتی ہے۔ فوری توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ نوعمر بچے بچیاں بڑے شوق سے روزہ رکھتے ہیں۔ آپ عمدہ قسم کی بڑی کھجور خریدیں۔ گٹھلی نکال دیجئے۔ اس میں بالکل ٹھنڈی کریم یا بالائی بھر کر فریج میں رکھیے۔ بچوں کو یہ کھجور بھرپور غذائیت دے گی۔ آپ کھجور میں بادام کی گری رکھ سکتے ہیں۔ ایک پاؤ کھجور کی گٹھلیاں نکال کر انہیں اچھی طرح مسلیے دو بڑے چمچے شہد ملا دیجئے۔ کسی چیز پر رکھ کر رول بنائیے۔ بادام، پستہ، ناریل کوٹ کر ایک پلیٹ میں رکھیے، رول میں تھوڑا سا پیسٹ لے کر کھجور کی شکل دے کر میوے کی پلیٹ میں رکھ کر اچھی طرح لگا لگا کر رکھتے جائیے۔ صرف دو کھجوریں بچے کھالیں تو ان کو توانائی ملے گی۔ اسی طرح ایک ایک کپ کھجوروں کو مسل کر اس میں دو بڑے کیلے مسل کر ملائیے۔ دو مٹھی سپودن تازہ پودینہ باریک کاٹ کر ڈالیے۔ دو لیموں نچوڑ کر معمولی سا نمک چھڑکیے۔ کھجور کی یہ چاٹ صحت بخش ہے۔ روزے کی وجہ سے پیشاب میں جلن ہو، تھوڑا آئے، کمزوری محسوس ہو تو یہ چاٹ بہت زود ہضم اور معدے کو طاقت دینے والی ہے۔ معدے کی تیزابیت اور گرمی دُور کرتی ہے۔

پھلوں کی سادہ چاٹ

پھلوں کی چاٹ افطاری میں ضرور رکھی جاتی ہے۔ پھل روزانہ نہیں خریدے جاسکتے۔ آپ کسی روز صرف امرود کی چاٹ بنائیے۔ چاٹ مصالحہ لیموں کا رس اور چینی ملائیے۔ اس میں ذائقہ کے لیے صرف دو کیلے شامل کریں اور ایک کینو کا رس ملائیے۔ رمضان میں [illegible] سفید کابلی چنے اور کالے چنے بھگو کر اُبال کر فریز کرسکتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پلاسٹک کے بیگ میں رکھیے۔ بھنا ہوا سفید زیرہ پیس کر رکھیے۔ املی بھگو کر رکھیے، آپ املی کی چٹنی بھی بنا کر رکھ سکتے ہیں۔ املی بھگو کر چھان کر اس میں تھوڑی سی چینی یا گُڑ ملا کر پکائیے۔ تھوڑی سی سونٹھ پیس کر ملا سکتے ہیں۔ نمک ڈال سکتے ہیں ورنہ صرف املی اور چینی ہی کافی ہے۔ فریج میں رکھیے۔ چنوں میں ملائیے۔ اُبلے ہوئے آلو کاٹ کر ڈالیے۔ ٹماٹر، پیاز، ہری مرچ، ہرا دھنیا چاٹ مصالحہ املی کی چٹنی ملائیے، چٹنی نہ ہو تو لیموں نچوڑ لیں۔ اس میں آپ گھر میں موجود کوئی پھل بھی ملا سکتی ہیں۔ ایک سیب کاٹ کر ڈالیے۔ افطاری کے لیے چاٹ تیار ہے۔ اسی طرح سفید لوبیے اور سرخ لوبیے کی سلاد بھی بنتی ہے۔ اُبال کر اسی میں ہرا مصالحہ چاٹ مصالحہ لیموں ملا دیتے ہیں۔ کوشش کریں افطاری میں بازار کی تلی ہوئی چیزیں نہ کھائیں۔ پیسہ اور صحت دونوں کا ضیاع ہوتا ہے۔ سموسے، پکوڑے، کچوریاں پیٹ کو بوجھل کردیتی ہیں۔ کھانا کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ گھر کی بنی ہوئی افطاری کریں۔ سادہ کھانا کھائیں تاکہ سحری بخوبی کرسکیں۔ ڈاکٹر نے اگر آپ کو کچھ دوائیاں دی ہیں تو وہ ضرور کھائیں۔ دوا ترک نہ کریں۔ بلکہ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق وقت پر کھائیے تاکہ صحت برقرار رہے اور آپ روزے رکھ سکیں آپ کی تھوڑی سی احتیاط اور پرہیز آپ کو صحت کے ساتھ ساتھ رمضان بھی اچھا گزارنے اور عبادت کرنے میں مدد دے گا۔

سحری میں کیا کھائیں؟

عام لوگ شکایت کرتے ہیں کہ سحری میں کچھ کھایا نہیں جاتا۔ آنکھ دیر سے کھلے تو چائے بھی پینے کا مزے نہیں آتا ہے۔ ہمارے ہاں سحری [illegible] پراٹھا [illegible] پراٹھے [illegible] کر ہی روزہ رکھا

ایمان افروز ...... عقل پرور ...... عمل آفرین
سیارہ ڈائجسٹ
کا عظیم الشان
قرآن نمبر
قارئین کے اصرار اور مانگ کے تحت دس سال کے بعد نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔
☆...... دائمی اہمیت اور افادیت کا حامل ☆...... ایک متاعِ بے بہا
☆...... ایک دستاویز ☆...... اعلیٰ رنگین طباعت
☆...... ضخامت 1500 صفحات ☆...... تین جلدوں میں
اپنی خدمات، مصنوعات کا اشتہار جلد جاری فرمائیں
مکمل سیٹ قیمت -/525
قارئین کرام براہِ راست بذریعہ منی آرڈر یا وی پی قرآن نمبر منگوا سکتے ہیں
سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن، لاہور۔
فون: 042-37245412

جاتا ہے۔ سالن، قیمہ، کباب، انڈے کا آملیٹ ہوتا ہے۔ چار پانچ انڈوں میں ایک پیاز، نمک، مرچ ڈال کر آملیٹ بنا لیتے ہیں۔ گرمی کے روزوں میں آملیٹ بنوائیے مگر ذرا سا منفرد طریقے سے۔ صرف دو یا تین انڈے پورے گھرانے کے لیے توڑیں۔ ایک بڑی ہری پیاز لیں اور ایک دوسری پیاز لے کر باریک کاٹ لیں۔ ایک ٹماٹر، ایک شملہ مرچ چھوٹی۔ کالی مرچ پسی ہوئی، ایک چائے کا چمچ، ہرا دھنیا تھوڑا سا کٹا ہوا ملائیے۔ انڈے اچھی طرح پھینٹ کر اس میں تھوڑا سا دودھ ملا کر پھینٹ کر سب چیزیں ملائیے۔ اس کا آملیٹ بنائیے۔ تقریباً تین ٹکیاں آملیٹ کی بن جائیں گی۔ سب کو پسند بھی آئے گا۔ ہمارے ہاں میٹھا دہی بھی روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ دودھ سویاں بنتی ہیں۔ دودھ میں پھینیاں ڈالتے ہیں، دودھ میں جلیبیاں بھگوتے ہیں۔ سحری کا بھرپور اہتمام ہو جاتا ہے۔ میٹھا بھی زیادہ نہ کھائیے۔ سحری میں بچوں کو ایک ایک چپاتی ضرور دیجیے تاکہ روزے میں وہ سارے اپنے کام کر سکیں۔ صرف جوس وغیرہ نہ پلائیے۔ بچوں کو نوڈلز پسند ہیں۔ آپ نوڈلز میں سبزیاں شامل کریں اور دو چار چھوٹی بوٹیاں چکن کی ملا دیں۔ بچوں کو غذائیت بھی ملے گی اور وہ شوق سے کھا لیں گے۔

ہمارے ہاں افراتفری میں سحری کھائی جاتی ہے۔ کھانا ختم نہیں ہوتا تو اذان ہو جاتی ہے۔ ٹھنڈا یخ پانی بھی پیا جاتا ہے۔ پھر گرم چائے بھی ضرور پی جاتی ہے۔ معدہ میں ٹھنڈا اور گرم دونوں چیزیں جاتی ہیں جس سے پیٹ میں گڑبڑ ہونے لگتی ہے۔ گلا بھی خراب ہو جاتا ہے۔ اس کی احتیاط کریں۔ لڑکیاں چاہتی ہیں روزوں میں وہ اپنا وزن کم کر کے سمارٹ بن جائیں۔ وہ افطاری کے بعد تھوڑا تھوڑا چکھ لیتی ہیں۔ ایک پیزا رکھا ہے تو اس کا ایک سلائس کھا لیا۔ ایک سلائس میں جس میں تھوڑا سا گوشت [illegible] لگا ہوا اس میں 185 کیلوریز ہوتی ہیں اور آئس کریم کا صرف ایک چمچ لیا جائے تو اس میں 148 کیلوریز ہیں۔ ڈبل روٹی کے ایک سلائس پر مایونیز ایک کھانے کا چمچ لگائی جائے تو آپ مایونیز سے 100 کیلوریز اور سلائس سے 60 کیلوریز حاصل کریں گے۔ ان چیزوں سے پرہیز کریں۔ سادہ غذا اپنائیے۔ شاید یہی ایک بڑی وجہ ہے کہ رمضان میں روزے رکھنے کے باوجود وزن کم نہیں ہوتا بلکہ قدرے بڑھ جاتا ہے۔ لڑکیاں سوچتی ہیں تھوڑی سی ٹیسٹی پی لی۔ پیزا کھا لیا اس سے کچھ نہیں ہوگا مگر تھوڑا تھوڑا کھانے سے بھی وزن کافی حد تک بڑھ جاتا ہے۔

افطاری اور سحری میں ہلکی غذا استعمال کریں۔ اس سے آپ کی صحت بھی بہتر رہے گی۔ آپ رمضان کے ماہ میں ضبطِ نفس، احساسِ بندگی کے ساتھ ساتھ روزے کی اصل روح کو بھی جان سکیں گے۔ بھوک اور پیاس کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے غریبوں اور مسکینوں کی مدد کریں گے۔ خدا کی خوشنودی کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ جھوٹ، غیبت اور برائیوں سے محفوظ رہتے ہوئے۔ اپنے نفس کی اصلاح کریں گے۔ روزے کا مقصد حصول تقویٰ ہے اور یہی تقویٰ ہمارے اندر کردار کی بلندی اور اعلیٰ اوصاف پیدا کرتا ہے۔ رحمتوں اور نیکیوں کے اس مہینہ میں اپنی کوتاہیوں، غلطیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے توبہ کریں، عبادت کریں، خشوع، خضوع سے اپنے لیے سب کے لیے دعا کریں۔ یہ مغفرت کا مہینہ ہے نیکیوں کے پھولوں سے اپنا دامن بھر لیں۔ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے۔ افطاری میں محلے پڑوس والوں کا دھیان رکھیے۔ روزہ کھلوانے کا بہت ثواب ہے۔ کوئی غریب گھرانہ ہو تو اس کو ضرور افطاری بھجوائیں۔ ان کے ہاں راشن ڈلوائیے تاکہ وہ آرام سے روزے رکھ سکیں۔ ان کی دعائیں آپ کے بہت کام آئیں گی۔

جاوید راہی

غمِ دوراں

ایک شخص کا ماجرا، اس کی کامیاب زندگی ایک عورت نے برباد کردی

"ناصر یہ جو تم ہر وقت نوکری کے خواب دیکھنے میں مصروف رہتے ہو نا یہ درست نہیں۔" میں نے چائے بناتے ہوئے اسے درخواست لکھتے دیکھ کر ٹوکا۔

"امجد میں نے جس مشکل حالات میں بی اے کیا ہے وہ تمہارے سامنے ہے، نوکری کر کے اپنے گھر والوں کا بوجھ بانٹنا چاہتا ہوں۔ چاہے آٹھ نو سو روپے کی کلرکی کیوں نہ کرنی پڑے۔" ناصر نے کپ پکڑتے بڑے مضبوط ارادے سے مجھے جواب دیا۔

ناصر میرا بہت گہرا دوست تھا بڑا منکسار، وقت پر کام آنیوالا میں اس کے سارے حالات جانتا تھا۔

باپ ایک پرائیویٹ فرم میں ایجنٹ تھا، تین جوان بہنیں دو چھوٹے بھائی جو ابھی تک زیرِ تعلیم تھے۔ اوپر سے ناصر کا اپنا بھی بوجھ ابھی تک باپ کے بوڑھے کندھوں پر تھا۔ چائے کا بل حسبِ روایت میں نے ہی ادا کیا۔ پھر میں اپنے آفس اور ناصر نوکری کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ ناصر ہفتہ میں ایک دو بار مجھے ضرور ملتا۔ جب بھی ملتا نوکری کا ہی رونا روتا۔ میں نے اسے پروف ریڈر کی آسامی پر کام کرنے کی پیشکش کی تھی مگر اس نے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی کہ مسلسل ایک جگہ نظر نہیں لگا سکتا آنکھوں میں سے پانی بہنے لگتا ہے۔

گھر پہنچتے ہی سب سے پہلا پیغام جو گڑیا نے دیا وہ ناصر کا تھا کہ شام کو وہ گھر آئے گا اور اس نے انتظار کرنے کا پابند کیا تھا۔ میں نے ایک دو کام کرنے تھے مگر ناصر کا پیغام سن کر وہ کام دوسرے روز پر رکھ لیے۔ شام کو ناصر آیا اور آتے ہی پہلے کھانے کا کہا اور پھر شروع ہو گیا۔ "یار امجد دفتر اس لئے نہیں آیا وہاں تم توجہ سے بات نہیں سنتے۔ ایک کام ہاتھ آیا ہے مگر تمہاری مدد کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا"۔ اسی دوران بیگم نے کھانا گڑیا کے ہاتھ بھجوا دیا ناصر کھانے کے ساتھ ساتھ مجھ سے باتیں بھی کرتا رہا۔

"امجد اگر دس ایکڑ کا انتقال حاجی ارشد کے نام ہو جائے تو وہ اسے ٹاؤن بنا دے گا مجھے نوکری کے ساتھ ساتھ دس مرلے کا پلاٹ بھی مل جائیگا۔"

"مجھے کرنا کیا ہوگا؟" میں نے گڑیا کے ہاتھ سے چائے کے برتن پکڑتے ہوئے ناصر سے دریافت کیا۔

"بس حاجی ارشد کے نام زمین کا انتقال، اس نے باقی سارا کام کروا رکھا ہے۔ تحصیلدار سے مل کر پٹواری سے انتقال کروانا ہے۔ پٹواری میری تو بات ہی نہیں سنتا۔"

"اچھا تم صبح حاجی ارشد صاحب کو ساتھ لے آنا میں دفتر سے تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اگر کام سیدھا ہوا تو ضرور ہو جائیگا"

دوسرے روز ناصر اور حاجی ارشد صاحب دفتر آ گئے، اس کے پاس تمام کاغذات مکمل تھے میری تھوڑی سی کوشش سے انتقال اس کے نام ہو گیا۔ زمین شہر کی حدود میں تھی اس لئے بلدیہ سے نقشہ پاس کروانے تک ناصر میرے دفتر آتا رہا۔ پھر اس کا آنا جانا اچانک کم ہو گیا، میں نے بھی کوئی خاص توجہ نہ دی۔

کچھ عرصہ بعد کا ذکر ہے، میں دفتر سے چھٹی کر کے بس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اچانک اپنے قریب ایک گاڑی کے رُکنے پر چونکا، اسٹیرنگ پر ناصر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اسے کئی روز کے بعد سامنے پا کر مجھے خوشی ہوئی۔

"امجد آؤ" اس کے دروازہ کھولنے پر میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ "ناصر کہاں رہے اتنے روز؟"

"بتاتا ہوں ذرا دم تو لو" ناصر نے اشارہ کھلتے ہی گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

پھر ہم ایک اعلیٰ درجے کے ریسٹورنٹ کے کونے میں بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ "وہ ٹاؤن تو خاصا کامیاب رہا، حاجی ارشد نے پلاٹ بھی دیا اور جو پلاٹ میں اپنی محنت سے فروخت کرواتا اس کا دس فیصد کے حساب سے کمیشن بھی دیتا، کچھ میں رجسٹری کروانے کے کام سے بھی کما لیتا۔ آج کل میں خود ایک پراجیکٹ پر کام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، میرے ساتھ مرزا منور نامی ایک دوست سرمایہ کاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، ریلوے میں آڈٹ کے شعبہ میں ہیں، دعا کرو کامیاب ہو جاؤں"۔ اس نے کپ میرے آگے رکھتے بتایا۔ "اور یہ گاڑی وغیرہ" میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے پوچھا۔ "اپنی [illegible] جب ناصر نے یہ [illegible] بتایا۔ [illegible] نے واقعی اس

پر رشک آنے لگا۔ ہم دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے، پھر وہ مجھے بڑی سڑک پر اُتار کر دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

گھر آ کر میں نے ناصر کے بارے میں بتایا تو بیگم بھی کوسنے مجھے اور میرے اخبار کو۔ میں خاموشی سے لباس تبدیل کرتا رہا۔ ناصر نے واقعی وہ کر دکھلایا تھا جس کا اس نے ارادہ کر رکھا تھا۔ اس نے منور ٹاؤن کی بنیاد رکھ لی تھی گو وہ جگہ شہر سے خاصی دُور تھی مگر اس کی دُور اندیشی نہ جانے کیا تھی۔ جس جگہ اس نے منور ٹاؤن قائم کیا تھا اس کے بارے میں اشتہار دینے آیا تو بتایا کہ وہ تین ایکڑ جگہ کسی ریٹائرڈ کرنل کی تھی جس نے وہ ٹھیکہ پر دے رکھی تھی اور خود ملک سے باہر رہ رہا تھا۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد اس نے وہ تین ایکڑ زمین آسان ادائیگی کی شرط پر خریدی۔ پہلی قسط تین لاکھ کی تھی جو منور نے اور ناصر نے مل کر ادا کر دی اور باقی رقم ٹاؤن کی فروخت کے پلاٹوں کی رجسٹریاں مختار عام سے کروا کر ساتھ ساتھ دیتے رہنے کا معاہدہ کیا۔ اس نے مجھے بھی دعوت دی کہ میں بھی منور ٹاؤن میں دس مرلہ کا ایک پلاٹ قسطوں پر اس سے لے لوں مگر میں نے انکار کر دیا۔ ناصر کام میں اتنا اُلجھ گیا تھا کہ اس سے ملاقاتوں کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا، میں نے بھی اسے فراموش کر دیا۔ اس نے وہ مکان بھی فروخت کر ڈالا تھا جس میں اس کا خاندان رہ رہا تھا۔ اس نے مکان فروخت کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ گاڑی پارک کرنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ یوں اُس سے محلے داری کا ناطہ بھی ختم ہو گیا۔

دفتر آتے ہی سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ ایک خوبصورت شادی کارڈ تھا۔ کارڈ کھول کر دیکھا تو خوشی ہوئی۔ اس پر ناصر کی شادی کا پروگرام درج تھا، ایک جانب تمام گھر والوں کو ساتھ لانے کی تاکید لکھی تھی۔ گھر آ کر میں نے بیگم کو بتایا اسے بھی ناصر کی شادی کا سن کر خوشی ہوئی [illegible] فکر مند ہو گئی۔

"اب شادی میں خالی ہاتھ تو نہیں جایا جائیگا، ابھی تو تم نے پچھلے روز ایڈوانس لیا تھا، شیخ صاحب اب تو کسی قیمت پر بھی قبل از وقت تنخواہ نہیں دیں گے۔ وہ مقرر وقت پر ہی تنخواہ دے دیں تو بڑی بات ہے" بیگم نے کوٹ پکڑتے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"بات تو ٹھیک ہے مگر شادی میں شرکت بھی تو ضروری ہے" میں نے ثریا کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے کہا۔

اپنی تنگدستی کے پیش نظر میں واقعی ناصر کی شادی میں شرکت نہ کر سکا۔ یوں شادی کی تاریخ گزر گئی۔ میرے نہ جانے پر ناصر کا ردعمل جانے کیا رہا ہو گا مگر میں اس روز بہت غمگین رہا۔ پھر یہ بات بھی پرانی ہو گئی۔ شادی کارڈ پر جو پتہ درج تھا وہ میں نے اپنی ڈائری میں لکھ لیا تھا۔ آخر ایک روز میں، بیگم اور ثریا بیٹی کے ساتھ اس پتے پر پہنچ گیا جو ناصر کے شادی کارڈ پر درج تھا۔ "گھر تو بہت خوبصورت ہے" بیگم نے ناصر کے گھر پر نظریں گھماتے ہوئے کہا۔

"ہاں واقعی بہت پیارا گھر ہے" میں نے بھی تائید کی۔

دروازہ کھولنے والا ناصر کا چھوٹا بھائی تھا ہمیں دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔

"ناصر گھر پر ہے؟" میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں اپنے کمرے میں ہیں" اختر نے بتایا اور ہمیں ڈرائینگ روم میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد گھر کے دیگر لوگ بھی آ گئے۔ ناصر کے والد صاحب شادی میں شریک نہ ہونے کا گلہ کر رہے تھے میں نے معقول بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ بیگم اور ثریا ناصر کی والدہ اور بہنوں کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ چائے وغیرہ آ گئی مگر ناصر آیا اور نہ ہی اُس کی دُلہن، میں نے دبی آواز میں ناصر کا پھر پوچھا تو ممی نے بتایا کہ بھائی جان تو سوئے ہوئے ہیں اور بھابی [illegible] رہی ہے۔ میں نے بتایا تھا

آپ لوگوں کا۔ انہوں نے اُٹھانے سے منع کر دیا اور کہا کہ اُنہیں کہتا کہ پھر کسی روز آ جائیں۔

میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ بہرحال تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہم دلہن کا اور ناصر کا سوٹ پیس اور حسب توفیق کچھ روپے دے کر واپس آ گئے۔ تمام راستے بیگم گم سم رہی۔ اس بات کا میرے دل پر بہت بڑا اثر ہوا۔ ناصر نے دوسرے روز کیا کئی روز تک فون نہ کیا جس کا مطلب صاف ظاہر تھا کہ وہ ہم سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ پھر میں روزمرہ کے کاموں میں ایسا اُلجھا کہ مجھے کچھ یاد نہ رہا، نہ کبھی بیگم نے ناصر کا ذکر کیا۔

ایک روز میں ڈاک دیکھ رہا تھا کہ راولپنڈی کے نامہ نگار کی بھیجی ہوئی خبر پڑھ کر بُری طرح چونکا۔ شاید میں اس خبر کو روٹین کی خبروں میں شامل کرتا مگر خبر کی تفصیل سے پتہ چلا تھا کہ خبر ناصر کی ہی ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو تیز دھار آلے کی مدد سے قتل کر ڈالا تھا اور خود روپوش ہو گیا تھا۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ وہ راولپنڈی کب گیا اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ میرے دل کے کسی کونے میں اس کیلئے ہمدردی کی کرن پھر جاگ اٹھی ۔ سارا دن میں اس کیلئے پریشان رہا۔ دفتر سے فارغ ہو کر میں گھر جانے کی بجائے اس کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ تو کب کے گھر فروخت کر کے راولپنڈی شفٹ ہو گئے۔ میرے دل میں جو خدشہ تھا وہ یقین میں بدل گیا کہ ناصر نے واقعی قتل کر دیا ہے۔ گھر آ کر میں نے بیگم سے بات کی اس نے بھی اس بات کا کافی اثر لیا۔

کئی روز تک میں پریشان رہا، مجھے ناصر کے قاتل ہونے کا یقین نہ آتا مگر یہ ہو چکا تھا۔ مجھے ناصر کے ٹھکانے کا علم نہ تھا ورنہ ضرور رابطہ کرتا۔ ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی اور میں نے راولپنڈی نامہ نگار کی وساطت سے ناصر کے کوائف منگوائے۔ اس نے تھانے سے ناصر کے بارے میں ایف آئی آر کے مطابق معلومات حاصل کر کے مجھے بھجوا دیں۔ اس سے یہ وضاحت ہو گئی کہ واقعی یہ کوئی اور ناصر نہیں بلکہ میرا دوست ہی ہے۔ جو معلومات نامہ نگار سے مجھے حاصل ہوئی تھیں ان کی روشنی میں یہ ثابت ہو گیا کہ ناصر ہی قاتل تھا جس نے مفرور ہونے کے بعد نہ صرف گرفتاری پیش کر دی بلکہ اپنی بیوی کے قتل کا اعتراف بھی کر لیا۔ ان باتوں کو جان کر میری پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا۔ گھر آ کر میں نے بیگم سے مشورہ کیا کہ اگر وہ اجازت دے تو میں راولپنڈی جا کر ناصر سے ملاقات کر لوں؟ بیگم نے نیم رضامندی کا اظہار کیا۔

تنخواہ ملتے ہی میں دو روز کی چھٹی لے کر راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ جیل میں ناصر تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ جیلر نے جیل کی پہلی راہداری میں ملاقات کی اجازت دے دی۔

تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا پھر بڑے آہنی گیٹ کا چھوٹا سا دروازہ کھلا اور نمبردار کے ہمراہ ناصر میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر مجھ سے لپٹ گیا۔ جب مجھ سے جدا ہوا تو اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔

"آپ ادھر بنچ پر بیٹھ جائیں۔" نمبردار نے دیوار کیساتھ رکھے بنچ کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں وہاں جا بیٹھے۔ نمبردار شائد ہماری نگرانی پر مامور تھا ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"ناصر یہ سب کیسے ہو گیا" میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"اُدھر حالات ہی ایسے پیدا ہو چکے تھے اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید پھر میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا" ناصر نے سگریٹ سلگا کر جواب دیا۔

"شائد تمہیں پتہ ہو ہم سب مبارک باد دینے آئے تھے لاہور والے گھر" میں نے اسے بتایا۔

سیارہ ڈائجسٹ کی عظیم الشان پیشکش
تحفۃ النساء نمبر
شائع ہو گیا ہے!
خواتین اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری باتیں!
قرآن و حدیث کی روشنی میں عورتوں کے لئے اسلامی عقائد، ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، ذکر، تلاوت، وظائف اور دعا کے مفصل احکام!
اس کے علاوہ ازدواجی زندگی، نکاح، طلاق، خُلع، عدت، غیبت، وراثت، توبہ، اخلاق، اولاد کی تعلیم و تربیت کے مسائل اور اُن کا حل
غرضیکہ خواتین کی دینی زندگی سنوارنے کے لئے جامع اور نایاب نسخہ جو ہر مسلمان گھرانے کی ضرورت ہے۔
قیمت: 160 روپے
سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور فون 37245412

"ہاں امجد میں بہت شرمندہ ہوں اس واقعہ کیلئے دراصل میں اتنی بڑی غلطی کر بیٹھا تھا جس کا احساس مجھے شادی کے بعد ہوا۔ آپ لوگوں کے آنے کے بارے میں امی جان نے بتایا تھا۔ امجد ایک طرف مجھے اپنے گھر میں رہتے ہوئے گھر والوں سے کھل کر بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ کاش میں نے اس کم ظرف اور بدکردار عورت سے شادی ہی نہ کی ہوتی" ناصر نے دھواں اپنے اندر جذب کرتے ہوئے دکھ بھرے انداز میں کہا۔

"یہ رشتہ تمہیں کیسے ملا اور کیا تمہارے گھر والوں کی پسند تھی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں امجد، یہ میری بدقسمتی کا نتیجہ تھا۔ میرے پارٹنر حاجی ارشد کے ایک ملنے والے دوست اظہر بٹ جو بہت اچھے اور معزز شخصیت کے حامل تھے، ان کے حوالے سے ملا مگر ان دونوں کا کیا قصور ہر اچھا دوست تو دوست کیلئے بہتر ہی سوچتا ہے۔ نسیم پڑھی لکھی اور خوبصورت تھی پہلے میں اسے ملا پھر سارے گھر والے، سب نے نسیم کو پسند کرلیا۔ نسیم راولپنڈی میں ہی ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرتی تھی شادی سے قبل اس نے ملازمت ترک کرنے کا وعدہ بھی کرلیا، میں مطمئن ہوگیا۔ کاروبار سیٹ ہو چکا تھا بیوی کا ملازمت کرنا مجھے اچھا نہ لگا اس لئے میں نے شادی قبل ہی بات کرلی۔ شادی سے کچھ روز قبل اظہر بٹ اور حاجی ارشد نے مجھے دبی زبان میں کہا کہ ناصر اچھی طرح دیکھ بھال کر کے شادی کرنا کیونکہ ہم نسیم کے والدین کو صرف سلام دعا کی حد تک جانتے ہیں لیکن تمہارا زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ نسیم کا جادو میرے سر پر کسی بھوت کے سایہ کی طرح سوار تھا میں نے وہ تمام خواب پورے کئے جو ایک مجھ جیسے آدمی کے ہوتے ہیں۔ شادی کے چند روز بعد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ شادی مجھے بہار کے [illegible] دوسرے کی۔ نسیم کی بے [illegible] فضول خرچی میرے [illegible] والوں کی [illegible] بات [illegible]

"دانشمند"

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کوئی دانشمند مضمون نگاری کے لئے سمندر کا رخ کیا کرتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ کام شروع کرنے سے پہلے وہ ساحل سمندر پر چہل قدمی کیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ ساحل پر ٹہل رہا تھا تو اسے کچھ دور کنارے پر ایک انسانی ہیولا کسی رقاص کی مانند حرکت کرتا دکھائی دیا۔ وہ متجسس ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو دن کا آغاز رقص سے کرتا ہے۔ یہ جاننے کے لئے وہ تیز قدموں سے اس کی جانب چل پڑا۔ وہ نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ وہ ایک نوجوان ہے۔ نوجوان رقص نہیں کر رہا تھا۔ وہ ساحل پر جھکتا، کوئی شے اٹھاتا اور پھر پھرتی سے اسے دور سمندر میں پھینک دیتا۔ دانش مند اس نوجوان کے پاس پہنچا اور بلند آواز میں پوچھا، "صبح بخیر! یہ تم کیا کر رہے ہو؟" نوجوان نے قدرے توقف کیا نظریں اٹھا کر دانش مند کی جانب دیکھا اور بولا "ستارہ مچھلی کو سمندر میں پھینک رہا ہوں"

میں سمجھا نہیں۔ تم ستارہ مچھلی کو سمندر میں کیوں پھینک رہے ہو؟ سورج چڑھ رہا ہے اور لہریں پیچھے ہٹ رہی ہیں۔ میں نے انہیں پانی میں نہیں پھینکا تو یہ مر جائیں گی۔

لیکن نوجوان! یہ ساحل تو میلوں تک پھیلا ہوا ہے اور سارے ساحل پر ستارہ مچھلیاں بکھری ہوئی ہیں ممکن نہیں کہ تمہاری اس کوشش سے کوئی فرق پڑے "نوجوان نے شائستگی سے دانش مند کی بات سنی، نیچے جھک کر ایک اور ستارہ مچھلی اٹھائی اور اسے پیچھے ہٹتی ہوئی لہروں کے اندر پوری قوت سے اچھالتے [illegible] لیکن اس کے [illegible]"

میرے یا میرے گھر والوں کے ملنے جلنے والوں سے ایسا رویہ کہ وہ کبھی دوبارہ ہمارے گھر کا رُخ نہ کریں، یہ سب باتیں ناقابل برداشت تھیں۔ جب اس کا کوئی اپنا آتا تو وہ سر سے پاؤں تک اس پر نچھاور ہونے کی کوشش کرتی۔ میں اس حال میں بہت پریشان رہنے لگا۔ جس بات نے مجھے یہ انتہائی اقدام اُٹھانے پر مجبور کیا وہ نسیم کے باس سکندر سے نجوی ہے، جو کسی نہ کسی بہانے راولپنڈی سے لاہور آنے جانے کے چکر میں رہتا۔ جب بھی لاہور آتا نسیم سے ضرور ملتا۔ جس روز سکندر آتا نسیم کسی کو اپنے کمرے کے آگے سے گزرنے تک نہ دیتی اگر میں کوئی اعتراض کرتا تو بدتمیزی پر اتر آتی۔ میں نے اکثر اسے نوکری چھوڑنے کا کہا مگر وہ مجھے بُری طرح جھڑک دیتی۔ اس کے رویہ سے میں اتنا دل برداشتہ رہنے لگا کہ میرا کام کی طرف سے دھیان یکسر طور پر ہٹ گیا۔ میرے ساتھ کام کرنے والے سارے دوست ایک ایک کر کے مجھے چھوڑ گئے۔ کچھ پیسہ میں نے مکان پر لگا دیا تھا اور کچھ شادی پر خرچ ہو گیا کام ٹھپ ہو گیا تو مجبوراً مجھے ایک دوست کی اسٹیٹ ایجنسی میں نوکری کرنا پڑی۔ اُدھر نسیم نے میرا دماغ خراب کر رکھا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ میں لاہور سے راولپنڈی شفٹ ہو جاؤں۔ پہلے پہل تو میں اسے ٹالتا رہا پھر آخر میں نے بھی فیصلہ کر لیا۔ والد صاحب سے بات کی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ بیٹا تمہیں سکھی دیکھنے کی تمنا ہے اگر بہو کی اسی میں رضا مندی ہے تو اس مکان کو فروخت کر کے راولپنڈی چلے چلتے ہیں یہاں اور وہاں میں کیا فرق ہے۔ انجدا میں نے لاہور والا مکان بھی فروخت کر دیا اور راولپنڈی آ کر ایک چھوٹا سا مکان خریدا اور یہاں اپنی ایک اسٹیٹ ایجنسی قائم کر لی یہاں میرے ساتھ جو پارٹنر بنا وہ بہت مدبر اور پنڈی کا معروف شخص تھا، حسین نام ہے اس کا۔ اب وہی [illegible] کیس کی پیروی کر رہا ہے۔ ہمارا کام چل [illegible] گھر آتا جا[illegible]

گیا۔ اس نے نسیم کو دیکھا اور بُری طرح چونکا۔ میں اس کی حالت دیکھ کر سمجھ گیا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ دو تین روز تک تو اس نے کوئی بات نہ کی۔ ہم دونوں اس کی گاڑی میں اسلام آباد سے واپس آ رہے تھے کہ اس نے بات چھیڑ دی۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

"ناصر تمہاری بیوی کا نام نسیم ہے نا اور یہ سکندر اینڈ کمپنی میں کام کرتی ہے۔"

"ہاں مگر آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟" میں نے اندرونی پریشانی کو دباتے ہوئے جواب دیا۔

"ناصر زیادہ باتیں میں کرنا پسند نہیں کرتا بس اتنا ہی کہوں گا کہ تم اس کو نوکری سے الگ کرنے کی کوشش کرو ہو سکتا ہے تمہاری بیوی کو یہ بات پسند نہ آئے مگر بہتری اسی میں ہے۔" یہ کہہ کر حسین نے بات ختم کر دی اور مجھے اندرونی اذیت میں مبتلا کر دیا۔

شام کو گھر آ کر میں نے نسیم کو نوکری چھوڑنے کی وارننگ دی جو اس نے حسب توقع ہوا میں اڑا دی۔ میں آپے سے باہر ہو گیا اور اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ انجد اسی روز سے ہمارے درمیان عداوت کی دیوار کھڑی ہو گئی۔ نسیم نے مجھ سے ایک گھر میں رہتے ہوئے علیحدگی اختیار کر لی۔ سارے گھر والے انتہائی پریشان تھے۔ امی سارا دن بستر پر پڑی آنسو بہاتی رہتیں۔ تمام چھوٹے بہن بھائی گھر میں سہمے ہوئے پھرتے۔ اس سنگدل عورت نے میرے گھر کو جہنم بنا کر رکھ دیا تھا۔ میں بے بسی سے رات بھر اوندھے منہ پڑا اپنی قسمت کو کوستا، ذرا سی بات ہوتی تو وہ مجھ سے طلاق طلب کرتی۔ اس کے گھر والے اس کا پوری طرح ساتھ دیتے تھے۔ اس لئے ان سے بات کرنا بے سود تھا۔

سکندر یہاں بھی آزادی کے ساتھ آتا، وہ وقت تو جیسے اس کے مقرر تھے۔ لینے بھی آتا اور چھوڑنے بھی۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھتی اور اترتی تو دیکھنے والے لوگ ہماری طرف [illegible] نظروں سے دیکھتے [illegible] مجھے یوں لگتا جیسے سارے محلے کی

نظریں میرا تعاقب کر رہی ہوں۔ میں اپنی بیوی کو راہ راست پر نہ لا سکا مجھے مکمل طور پر اپنی بیوی کے کردار کے بارے میں یقین ہو چکا تھا کہ وہ سکندر کے ساتھ مل کر گناہ کی زندگی گزار رہی ہے۔ مجھ سے شادی صرف ایک دکھاوا تھی۔ کئی بار اس نے مجھے دعوت دی تھی کہ سکندر چاہتا ہے کہ تم اس سے مل کر اسٹیٹ ایجنسی قائم کرلو مگر میں اس کی چال کو خوب سمجھتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرنا چاہتی ہے۔ وہ ایسا اس لیے چاہتی تھی کہ سکندر کو ملنے جلنے میں اسے کوئی دقت نہ رہے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا مگر تسیم اپنی ڈگر سے ایک انچ نہ ہٹی۔ اب اس نے زیادہ تر اپنے ماں باپ کے گھر رہنا شروع کر دیا تھا جہاں سکندر کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ رات گئے تک وہ تسیم کے ساتھ رہتا، میں گھر میں اکیلا پڑا اس کے دیئے گھاؤ پر آنسوؤں کی مرہم لگاتا رہتا۔

سکندر میری بیوی کے ساتھ رہ رہا تھا اور میں بے بس تھا۔ میرے والد اور والدہ تسیم کے گھر گئے تاکہ اسے سمجھا سکیں تو اس نے ان بزرگ ہستیوں کا بھی کوئی خیال نہ کیا اور بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ امی جان تو روتی ہوئی اندر چلی گئیں مگر والد صاحب اپنے اوپر ضبط نہ کر سکے اور بے اختیار میرے سامنے رو پڑے۔ کہنے لگے "بیٹا اس کو بھولنے کی کوشش کرو وہ ہمارے لائق نہیں رہی۔ اب تو اس سے کنارہ کرنا ہی بہتر ہے ہمیں تو اس سے اتنی امید نہیں تھی مگر بہو نے ہماری بزرگی کا لحاظ بھی نہیں کیا اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ تم سے طلاق حاصل کر کے رہے گی اور وہ جو دو لاکھ روپے کی شرط ہے وہ بھی تم سے عدالت میں مقدمہ کر کے وصول کرے گی۔" یہ بتا کر والد صاحب خاموش ہو گئے۔

امجد میرے اندر طوفان اُٹھ رہا تھا میں نے ایک فیصلہ کیا اور جیسے میرے اندر ایک ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ شام کو میں اُٹھا اور تیار ہو کر [illegible] ایک سٹور پر رُک کر میں نے گوشت کاٹنے والا چھرا خریدا اور اسے اپنے لباس میں چھپا لیا۔ وقت گزارنے کے بہانے سینما میں آ گیا کوئی انگریزی فلم تھی پتہ نہیں سٹوری کیا تھی بس سکرین پر مجھے تسیم اور سکندر ہی نظر آ رہے تھے۔ شو ختم ہوا تو میں ٹیکسی میں بیٹھ کر تسیم کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا قیاس درست ثابت ہوا سکندر کی گاڑی مکان کے آگے کھڑی تھی، میں نے ٹیکسی کچھ فاصلے پر چھوڑ دی اور پیدل ہی مکان تک آیا۔ باہر والے کمرے کے سامنے رُک کر میں اندر کی آوازوں کا جائزہ لینے لگا اندر سکندر اور تسیم کی دبی دبی ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ میرے اندر نفرت کی آندھی کروٹ لے کر بیدار ہو گئی میں نے جوش میں دروازے کو دھکا دیا تو وہ اندر کی طرف جا پڑا۔ مسہری پر سکندر لیٹا ہوا تھا اور تسیم اس کے پہلو میں بیٹھی خشک میوے کے دانے چن چن کر اس کے منہ میں ڈال رہی تھی۔ سکندر تو اُٹھ کر بوکھلاہٹ میں اندر کی طرف بھاگا اور تسیم پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ چھرا میرے ہاتھ میں تھا اور میں غصہ سے بے قابو ہو کر اس پر پل پڑا۔ پہلے ہی وار سے اس کی گردن تن سے جدا ہو گئی۔ جب تک میرا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا میں اس پر وار کرتا رہا۔ اس کے گھر میں کہرام مچ گیا، میں چھرا فضا میں لہراتا ہوا وہاں سے فرار ہو گیا۔ کئی روز تک بری امام کے آس پاس چھپا رہا پھر میں نے اپنی گرفتاری رضا کارانہ طور پر پیش کر دی۔"

وہ خاموش ہو گیا، میں اس کی سنائی ہوئی باتوں میں ایسا گم ہوا کہ وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا، میں اس سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے واپس آ گیا۔ اس کی بربادی کا مجھے انتہائی صدمہ تھا کئی سال تک ناصر کا کیس چلا اس کو پانچ سال کی سزا ہو گئی میرے اور ناصر کے درمیان ایک بار پھر سالوں کا خلا حائل ہو گیا۔

عشقِ بامراد

ڈاکٹر درخشاں انجم

"بابا میں ہوں ایک بھٹکا ہوا مسافر، ایک بھکاری" اُس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "چلا جا..... یہاں کچھ بھی نہیں ہے ہم سب بھکاری اور اُس کے محتاج ہیں، کس نے بھیجا ہے تجھے یہاں، چلا جا یہاں کچھ بھی نہیں ملے گا"۔ اس کی آواز پر کچھ اور مریدین نکل آئے۔ اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے جانے لگے۔

پیار کے متلاشی دو دیوانوں کا فسانہ، جنہیں عشق کی اصل "راہ" مل گئی تھی

سرسبز پہاڑی ڈھلانوں پر اب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے، سناٹا ہر چیز پر غالب آرہا تھا نیچے آبشاروں سے [illegible] نالے کی صورت میں لہراتا ہوا [illegible] شام کے [illegible] چاندی کی طرح چمکتا ہوا نظر آرہا تھا، موسم گرما کا آغاز ہو چکا تھا مگر یہاں تو ابھی خنکی سی محسوس ہو رہی تھی [illegible] شروع ہو گئے تھے [illegible] جگہ نیلے پیلے [illegible] سرخ پھولوں کی بہتات تھی [illegible] پرندوں کی

آخری ڈار بھی اب بڑی تیزی سے اپنے اپنے رہائن بسیروں کی طرف اُڑی جارہی تھی، مگر ابھی تک اس کے سفر کا اختتام نہیں ہوا تھا۔ ٹیڑھے میڑھے اونچے نیچے راستوں میں اُگے خودرو جنگلی پودوں سے ہوتے ہوئے وہ تھک کر چور چور ہو چکا تھا، عام حالت میں تو ایسے ویران پُر پیچ اور پُر اسرار راستوں کا تصور ہی لرزا دینے والا ہوتا ہے اور وہ بھی تنہا......لیکن ......یہ...... یہ تو عشق کا سفر تھا۔ جذبۂ عشق نے ہی تو اسے یہاں تک آنے پر اکسایا تھا۔ عشق جس کی سرشت میں ناں نہیں ہوتی۔ جو کبھی مجنوں بن کر صحراؤں کی خاک چھانتا ہے۔ کبھی فرہاد کی صورت میں پہاڑوں سے دُودھ کی نہریں نکالتا ہے۔ اسی کی وجہ سے ہیر کو دریا پار کرتے ہوئے خوف آتا ہے اور نہ ہی انارکلی کو دیواروں میں چُن دیے جانے کا خیال پریشان کرتا ہے۔ بقول شاعر عشق کے کوچے میں فرعون گدا' یہ وہ دنیا ہے جہاں عقل کی نہیں دل کی بات مانی جاتی ہے اور دل ہی کی بات مانتے ہوئے تو وہ یہاں تک پہنچا تھا۔

اسے بھی اپنے پنڈ کے قصائی کی بیٹی شموں سے عشق ہو گیا تھا۔ جب تک وہ اسے دیکھ نہ لیتا اس کی صبح نہیں ہوتی تھی۔ رات گئے تک وہ اس کے گھر کے آس پاس چوکھٹ کے قریب صرف ایک نظر اسے دیکھنے کے لیے کرلایا پھرتا۔ شموں کے دل تک بھی یہ آگ پہنچ چکی تھی جبھی تو چھپ چھپ کر ملنے کے راستے نکالے جاتے مگر بھلا کبھی عشق اور مشک چھپائے چھپتے ہیں۔ اسے تو ایک دوبار ماں نے برگد کے گھنے درخت کے نیچے سرگوشیاں کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ پہلے تو شموں کو رنگ برنگے پراندے والی چٹیا سے کھینچتے ہوئے کرموں قصائی کے سامنے لا پٹخا تھا۔ ”لے سنبھال اپنی کڑی، شرم نہیں آتی، سیدھے سادے بندے کو پھانستے ہوئے۔ اب بھی منیرے کے ساتھ نظر آئی تو وہ گھتی [illegible] تیرا آخری دن ہوگا۔“ آخری جملہ ان کا ایسا رعب [illegible] کیوانہ انداز میں تھا کہ [illegible]

قصائی بھی کانپ گیا۔ حالانکہ وہ خود کوئی جدی پشتی جاگیردارنی نہیں تھیں۔ شموں اگر قصائی کی بیٹی تھی تو وہ بھی بھی مزارے کی بیٹی بلکہ بیوی بھی تھیں۔

اس کے باپ کی موت کے بعد اُس کی ماں صغراں بی بی نے اپنی حیثیت بنانے کے لیے ملک دین محمد جاگیردار سے شادی کی تھی جو پہلے ہی دو بیویاں ”بھگتا“ چکا تھا، اب یہ اس کی تیسری بیوی تھی۔ چھ بچے پہلے ہی موجود تھے، تیسری شادی کرنے سے پہلے دونوں بیویوں کے بچوں نے سوائے ایک حویلی کے باپ سے سارا کچھ اپنے نام کروالیا تھا۔ صرف یہ ایک حویلی صغراں بی بی کے قبضے میں آئی تھی۔ چلو کم از کم ملکانی جی تو کہلائی۔ اب وہی مزارے کی بیٹی کتنے رعب سے شموں پر حکم نامے جاری کر رہی تھی۔ دو نوکروں نے اسے بھی ایسے پکڑ رکھا تھا کہ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی اس نے شموں کی وکالت کرنا چاہی تو اماں کی ایک ہی دھمکی نے اسے خاموش کر ڈالا ”چل میں ملک کے سامنے تیرا کچا چٹھا کھولتی ہوں“۔ جب بھی ان بھائی بہنوں کی کسی بات پر ان کا غصہ بڑھ جاتا تو وہ یہی دھمکی دیتیں۔ اس کا سوتیلا باپ دین محمد انہیں ایسی سزائیں دیتا کہ وہ تینوں بھائی بہن لرز اُٹھتے جبھی ان کے دل میں اپنی ماں کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا، سوائے شرعی احترام کے۔ مگر آج اُسے اپنی سزا سے زیادہ شموں کے اس گاؤں سے دُور چلے جانے کا تصور لرزانے لگا۔ پھر اس دن کے بعد سے دونوں نے ایک دوسرے سے دُور ہو جانے کے خوف سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر یہ نہیں کہ ایک دوسرے کو بھول گئے تھے بلکہ عشق کا بھانبڑ تو اب پہلے سے زیادہ بھڑکنے لگا تھا۔ دن یونہی بے مقصد سے گزرتے گئے۔ وہ یونہی آوارہ بادلوں کی طرح اِدھر اُدھر ڈولتا رہا۔ دسویں تو پہلے ہی گاؤں کے سکول سے [illegible] کر چکا تھا اب ملک [illegible] نے شہر [illegible] ادیا تاکہ مزید [illegible] کے لیے [illegible] صغراں بی بی کو ملک سے

شادی کرنے کا کوئی فائدہ تو حاصل ہونا چاہیے تھا۔ انہیں کی وجہ سے تو وہ تینوں بھائی بہن واجبی سی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ورنہ گاؤں کے باقی بچوں کی طرح جاہل ہی رہ جاتے۔

دو برس کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس کی محبت چھین کر کسی اور کے حوالے کی جا چکی تھی۔ یہ خبر اس کے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔ غصہ تو اسے شموں پر آرہا تھا جس نے سنگ جینے سنگ مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ مگر اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ دل کی دُنیا اُجڑ چکی تھی۔ اماں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آتے ہی اس کی شادی بھی کروا دی، وہ کس کے بھروسے پر انکار کرتا وہ تو کسی اور کی ڈولی چڑھ گئی تھی۔

گزرتے وقت نے اسے چار بچوں کا باپ بنا دیا۔ سنا تھا وہ بھی تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اس دوران جاگیردار ملک دین بھی گزر گیا۔ اماں شوگر کی مریضہ ہو کر بستر سے لگ گئیں۔ اس کی بیوی ثمرین جو اللہ میاں کی گائے تھی سارا دن اماں کی خدمت اور بچوں کی دیکھ بھال یا گھرداری میں مصروف رہتی۔ وہ تو اس کی طرف سے بھی لاپروا ہونے لگی تھی۔ جب راکھ میں دبی ہوئی چنگاری پھر سُلگنے لگی۔ اگر وہ ذرا بھی اس پر توجہ دیتی، اس کا خیال رکھتی تو یہ چنگاری کسی نہ کسی دن بجھ ہی جاتی۔ حالات کا کوئی منہ زور جھونکا اسے سرد کر دیتا مگر وہ بھی نہ جانے کن خیالوں میں گم رہتی۔ کبھی وہ اس کا احتساب کرنے بیٹھتا تو خود اپنا ہی قصور نکل آتا۔ اس نے کب اسے چاہا تھا؟ کب توجہ دی تھی وہ سارا سارا دن اپنے کاموں میں مصروف رہتا یا پھر ان ساری جگہوں پر سیر گشت کرتا رہتا، جہاں وہ اور شموں ملتے تھے، باتیں کرتے تھے، آئندہ کے پروگرام بناتے تھے۔ کبھی دھریک کے درختوں کے جھنڈ میں کبھی نہر کے کنارے کبھی پنگھٹ کے قریب کبھی کھلے آسمان کے نیچے ستاروں کی روشنی میں۔ کتنا اچھا لگتا تھا گزرے موسموں کو یاد کرنا۔

عشق کی [illegible] اس وقت [illegible]

کا روپ دھار لیا جب ثمرین کچھ عرصہ کینسر میں مبتلا رہ کر دنیا سے گزر گئی۔ کبھی کبھی خود اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس کا غم منا رہا ہے۔ ثمرین کی موت کا یا شموں کی جدائی کا۔ اس کے اس لاابالی پن کو دیکھتے ہوئے۔ اماں نے رشتہ داروں سے کہہ کہلا کر اس کی دونوں بیٹیوں کی شادیاں کروا دیں۔ پوتے ابھی اس عمر کو نہیں پہنچے تھے۔ داماد سے کہہ کہلا کر انہیں اپنے سوتیلے بیٹے کے پاس لندن بھجوا دیا اور خود ان تمام کاموں سے فراغت پا کر ابدی نیند سو گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے رات کا اندھیرا ہر چیز پر غالب آگیا اب اس کی منزل بہت قریب تھی۔ پرندوں کی آوازیں آنی بھی بند ہوگئی تھیں صرف سناٹوں کی آوازتھی اور اندھیرے کا راج۔ اس نے اندھیرے میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ کاغذ نکالی جس پر نقشے بنا کر خانقاہ تک پہنچنے کا راستہ بتایا گیا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے ٹارچ بھی نکالنی پڑی۔ وہ صحیح سمت جا رہا تھا۔ ساری صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا دل انجانی خوشیوں سے بھرا تھا۔ "اب میں شموں کو پالوں گا، میری کھوئی ہوئی منزل مجھے مل جائے گی۔" کتنا جان فزا احساس تھا یہ کوئی اس وقت اس سے پوچھتا۔ "وہ جب مجھے مل جائے گی تو میں اسے پوچھوں گا کہ تیری محبت سچی تھی...... یا میری......" وہ اپنے آپ سے مسکرا کر کہتا ہوا سرچ لائٹ کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔

اماں کی موت کے بعد وہ بالکل ہی مادر پدر آزاد تھا۔ گاؤں میں ہوئی ایک شادی میں شموں کا میاں کسی کی انجان گولی کا شکار ہو گیا تو کتنا خوش ہوا تھا وہ۔

وہ سوچتا کیسے میرے نصیب کھلے تھے، واہ مولا...... شاید یہ سب بابے کے تعویذوں کا اثر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب تو شموں اس کی ہی تھی۔ وہ فضل دین کے جنازے میں بھی شریک [illegible] کے بعد [illegible] آگئی [illegible] اسے دیکھ [illegible] نہیں رہی

تھی۔ اسے دیکھنے کے بہانے وہ فضل دین کے سوئم چالیسویں سب میں شریک ہوتا رہا اور پھر دنیا کی نظروں نے سب کچھ تول لیا۔ اس سے پہلے کہ ان کی دیوانگی کوئی اور گل کھلاتی اس کے خاندان والے جس میں شموں کا بھائی بھی شامل تھا اور اس کا بارہ سالہ بیٹا بھی، سارے آڑے آگئے۔ بیٹی ابھی ذرا چھوٹی تھی۔ گاؤں کے ملک کے بیٹے کی وجہ سے اسے شموں سے نہ ملنے کی خاموش وارننگ دے دی گئی اور شموں کو تو گھر میں بند ہی کردیا گیا۔ وہ ایک طرف اور ساری خدائی ایک طرف ہوگئی۔

شموں سے ملنے کے لیے آنے والی ساری عورتوں پر گہری نظر رکھی جانے لگی۔ ہر طرف سے مایوس ہوکر منیر احمد نے عامل اور نجومیوں کے در کے چکر کاٹنے شروع کردیے۔ روپے پیسے کی کمی تو تھی نہیں، اماں نے اتنی بڑی جائیداد جو چھوڑی تھی ان بھائی بہنوں کے نام۔ ایک دن کسی نے اسے آزاد کشمیر کی پہاڑیوں پر چلہ کاٹنے والے کسی بزرگ کا پتہ دیا اور ساتھ ساتھ یہ بھی باور کرادیا کہ وہاں تک کا سفر بہت دشوار گزار ہے۔ وہاں تک شاید ہی کوئی پہنچ پاتا ہے۔ بس سے اتر کر بھی بہت دور پیدل چل کر پہاڑی کی چوٹی پر پہنچنا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر شموں کی خاطر وہ یہ بھی کرنے کو تیار ہوگیا۔ بس نے تو اسے دن کے بارہ بجے ہی اپنے مقام پر پہنچادیا تھا۔ اب باقی کا کام اس کا تھا۔

"لو اب یہ بھی مسئلہ حل ہو ہی گیا۔" خانقاہ کے دروازہ پر پہنچ کر تھکن سے چور وہ جمائی لیتا ہوا بڑبڑایا۔ اندر سے "اللہ ہو" کی آوازیں آرہی تھیں شاید مریدین وغیرہ مل کر ذکر الٰہی میں مصروف تھے۔ اس نے ہلکے سے بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا پھر ڈھیر ساری بلیاں اس کے اردگرد جمع ہوگئیں۔ وہ پتھر اٹھا کر ان کی طرف پھینکنا ہی چاہتا تھا کہ بشیرے کی بات یاد آگئی کہ وہاں کی کسی مخلوق کو چھیڑنا نہیں وہ سب دوسری مخلوق ہوتے ہیں وہ بھسم کردیں۔ خانقاہ کے دروازے پر بیٹھ گیا۔ اندر سے مسلسل "اللہ ہو" کی صدائیں آرہی تھیں۔ وہ بھی اس

کبھی ایک وقت کی نماز بھی ادا نہیں کی تھی وہ بھی باہر اکیلے ہی اس ذکر پاک کا حصہ بن گیا...... کتنا سکون مل رہا تھا اسے۔ آنکھیں بند کیے ایک عالم استغراق میں کھو کر جیسے اسے قرار آرہا تھا۔ تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چونکا۔ "کون ہے" ایک بڑی گونجدار سی آواز سنائی دی باہر آنے والا کوئی اور تھا اور یہ آواز کسی اور کی تھی، وہ خاموش ہی رہا۔ "کون ہے؟...... چلا جا...... چلا جا"

"بابا میں ہوں ایک بھٹکا ہوا مسافر، ایک بھکاری" اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "چلا جا...... یہاں کچھ بھی نہیں ہے ہم سب بھکاری اور اُس کے محتاج ہیں، کس نے بھیجا ہے تجھے یہاں، چلا جا یہاں کچھ بھی نہیں ملے گا"۔ اس کی آواز پر کچھ اور مریدین نکل آئے۔ اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے جانے لگے۔ پتہ نہیں اس وقت اس میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی، وہ تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اندر کی طرف بڑھا۔ "دیکھو بھائی...... بابا کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے لہٰذا ضد نہ کرو وہ جو کہہ رہے ہیں وہی کرو...... نہیں تو" مرید کی بات پر اس نے خوف سے اندر جانے کا ارادہ ترک کردیا کہ کہیں بابا جی جلال میں آکر اس کے کیے کرائے پر پانی نہ پھیردیں۔ وہ جانے کتنی مشکلوں سے یہاں تک پہنچا تھا۔

گیا تو وہ صرف محض چند گھنٹوں کی خاطر تھا مگر اب تقریباً مہینہ ہونے کو آیا تھا اتنے دنوں میں بابے نے ایک روز بھی اسے ملاقات کا شرف نہیں بخشا تھا بس اپنے حجرے میں بند اللہ ہو، اللہ ہو کے ورد میں مصروف رہتا۔ مریدین بھی عجیب پراسرار قسم کے تھے۔ خاموش خاموش سے بس صرف کام کی باتیں کرتے۔ شام کو نماز کے بعد سے وہ سب بزرگ کے ساتھ مصروف اذکار ہوجاتے۔ پتہ نہیں کھانے پینے کا سامان کہاں سے آجاتا تھا۔ بڑی پابندی سے دو وقت کا کھانا اسے بھی مل جاتا اور وہ بھی شام کو خانقاہ کے دروازے پر ذکر میں ان کے ساتھ ہوتا اور پھر کتنا وقت گزر جاتا اسے پتہ نہ چلتا...... کب...... [illegible] بن بلا [illegible] مہمان بنے رہنا

اسے اچھا بھی تو نہیں لگتا تھا۔ گھر بھی جانا تھا سو آخری بار اس نے مریدین کی کافی خوشامدیں کیں۔ انہوں نے مجبوراً اندر جانے کی اجازت تو دے دی مگر دروازے پر پہنچتے ہی پھر اسی آواز نے اس کی ہمت پست کر ڈالی "چلا جا...... چلا جا...... میں خود سوالی ہوں مدت ہو گئی ہے مجھے اس سے مانگتے ہوئے۔" اس دفعہ لہجے میں کچھ نرمی تھی "اب تو مجھے یاد بھی نہیں میں کیا مانگ رہا تھا...... مجھے کیا مانگنا ہے" اس کے سامنے ایک بڑے بڑے بے ترتیب بالوں بے ہنگم سی داڑھی والا ملنگ نما انسان سرخ سرخ آنکھیں لیے اسے گھور رہا تھا۔ چند لمحے اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے رہنے کے بعد وہ پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ نہ جانے اس کی نظروں میں کیا تھا کہ وہ لرز کر رہ گیا اور پھر کچھ پوچھنے کی جسارت نہ کر سکا اور واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

اگلی صبح وہ تھکا تھکا نڈھال سا گھر پہنچا۔ کئی دن تک بخار میں پھنکتا رہا، کھانے کا ہوش نہ پینے کا، اس کا دوست بشیرا پوچھ پوچھ کر تھک گیا۔ اس نے سمجھا کہ سفر کی تھکان نے اس کا یہ حال بنا دیا ہے مگر سفر سے زیادہ روح کی تھکن نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اپنی روح اور ضمیر پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا تھا...... آخر کیوں؟ وہ خود اپنی اس حالت پر حیران تھا۔ "بابے نے کیا کہا...... تیرا کام ہو جائے گا، مل جائے گی وہ تجھے؟" آخر کو اس نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا، اس کا ذکر تو اس کے لیے ہمیشہ ایک مژدہ جانفزا کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر آج نہ وہ چونکا نہ بڑبڑایا، بڑے سکون سے آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ "پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے اسے۔" بشیرے کو اب اس کی واقعی فکر ہونے لگی تھی۔ "شاید بابے نے اسے کوئی اچھی خبر نہیں سنائی" وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

پھر لوگوں نے دیکھا وہی آوارہ، بدتمیز منیرا اب پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کرنے اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ذکر الٰہی میں بسر کرنے لگا۔ "او یہ سب کچھ اس شمو کو ...... نے ...... کر رہا ہے ...... اکیلا

نمبر کا فراڈیا ہے۔ اب کی بار صرف فراڈ کا انداز بدلا ہوا ہے"۔ کہنے والے اپنی اپنی کہتے رہے۔ مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی وہ اپنی دھن میں مست رہتا۔ رات گئے تک جانے کیا کیا پڑھتا رہتا۔ اسے وہ رات اور خانقاہ کی ساری باتیں سوچ کر بڑا سکون ملتا تھا۔ خاص کر "اللہ ہو" کا ذکر تو اس کی رگ رگ میں سما گیا تھا۔ اکثر ایک خیال اس کے دل و دماغ پر غالب رہتا، "چلا جا...... چلا جا...... اس سے مانگ میں تو خود اس کا محتاج ہوں یہاں کیا لینے آیا ہے، اللہ ہو...... اللہ ہو...... اللہ ہو" اور پھر اس کے تڑپتے دل کو ایک قرار سا آتا گیا۔ شموں کی یاد ایک ہیولے کی طرح کہیں پیچھے رہ گئی۔ یہی سکون تو وہ چاہتا تھا جو اسے شموں کو اپنے سامنے دیکھ کر بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا اس کی تلاش مکمل ہو گئی ہو۔ اب اسے لگ رہا تھا وہ شموں کو نہیں بلکہ اپنے رب کو ڈھونڈ رہا تھا۔ کتنی کوتاہیاں ہو گئی تھیں اس سے...... کاش! اس نے کبھی سچے دل سے اسے پکارا ہوتا۔ آدھی آدھی رات کو اٹھ کر وہ ہچکیاں لے لے کر روتا اسے یاد کرتا۔ کتنی کتنی دیر تک سجدے میں پڑا رہتا۔ اب تو ہیولا بھی تحلیل ہو چکا تھا۔ کوئی اس کے سامنے اس کا نام لیتا تو وہ بڑی لاتعلقی سے کہتا "شموں...... کون شموں؟" اس کا تن من ایک ان دیکھی روشنی میں نہانے لگا تھا۔ اس روشنی میں ساری دنیا ماند پڑ جاتی پھر چہروں کی پہچان کیا ہوتی۔

....

کتنے موسم یونہی بیقرار سے گزر گئے۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلا گیا تھا وہ تو سارا وقت اسی کو یاد کرتی رہتی تھی۔ اپنے طور پر اس کا بہت سراغ لگایا مگر پتہ نہیں وہ کہاں گم ہو گیا تھا۔ جب سے منیرا غائب ہوا تھا اس کی پابندیاں بھی ختم ہو گئی تھیں۔ بچے بھی اب شادی کی عمروں کو پہنچ رہے تھے۔ مگر دل سے منیرے کی محبت کا جنون ختم نہیں ہوا تھا۔ گاؤں والوں کی ...... کی ...... اس ...... کان ہمیشہ

اس کے بارے میں اس کی خیر خیریت کے منتظر رہتے۔ مگر یہ بات اب شاید بہت پرانی ہو گئی تھی۔ اب نئی نسلوں کے نئے قصے تھے، نئے بکھیڑے تھے، کون کس کو یاد رکھتا، کبھی کبھی ملک دین محمد کے سوتیلے بیٹے کے حوالے سے اس کی بات چھڑ جاتی تو آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگتیں پھر وہ لوگوں سے چھپ چھپا کر کسی کونے میں دل کا غبار نکال لیتی یا ساری گھڑیاں بیقرار بیقراری ٹہلتے گزار دیتی۔ بچے اپنی ماں کے بارے میں سب جانتے تھے۔ وہ جب آنکھوں میں کچھ پڑنے کا بہانہ بنا کر اسے یاد کر کے رو رہی ہوتی انہیں سخت غصہ آتا تھا۔ مگر ماں تھی کچھ کہہ نہیں سکتے تھے اب تو وہ رہا بھی نہیں تھا جسے یاد کر کے وہ روتی تھی۔

اس دن وہ جانو کمہار کی بیٹی کی شادی پر گئی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی بڑے پریشان تھے۔ چھوٹی بیٹی کی شادی تھی بڑی سے پہلے چھوٹی کی شادی پر چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں لوگ وجہ جاننے کی کوشش میں تھے۔ جب انہیں سچ بولنا پڑا کہ بڑی پر جن کا سایہ ہے۔ وہ شادی کے نام پر توڑ پھوڑ شروع کر دیتی ہے۔ ”اے! ہے تم اسے اگلی بستی کے پیچھے والے بزرگ کے پاس کیوں نہیں لے جاتی، بڑا اللہ والا ہے۔ جو بھی اس کے پاس گیا نامراد نہیں لوٹا“ خالہ زیتون نے بڑے پتے کی بات بتائی اور جانے کا راستہ بھی بتا دیا۔

پتہ نہیں جانو کمہار اپنی بیٹی کو وہاں لے گیا کہ نہیں مگر شموں اگلے دن ہمسائی کو لیکر مزار پر جانے کے بہانے پہنچ گئی۔ دوسری بستی کے آخری سرے پر وہ ایک بہت بڑے درخت کے نیچے آنکھیں بند کیے ”اللہ ہو“ کی صدائیں لگا رہا تھا۔ شام کے دھندلکے میں شکل واضح نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دونوں قریب آ گئیں اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ نہ کوئی مرید نہ خانقاہ بس ایک [illegible] اس سے بے نیاز

اپنی میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اسے کسی کے آنے جانے کی خبر نہیں تھی۔ وہ اور قریب آ گئیں۔ ”کون ہے؟“ شاید اب اسے کچھ محسوس ہوا تھا۔ ”بابا!“ ہمسائی نے آہستہ سے کہا ”کون ہے..... چلی جا..... چلی جا!..... یہاں کچھ بھی نہیں ہے اس سے مانگ وہی مالک ہے وہی داتا ہے“ اس آواز کو تو وہ لاکھوں میں پہچانتی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا اس کا گریبان پکڑ کر پوچھے جب مجھے چھوڑ کر اس راہ پر لگنا ہی تھا تو میرے دل میں عشق کی جوت جلائی کیوں تھی۔ کیوں سارے زمانے میں، اپنے خاندان اپنی آل اولاد کے سامنے رسوا کیا تھا مجھے کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔ ایک زمانے نے مجھ پر لعنت بھیجی تھوکا مگر..... مگر..... دل نے خود وکالت کی۔ وہ اکیلا اس کھیل میں شامل نہیں تھا شریک خطا تو بھی تھی۔ ایک بار قصہ ختم ہو گیا تھا..... بس ختم ہی کر دینا تھا۔ تجھے تو اپنے آپ کو اپنے بچوں کے لیے وقف کر دینا چاہیے تھا، کیا کیا تُو نے پھر انہیں راہوں پر چل نکلی۔ ذرا تجھے خوف نہیں آیا..... خدا کا۔ تُو کسی کی بیوہ تھی ماں تھی تین بچوں کی ماں..... لیکن..... میں تو..... اسے اپنانا چاہ رہی تھی..... پہلے بھی..... اب بھی۔ اس کا دل آپ ہی آپ سوال و جواب میں مصروف تھا۔ پہلے اس کی ماں اس راہ میں رکاوٹ بنی پھر میرے گھر والے؟ کیا دوسری شادی کرنا جرم ہے؟ لیکن ہمارے مذہب نے تو ایسا نہیں کہا۔ ہر انسان کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق دیا ہے تو پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ کیوں ہوا؟ وہ بڑی دیر تک ”کیوں“ کی گردان پر اٹکی رہی۔ ”حق اللہ..... اللہ ہو“ ویرانے میں پھر نعرہ بلند ہوا۔ اس نے ہمسائی کا ہاتھ پکڑا اور پلٹ آئی۔ اسے اپنے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ اللہ ہو ساری کائنات کا فلسفہ تو اسی ”اللہ ہو“ میں سمایا ہوا تھا وہی نہ سمجھ سکی تھی۔

کولیسٹرول (Cholesterol) کو کنٹرول کیجیے

حکیم راحت نسیم سوہدروی

جن لوگوں میں ضرورت کے مطابق کولیسٹرول بنتا ہے وہ اپنی زندگی خوشگوار انداز میں گزارتے ہیں مگر جب بے احتیاطی یا کسی اور سبب بڑھ جائے تو حملہ قلب یا فالج کے امکانات ہوسکتے ہیں
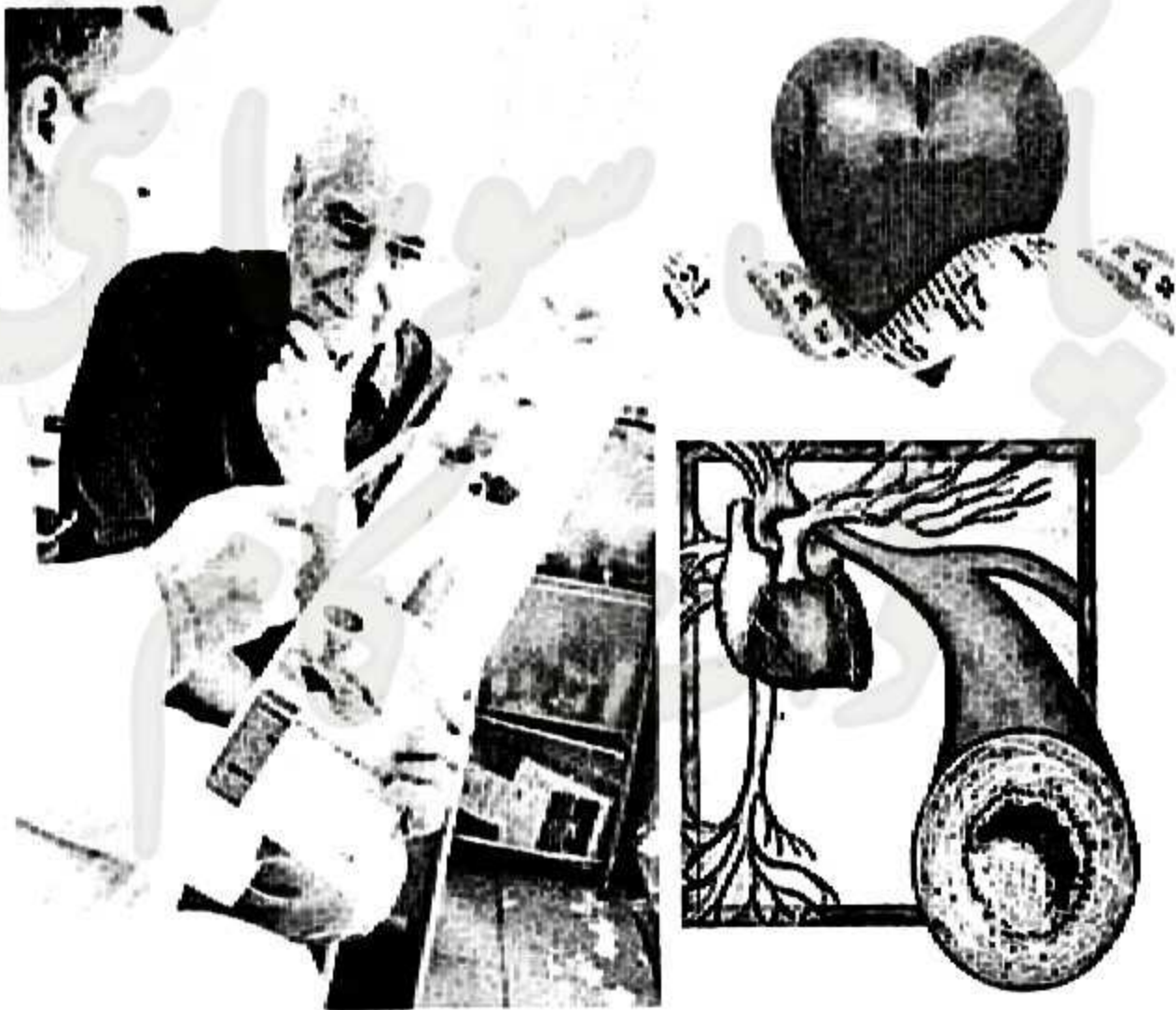
پاکستان میں امراضِ قلب کے باعث اموات کی شرح بہت زیادہ ہے۔ اگر زندگی حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق گزاری جائے تو بڑی حد تک امراضِ قلب سے بچا جاسکتا ہے۔ امراضِ قلب کی ایک وجہ اس کا موروثی ہونا بھی ہے۔ اگر کسی خاندان میں یہ امراض موروثی ہیں تب بھی مناسب تدابیر سے اس خاندان کے افراد اپنی زندگی کو خوشگوار بناسکتے ہیں۔ اس کے لیے سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ خون میں کولیسٹرول کی سطح کو متوازن رکھا جائے کیونکہ جب کولیسٹرول کی سطح نارمل

یا متوازن نہ رہے اور بڑھ جائے تو دل کا مرض ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ خون میں کولیسٹرول کی سطح جب بڑھتی ہے تو اس سے خون کا دباؤ (ہائی بلڈ پریشر) بڑھ جاتا ہے۔ جس سے خون نالیوں میں جم کر ان نالیوں کو تنگ کر دیتا ہے۔ اسے طبی اصطلاح میں تصلب شریانی یا انگریزی میں ATHEROSCLEROSIS یا عام فہم میں خون کی نالیوں کا تنگ ہونا کہتے ہیں۔ اس صورت میں دوران خون درست نہیں رہتا اور خون کی گردش میں رکاوٹ کا باعث ہوتا ہے۔ اگر خون کی وہ نالی جو دل کو خون فراہم کرتی ہے مکمل طور پر بند ہو جائے تو دل کے پٹھوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس طرح وہ اپنا کام نہیں کر پاتے اور حملہ قلب یعنی ہارٹ اٹیک ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ نلی جو دماغ کے خلیوں کو خون فراہم کرتی ہے اگر بند ہو جائے تو دماغ کو نقصان پہنچتا ہے اور انسان فالج کا شکار ہو سکتا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر خون میں کولیسٹرول کی سطح متوازن ہے تو امکانی حد تک اس مرض سے بچا جا سکتا ہے۔

کولیسٹرول کیا ہے؟

کولیسٹرول ایک ایسا کیمیائی مادہ ہے جو قدرتی طور پر جسم میں موجود ہوتا ہے۔ جگر جسم انسانی میں کولیسٹرول بناتا ہے۔ جو ستر فی صد ہوتا ہے جب کہ بقیہ تیس فیصد خوراک کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے جسم میں کولیسٹرول کی مقدار بڑھتی جاتی ہے۔ پچاس سال کی عمر کے بعد سال میں ایک بار ضرور چیک کروانا چاہیے۔ جسم کو مختلف سرگرمیوں کے ذریعے کولیسٹرول کی ضرورت رہتی ہے جن لوگوں میں ضرورت کے مطابق کولیسٹرول بنتا ہے وہ اپنی زندگی خوشگوار انداز میں گزارتے ہیں مگر جب بے احتیاطی یا کسی اور سبب بڑھ جائے تو حملہ قلب یا فالج کے امکانات ہوتے ہیں۔ کولیسٹرول

خطرناک نہیں ہوتا بلکہ اس کی صرف ایک قسم کی زیادہ مقدار خطرناک ہوتی ہے۔ کولیسٹرول جسم میں کئی سرگرمیوں کے لیے ضروری ہے مثلاً

☆ دھوپ میں حاصل ہونے والی روشنی کو وٹامن ڈی میں تبدیل کرتا ہے۔

☆ اعصابی نظام کے خلیوں اور نسوں کو منظم طریقے سے کام میں مدد اور پیغام رسانی کو آسان بناتا ہے۔ یادداشت اور سیکھنے کے عمل میں اعصابی خلیوں کو بناتا ہے۔

☆ جسم کے خلیوں کی بیرونی جھلیوں کے بنانے میں لازمی جز ہے۔

☆ خلیوں کے اندر اور باہر جانے کے راستوں کو کنٹرول کرتا ہے یعنی اس فیصلہ میں اہم کردار ادا کرتا ہے کہ کن ذرات کو خلیوں کے اندر جانا ہے۔

☆ جلد کے اندر ہارمون کی تیاری میں مدد دیتا ہے۔

☆ سٹیرائیڈ ہارمون بنانے میں اہم ہے۔

☆ صفرا (Bile) کی تیاری کا اہم جز ہے۔

☆ جنس کے مخصوص ہارمون ایسٹروجن اور ٹیسٹوسٹیرون کی تیاری میں مددگار ہے۔ کولیسٹرول کے جسم میں اہم کردار کے باوجود اگر یہ بڑھنے لگے تو نقصان دہ ہو جاتا ہے۔

خون میں کولیسٹرول کی زیادتی موروثی خرابی یا غیر متوازن غذا کے سبب ہوتی ہے۔ غیر متوازن غذا میں چکنائی والی اشیاء، گائے یا بکرے کے گوشت کا زیادہ استعمال، انڈا کلیجی کا زیادہ استعمال اور باقاعدگی سے سیر یا ورزش کا نہ کرنا ہے۔ چربی یا چکنائی (Fat) پانی میں تحلیل نہیں ہوتی۔ LIPID دراصل FAT کی ہی اکائی ہے۔ جس میں موجود چربی LIPID کہلاتی ہے اور مختلف طرح کی ہوتی ہے۔ جب ہم چکنائی (SATURATE FAT یعنی ے پگھلنے والی چکنائی استعمال

کرتے ہیں۔ یہ بہت سخت کیمیائی ساخت رکھتی ہے۔ اس لیے زیادہ توانائی فراہم کرتی ہے۔ کولیسٹرول بنانے کے عمل میں اس کی موجودگی لازمی ضرورت ہے۔ جس میں جس قدر یہ چکنائی ہوگی اتنا ہی کولیسٹرول زیادہ بنے گا۔ کولیسٹرول خون کی نالیوں میں تحلیل نہیں ہوتا بلکہ ایک سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لیے Lipoprotein کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جو کئی قسم کا ہوتا ہے مثلاً HDL, LDL, VDL۔ لائپوپروٹین کولیسٹرول کے آغاز سے اختتام تک کے سفر میں کام کرتے ہیں۔ اس لیے لیبارٹری ٹیسٹ میں کولیسٹرول کو جانچنے کے لیے انہی کی مقدار کو جانچا جاتا ہے۔ جگر میں پتے کے ذریعے زیادہ کولیسٹرول تبدیل ہوکر بائل ایسڈ Bile Acid بنتا ہے۔ جو آنت اور پھر جسم سے خارج ہوتا ہے۔ کولیسٹرول کی زیادہ مقدار چکنائی کی موجودگی، جگر میں خرابی پتے میں کولیسٹرول بڑھا کر پتے کی پتھری کا سبب بنتی ہے۔ بعض خاندانوں میں نسل در نسل کولیسٹرول بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ ان میں موٹاپا اور امراض قلب کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ موٹاپا بذات خود کولیسٹرول بڑھنے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ غذا میں سیچوریٹڈ فیٹ والے ذرائع کا استعمال کولیسٹرول بڑھنے کی اہم وجہ ہے۔ جب کولیسٹرول کی مقدار نارمل سے بڑھ جائے تو خون کی شریانوں کی تہہ میں جسم ان کو تنگ کردیتا ہے۔ جس سے خون کی روانی متاثر ہوتی ہے اور مسائل صحت خصوصاً امراض قلب کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

کولیسٹرول کی سطح

جدید میڈیکل سائنس کے مطابق خون میں دوسو سے دوسو چالیس ملی گرام تک نارمل مقدار ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اس مقدار کو دوسو تک رکھا جائے اور اسے

باتیں ملازموں کی

مالکن: "تمہیں اُمید ہے کہ ہمارے ہاں کب تک کام کرلوگی؟ اس سے پہلے تم بہت سی جگہوں پر کام کرچکی ہو۔"

ملازمہ: میں نے کسی بھی جگہ سے خود کبھی نوکری نہیں چھوڑی۔

☆ مالکن کچن میں پہنچی تو اس نے خانساماں کو بڑے مزے سے بروسٹ اُڑاتے ہوئے کولڈ ڈرنک پیتے دیکھا۔ مالکن حیرت سے بولی "تم چھپ چھپ کر یہ سب چیزیں کھاتے ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا تم نے مجھے حیران کردیا۔

آپ نے بھی مجھے حیران کردیا ہے بیگم صاحبہ! خانساماں سنبھل کر بولا۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ باہر گئی ہوئی ہیں۔

(مرسلہ: محسن اشفاق۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ)

بڑھنے نہ دیا جائے۔ اگر یہ مقدار بڑھ جائے تو بار بار چیک کراتے رہیں بڑھنے کی صورت میں اسے نارمل سطح پر رکھنے کی تدابیر کی جائیں کیونکہ یہ مقدار بڑھنے کی صورت میں مسائل صحت پیدا ہوسکتے ہیں۔

کولیسٹرول کی اقسام

کولیسٹرول کی دو اقسام ہیں ایک (Low Density Lipoppotein) LDL ہے جو جگر سے خون کی نالیوں کے ذریعے جسم کے دوسرے حصوں میں جاتا ہے۔ یہ مضر قلب ہے۔ اس سے خون کی شریانوں میں گچھے (Atheroma) بن کر ان کی تہہ پر جسم کو تنگ کردیتے ہیں۔ اس طرح دل و دماغ کو خون کی پوری فراہمی نہیں ہوتی اور مسائل صحت پیدا ہوتے ہیں۔

دوسری قسم HDL کولیسٹرول (High Density Lipoprotein) ہے جس کی مقدار زیادتی مفید قلب ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ خون

کی نالیوں میں گچھے (Atheroma) بننے نہیں دیتا بلکہ چکنائی کو اپنے ساتھ بہاتا ہوا جگر میں پہنچا دیتا ہے۔ جہاں سے خوب صاف ہوکر جسم کے مختلف حصوں میں چلا جاتا ہے۔ ورزش اور جسمانی سرگرمیاں HDL کو جسم اور خون میں بڑھا دیتے ہیں۔ اس طرح امراض قلب خصوصاً حملہ قلب کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

ٹرائی گلیسرائیڈز (Triglycerides) کی بڑھی ہوئی سطح بھی چکنائی کی ایک قسم ہے جو چکنائی اور شکر کے زیادہ استعمال سے بنتی ہے۔اس کی نارمل مقدار 150 ملی گرام فی سو ملی لیٹر ہے۔ یہ خون کو گاڑھا کرتی ہے جس سے دل کو جانے والا خون گاڑھا ہو جاتا ہے۔

کولیسٹرول کو بڑھنے سے روکنے کی تدابیر

ہم متوازن غذا کے استعمال سے خون میں کولیسٹرول کو بڑھنے سے روک سکتے ہیں اور اس طرح کولیسٹرول کی سطح نارمل رکھ سکتے ہیں۔اس کے لیے

☆ گوشت کا استعمال کم کریں۔

☆ سبزی خوری کی عادت اپنانی چاہیے۔

☆ وزن نہ بڑھنے دیں۔ وزن کی زیادتی سے دل کو گردش خون کے لیے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔

☆ فائبر (ریشہ دار) سبزیاں اور پھل زیادہ استعمال کریں۔

☆ مچھلی کا استعمال مفید ہے۔

☆ غیر سیر شدہ تیل استعمال کریں۔

☆ اناج، دالیں، چاول اور آلو کھائیے۔

☆ سیر یا ورزش کو معمول بنائیے۔

☆ حیاتین ج (Vit c) والی غذائیں زیادہ لیں۔

☆ تمبا کو نوشی سے پرہیز کریں۔

☆ ذہنی دباؤ، اعصابی تناؤ اور ڈیپریشن سے محفوظ رہیں۔

☆ زندگی خوش و خرم گزاریے اور نماز باقاعدگی سے ادا کریں۔

جدید تحقیق

ماہرین طب و صحت نے ایک تحقیق میں بتایا ہے کہ لیپو پروٹین میں کمی کی مقدار اتنی خاطر خواہ ہے کہ اسے کسی حد تک سٹاٹینز ادویات پر ترجیح دی جاتی ہے یا پھر اسے متبادل کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے۔ سٹاٹینز ادویہ سے مراد وہ ادویہ ہیں جو امراض قلب کے مریضوں کو ان کے جگر میں کولیسٹرول کی پیداوار کی سطح کو ایک خاص حد تک رکھیں۔ ٹورانٹو (کینیڈا) کی یونیورسٹی میں ہونے والی تحقیق کے مطابق جو ڈاکٹر ڈیوڈ جینکنس کی سربراہی میں ہوئی ہے۔ میں کہا گیا ہے کہ اس طرح وہ لوگ بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو صرف سبزیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ سٹاٹینز ادویہ کے استعمال سے علاج معالجہ کے عمل میں بڑا فرق سامنے آیا ہے تاہم ہم اب تک اس طرح اتنی ہی پیش رفت کر سکتے ہیں۔

واضح رہے کہ امریکہ میں 45 سال یا اس سے زیادہ عمر والے لوگوں میں سے ہر چوتھا فرد کولیسٹرول گھٹانے والی ادویہ استعمال کرتا ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اس تحقیق میں یہ بات پیش نظر رکھی گئی کہ خوراک کی تبدیلی اور ادویہ کے استعمال کے بغیر نقصان دہ کولیسٹرول LDL پر کس حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ 351 افراد پر ہونے والے تجربات کے بعد یہ نتیجہ سامنے آیا کہ کولیسٹرول میں کمی کا یہ فرق بہت زیادہ ہے۔ لوگوں کی کافی بڑی تعداد ادویہ پر انحصار کرتی ہے تاہم اصل معاملہ خوراک کا ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ادویہ استعمال کرنے والے خیال کرتے ہیں کہ وہ جس طرح کی چاہے غذا استعمال کریں یہ ادویہ کولیسٹرول کو بڑھنے سے روک لیں گی۔ جبکہ ایسا نہیں ہے خوراک کا اہم کردار ہے۔

بہار انصاری

فوجی سکاؤٹس کسی قبیلہ کی ایک نوجوان خوبصورت لڑکی کو اٹھا لائے اور اس کو قلعے کی چار دیواری میں لا قید کیا۔ قبیلے کے لوگوں کو معلوم ہوا تو ان کے غیض و غضب کی آگ بھڑک اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے قبیلے کے سینکڑوں لوگ بندوقیں ہوا میں لہراتے میرانشاہ کے قلعے تک آپہنچے۔

ایک دوشیزہ کی کہانی، جو علاقائی روایات کی بھینٹ چڑھ گئی

پاکستان کے شمالی مغربی سرحدی صوبہ بنوں سے آگے وزیرستان کے علاقے میں ایک چھوٹی سی جگہ ہے میرانشاہ میرانشاہ افغانستان اور پاکستان کی سرحد پر ایک پہاڑی مقام ہے جو افغانستان سے پاکستان آنے والوں کے لیے ایک دروازے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ جگہ بلند و بالا پہاڑی سلسلوں کے دامن میں آباد ہے۔

1945ء میں مجھے بھی میران شاہ میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میران شاہ کے آس پاس کے دیہی علاقوں میں مختلف قبائل آباد ہیں جو ہمیشہ سے انگریز اور انگریزی حکومت کے خلاف نبرد آزما رہتے آئے تھے۔ پاکستان بنے صرف سات سال ہوئے تھے اور حکومت پاکستان کی جانب سے کسی نہ کسی طرح ان

آزاد قبائل کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ اب انگریز برصغیر کو چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ مسلمانوں کا علیحدہ آزاد ملک پاکستان وجود میں آچکا ہے اور انگریز کی غلامی سے نہ صرف اس ملک کے باشندے آزاد ہو گئے ہیں بلکہ تمام قبائل بھی اس خطہ کو آزاد خیال کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہر طرح کی غلامی کی قید سے آزاد سمجھیں۔

پورے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے آزاد قبائل جو ابھی تک دیہاتوں میں رہتے ہیں اپنی روایتی قبیلہ پروری کی بنا پر مشہور ہیں۔ یہ لوگ ہر قیمت پر اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی مختلف قبیلوں کی آپس میں دشمنی ہمیشہ قتل و خون کا بازار گرم کرتی رہتی ہے۔

میرانشاہ کے مضافاتی علاقوں میں بسنے والے قبائلی لوگوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی اور باغبانی تھا۔ وہ لوگ اجناس اور پھل وغیرہ لے کر میرانشاہ کی چھوٹی سی منڈی میں آتے تھے اور اپنا لایا ہوا تمام سامان فروخت کرنے کے بعد اپنی ضرورت کی اشیاء اور روپیہ وغیرہ لے کر دیہاتوں میں واپس چلے جاتے تھے۔

لیکن یہ بات نہایت تشویش ناک تھی کہ آئے دن ان قبیلوں کی آپس میں جنگ چھڑی رہتی اور وزیری قبائیلوں میں ایک دوسرے پر حملہ کرنے کا رجحان موجود تھا۔ کبھی چوری چھپے پہاڑیوں کی اوٹ سے ایک قبیلہ کے لوگ اپنے دشمن قبیلہ کے لوگوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتے اور اکثر اوقات تو باقاعدہ میدانوں میں آمنے سامنے صف آرا ہو کر مقابلہ ہوتا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاشیں بکھر جاتیں۔

اس قسم کی صورت حال سے نپٹنے کے لیے قانون کی اتنی گرفت تھی کہ ایسی "جنگوں" کا پتا چلنے پر میرانشاہ سے ٹوچی سکاؤٹس ان آزاد علاقوں میں پہنچ کر گولیاں برساتے۔ اور ان قاتلانہ اور وحشیانہ کارروائیوں سے ان لوگوں کو باز رکھنے کی کوشش

بیٹیاں ---- احادیث کی روشنی میں

☆ تم میں سے بہتر وہ ہے جس کے ہاں پہلی اولاد بچی پیدا ہو۔

☆ جس نے ایک بچی کی پرورش کی وہ جنت میں جائے گا۔

☆ تمہاری اولاد میں سے بہترین لڑکیاں ہیں۔

☆ تم پر سب بچوں (لڑکوں اور لڑکیوں) کے حقوق برابر ہیں۔

☆ کسی بھی کام کی ابتدا بیٹیوں سے کرنا میری سنت ہے۔

☆ جو کوئی دو لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک کرے (یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں) وہ جنت میں ایسے داخل ہوگا جیسے میرے ہاتھ کی دو انگلیاں۔ مقام فکر ہے کہ جس بیٹی کو نبی ﷺ اتنی اہمیت بخش رہے ہیں اسے اس معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔

(نعیم احمد)

کرتے۔ اکثر یہ ٹوچی سکاؤٹس پہاڑیوں اور دیہاتوں میں جا جا کر ایسے دہشت پسندوں کو گرفتار بھی کرتے تھے جو اس خطہ کے امن و امان میں دخل اندازی کے مرتکب ہوتے۔ گرفتار ہونے کے بعد یہ لوگ میرانشاہ کے قلعے میں لائے جاتے جہاں ان لوگوں کو قید کر دیا جاتا تھا۔ میرانشاہ کا قلعہ پرانے زمانے کا ایک مضبوط اور بہت بڑا قلعہ تھا۔ یہ قلعہ کیا تھا اس میں ایک دنیا آباد تھی۔ اس قلعے میں پولیٹیکل ایجنٹ کا دفتر اور اس کی رہائش گاہ تھی۔ پولیٹیکل ایجنٹ حکومت کی جانب سے مقرر کیا ہوا وہ اعلیٰ ترین اور بااختیار افسر تھا جو پورے علاقے کا کنٹرول سنبھالے ہوتا تھا اور اس علاقے میں امن و امان برقرار رکھنے کا ذمہ دار تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ کے علاوہ ٹوچی سکاؤٹس کا ہیڈ کوارٹر، رہائش گاہ، خزانہ اور

حکومت کا تمام عملہ بھی اسی قلعے میں تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس قلعے میں ایئر فورس کے چھوٹے جہازوں کا ایک سکواڈ بھی تعینات تھا۔

جب قبائلی لوگوں کی جنگ ٹوچی سکاؤٹس کے قابو سے باہر ہو جاتی تو پولیٹیکل ایجنٹ کے حکم سے فضائیہ کے جہاز حرکت میں آتے یہ جہاز قبائلیوں کے جنگی علاقے میں نیچی پرواز کر کے یا تو صرف ڈرانے کے لیے چکر لگایا کرتے یا پھر گولیاں برساتے تھے اور اس طرح لڑنے والے منتشر ہو جایا کرتے تھے۔

گو اس بات کو تمام قبیلوں کے لوگ اچھی طرح جان چکے تھے کہ اُن کا ازلی دشمن انگریز ان کے علاقے سے جا چکا ہے اور اب حکومت صرف مسلمانوں کی ہے لیکن یہ لوگ پھر بھی اپنی آزاد زندگی میں کسی طرح کے قانون کی مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنے علاقے میں آزاد رہنا چاہتے تھے۔

ہوا یہ کہ ٹوچی سکاؤٹس کسی قبیلہ کی ایک نوجوان خوبصورت لڑکی کو اُٹھا لائے اور اس کو قلعے کی چار دیواری میں لا قید کیا۔ قبیلے کے لوگوں کو معلوم ہوا تو اُن کے غیض و غضب کی آگ بھڑک اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے قبیلے کے سینکڑوں لوگ بندوقیں ہوا میں لہراتے میرانشاہ کے قلعے تک آ پہنچے۔ قلعے کا صدر دروازہ بند تھا اور فصیلوں پر حسب معمول گارڈ موجود تھے۔ قبیلے والوں نے لڑکی کی واپسی کا مطالبہ کیا اور یہ بات واضح طور پر بتا دی کہ اگر فوری طور پر لڑکی اُن کے حوالے نہ کی گئی تو یہ لوگ کسی بات کی پروا کیے بغیر قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور جان پر کھیل کر لڑکی کو لے جائیں گے۔ لڑکی کو اُٹھانے میں ٹوچی سکاؤٹس کی نیت کچھ بھی رہی ہو لیکن بظاہر اُن کا مؤقف یہ تھا کہ یہ لڑکی ہماری قیدی ہے اور دیگر قیدیوں کے ہمراہ قلعے میں لائی گئی ہے۔ مگر قبیلے والے اس بات کو ماننے پر تیار نہ تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ قیدی بنانا ہے تو مردوں کو بناؤ ہماری عورتوں کو کسی کو چھونے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ پورے ماحول میں کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ ہر کوئی یہ سوچتا کہ نہ جانے اب کیا ہوگا۔ قبیلے والے ایک لمحہ بھی لڑکی کو قلعے میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ یہی نہیں انہوں نے طرح طرح کے شبہات اپنے دل میں قائم کر کے یہ تاثر پیدا کر لیا تھا کہ پرائے بس میں اُن کی لڑکی کے ساتھ کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس خیال کے تحت وہ لوگ جوش و بے چینی میں بپھرے جا رہے تھے۔ دن ڈھلے تک کسی قسم کا کوئی تصفیہ نہ ہو سکا تھا اور قبیلے والوں نے بدستور قلعے کا گھیراؤ کیے رکھا۔

پولیٹیکل ایجنٹ کو جب ان تمام واقعات کا علم ہوا تو اس نے فوری طور پر لڑکی کو رہا کر دینے کا حکم صادر کیا اور رات کی آمد کے ساتھ ہی لڑکی کو قلعے کے صدر دروازے سے باہر نکال دیا گیا۔ لڑکی سر جھکائے نیچی نظریں کیے قلعے کے صدر دروازے سے برآمد ہو کر اپنے قبیلے کے لوگوں میں جا شامل ہوئی۔

لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ لڑکی کو ایک قید سے رہائی دلانے کے بعد قبیلے والوں نے اس کو قید حیات سے بھی رہائی دلا دی۔ بندوق کی چند گولیاں لڑکی کے سینے کے پار ہو چکی تھیں اور وہ خوبصورت نوجوان لڑکی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ لڑکی کی لاش کو کاندھے پر ڈال کر یہ لوگ بوجھل دل کے ساتھ اپنے گاؤں کی سمت روانہ ہوئے اور یہ بتا گئے کہ ہمارے قبیلے کی یہ لڑکی جس پر غیروں کا سایہ پڑ چکا ہے اب ہمارے قابل نہیں ہے۔ کون جانے یہ اپنی عصمت کے نایاب موتی کی حفاظت بھی کر سکی یا نہیں۔ اس کا زندہ رہنا ہم لوگوں کے لیے ہمیشہ ۔بے غیرتی اور بے عزتی کی علامت بنا رہتا اور اس طرح یہ نوجوان لڑکی وزیرستان کے قبیلے کے لوگوں کی روایات کی بھینٹ چڑھ گئی۔

راؤ حسن ناصر

سرکش مسٹر جیک نے کہا "اچھا ہے ابھی سے اس کو غلام بنانے کی ابتداء ہو چکی۔" فوراً خمیدہ مسٹر جیک نے بیچ میں ٹانگ اڑاتے ہوئے کہا: "مگر میری نظر مسلسل اسی پر تھی صرف تھوڑا سا مال آؤٹ ہوا تھا کہ جس پر اس کے سپروائزر نے اس کی اتنی کلاس لے لی۔ ذرا دیکھو اس لڑکے کا چہرہ لگتا ہے ابھی رو دے گا....."

وہ دونوں ہم نام، مگر ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے

جیک کیا بات ہے اس کی' دراز قد ایسا جیسا پرانے زمانے کا راجپوت ہو۔ شاید چھ فٹ دو انچ کا تو ہوگا۔ مگر کاٹھ میں دُبلا سا ہے۔ خیر لگتا ہے پوری ٹیکسٹائل مل کا سارا کام یہی سنبھالتا ہے۔ مزدور اس کے بغیر کام کا سوچ بھی نہیں سکتے [illegible] اسے جیک کہنا

مسٹر جیک کہنا درست ہوگا۔

مگر اس ٹیکسٹائل مل میں دو جیک ہیں۔ ایک اکڑا ہوا "سرکش" لگتا ہے اسے مزدوروں سے خاص دشمنی ہے جبکہ دوسرے کی چند [illegible] تھوڑا رحم ہے اور [illegible] میں عاجزی ہے کہ

مزدوروں کو اس سے بات کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور یہ بھی مزدوروں کا مکمل ساتھ دیتا ہے۔

"دیکھو نیا لڑکا آیا ہے"۔

خمیدہ مسٹر جیک نے سرکش مسٹر جیک سے کہا: "کتنا معصوم ہے بے چارہ لگتا ہے اب تک اس کی پرورش اس کی ماں کے ہاتھوں میں ہوئی ہے کیونکہ اس کی چال ڈھال بھی بتا رہی ہے اور تم اس کے چہرے پر معصومیت دیکھو اور ساتھ ہی معصومیت کے پیچھے چھپا ہوا خوف۔"

سرکش مسٹر جیک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "نیا لڑکا نہیں بلکہ نیا غلام کہو۔ یہ بھی جنگلی کے گھوڑے کی طرح سرکش ہوگا مگر اب اسے یہاں لگام ڈالی جائے گی۔ اب اسے معلوم ہوگا کہ دنیا کہتے کسے ہیں؟ اور دنیاداری کیسے کی جاتی ہے؟ اگر یہ مضبوط اعصاب کا مالک ہوگا تو سنبھل جائے گا، ورنہ صرف ایک مشین بن جائے گا کہ جسے دوسرے لوگ ہینڈل کریں گے۔"

خمیدہ مسٹر جیک نے کہا کہ میں تو اس کے ساتھ مکمل تعاون کروں گا۔ سرکش مسٹر جیک نے کہا، "بس یہی وجہ ہے کہ میری تم سے نہیں بنتی، مانتا ہوں کہ ہم دونوں ہم نام ہیں مگر تمہاری اور میری سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سو بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ یہ لوگ غلام ہیں اور ان کی آنے والی نسلیں بھی مکمل غلام ہوں گی۔ انہیں مذہبی تہواروں کے دن بھی اسی لیے سختی سے کام پر بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے اذہان اور لاشعور میں یہ بات کہے بغیر ڈالی جائے کہ تم غلام ہو! تمہاری خوشی غمی کچھ نہیں! نہ ہی تمہارے لیے تمہارے اہل و عیال اور دوست و احباب اہم ہیں۔ اگر تمہارے لیے کوئی چیز اہم ہے تو وہ تمہارا کام ہے اور کام کا دباؤ اسی لیے رکھا جاتا ہے کہ ان کی توجہ کسی

خشک میوے کھانے والے طویل عمر پاتے ہیں

ایک امریکی تحقیق کے مطابق خشک میوہ جات کھانے والے افراد کی عمر بظاہر طویل ہوتی ہے۔ طبی جریدے نیو انگلینڈ جرنل آف میڈیسن میں شائع ہونے والی تحقیق کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزانہ کی بنیاد پر خشک میوے کھانا زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔ امریکی محققین کے مطابق ممکن ہے کہ خشک میوے کھانے والے افراد کا طرز زندگی صحت مندانہ ہو لیکن خشک میوے بھی ان کی طویل العمری میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم برٹش ہارٹ فاؤنڈیشن کا کہنا ہے کہ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس تحقیق کے دوران 30 برس کے عرصے میں ایک لاکھ 20 ہزار افراد کا جائزہ لیا گیا اور پتہ چلا کہ جو لوگ باقاعدگی سے خشک میوے کھاتے رہے ان کے اس عرصے میں مرنے کے امکانات کم رہے۔ برٹش ہارٹ فاؤنڈیشن سے تعلق رکھنے والی سینئر ماہر خوراک وکٹوریہ ٹیلر کا کہنا ہے کہ باقاعدگی سے میوہ جات کھانے اور دل کی بیماری سے ہلاکت کا یہ ایک دلچسپ تعلق ہے۔ ہمیں اس امر کی تصدیق کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے کہ آیا میوہ جات ہی دل کی حفاظت کرتے ہیں یا اس میں ان افراد کے طرز زندگی کا بھی عمل دخل ہے۔

(مرسلہ: حیدر ناظم۔ لاہور)

اور جانب مبذول نہ ہو۔ اسی لیے ان کی اُجرت کا پیمانہ یہ رکھا جاتا ہے کہ یہ [illegible] زندہ رہنے کے قابل رہیں۔ [illegible] اہم حاصل کرنے کے قابل

قیمت: 160 روپے

شائع ہو گیا ہے

- نقشہ ارض القرآن مع اہم قرآنی مقامات کی نشان دہی
- مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا روڈ میپ
- حج اور عمرہ کی ادائیگی کا طریقہ آسان اور عام فہم زبان میں
- اہم تاریخی مقامات کا نام، وجہ تسمیہ، محل وقوع، تصاویر اور اُن سے متعلق تاریخی واقعات کا بیان نیز متعلقہ آیات اور احادیث کے حوالہ جات
- تحریروں، تصویروں اور جدید نقشوں سے مزین یہ کتاب ہی نہیں حج اور عمرہ پر جانے والوں کے لئے ایک مکمل گائیڈ ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور فون 042-37245412

نہ رہیں اور دیکھنا وہ مستقبل میں ان سے زیادہ بہتر غلام ثابت ہوں گے۔"

"کتنا زہر ہے تم میں!" خمیدہ مسٹر جیک نے سرکش مسٹر جیک سے کہا۔ "ہاں میرا ماننا ہے کہ کوئی تمہیں پتھر مارے تو تم اس کا جواب اینٹ سے دو۔" خمیدہ مسٹر جیک نے فوراً کہا کہ "ساتھ یہ بھی تو کہا گیا ہے کہ کوئی تمہارے راستے میں کانٹے بچھائے تو تم اس کے راستے میں پھول بچھاؤ کیونکہ اگر سب ایک دوسرے کے راستے میں کانٹے بچھانے لگے تو دنیا کانٹوں سے بھر جائے گی۔"

"ارے وہ دیکھو اس کے سپروائزر نے ایک معمولی سی بات پر اس کی کلاس لینا شروع کردی۔" سرکش مسٹر جیک نے کہا!

"اچھا ہے! یہیں سے اس کو غلام بنانے کی ابتداء ہو چکی۔" فوراً خمیدہ مسٹر جیک نے بیچ میں ٹانگ اڑاتے ہوئے کہا۔ "مگر میری نظر مسلسل اسی پر تھی صرف تھوڑا سا مال آؤٹ ہوا تھا کہ جس پر اس کے سپروائزر نے اس کی اتنی کلاس لے لی۔ ذرا دیکھو اس لڑکے کا چہرہ لگتا ہے ابھی رو دے گا۔ کتنا معصوم ہے بے چارہ! مشکل سے اس کی عمر اٹھارہ سال ہوئی ہوگی۔ نجانے کون سی مجبوری اسے یہاں کھینچ لائی۔ کاش میرے بس میں ہوتا تو میں اسے اور پڑھاتا تاکہ اسے یہ کام نہ کرنا پڑتا۔ اب کمپنی کے منیجروں نے اس کی اُجرت اتنی لگائی ہوگی کہ صرف اس کا اپنا گزارہ ہی ہو۔ یا سوچو اگر اس کا گھر کرایے کا ہوا تو یقیناً آدھی تنخواہ کرائے میں چلی جائے گی۔ پھر جو کچھ بچے گا وہ دال، سبزی کی نظر ہوگا۔ یقیناً یہ بڑا بیٹا ہوگا جبھی اتنی کم عمر میں گھر سے نکل پڑا۔ اگر اس کی جوان بہنیں ہوئیں تو اس کمسن کے کندھوں پہ [illegible] ہوگا اس کے کا[illegible] خود اس کا بوجھ اٹھانے

قابل تو ہیں نہیں دیکھتے ہیں مستقبل میں کس کس کا بوجھ ان پر ڈالا جائے گا۔ اگر اس لڑکے کی پیٹھ پر کسی کا ہاتھ ہوا تو یہ ترقی کرے گا اور آگے بڑھے گا مگر صرف اتنا ہی کہ جتنا بڑا ہاتھ ہوگا۔ ورنہ یہ بھی عام مزدوروں کی طرح عمر کے آخری حصے میں پھیپھڑوں کے کینسر یا ٹی بی میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے کوچ کر جائے گا۔ اس کے بچے اسے بچانے کی خاطر اپنی سب جمع پونجی اس پر لگا دیں گے اور بالآخر قلاش ہو جانے کے بعد بھی اپنے باپ کو نہ بچا پائیں گے۔ بس یہی ہوتی ہے ان غریبوں کی زندگانی مجھے لگتا ہے اس دنیا میں غریب صرف آزمائش کے لیے آتا ہے۔ ایک لمبی آزمائش، مسلسل آزمائش کبھی نہ ختم ہونے والی آزمائش، میرا بس چلتا تو میں غریب کو پیدا ہوتے ہی صلیب پر لٹکوا دیتا تاکہ مسلسل اذیت میں زندگی گزارنے کی بجائے ایک ہی بار اذیت دیکر مار دیا جائے۔ تمہیں وہ شعر یاد ہے؟

تُو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!"

سرکش مسٹر جیک نے کہا کہ "اپنی بک بک بند کرو اور میرے سر میں درد مت کرو۔" اس پر خمیدہ مسٹر جیک نے کہا کہ "اسی لیے میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ہمیں لوہے کا ایسا بے جان جیک بنایا کہ جس سے مزدور کام کرتے ہیں ورنہ اگر تمہیں انسان بناتا تو تم بھی ان غریبوں کا اور خاص طور پر مزدوروں کا خون چوستے۔"

اتنے میں لڑکے کا سپروائزر کہتا ہے جاؤ اور وہ جو دو جیک پڑے ہیں ان میں سے خمیدہ جیک لیکر آؤ۔ اکڑا ہوا مت لانا اس سے مزدوروں کو چوٹ لگ جاتی ہے۔ لڑکا اپنی معصوم سی شکل لیے آیا اور خمیدہ جیک اٹھا کر لے گیا۔

قسم

نواز خان

قسم
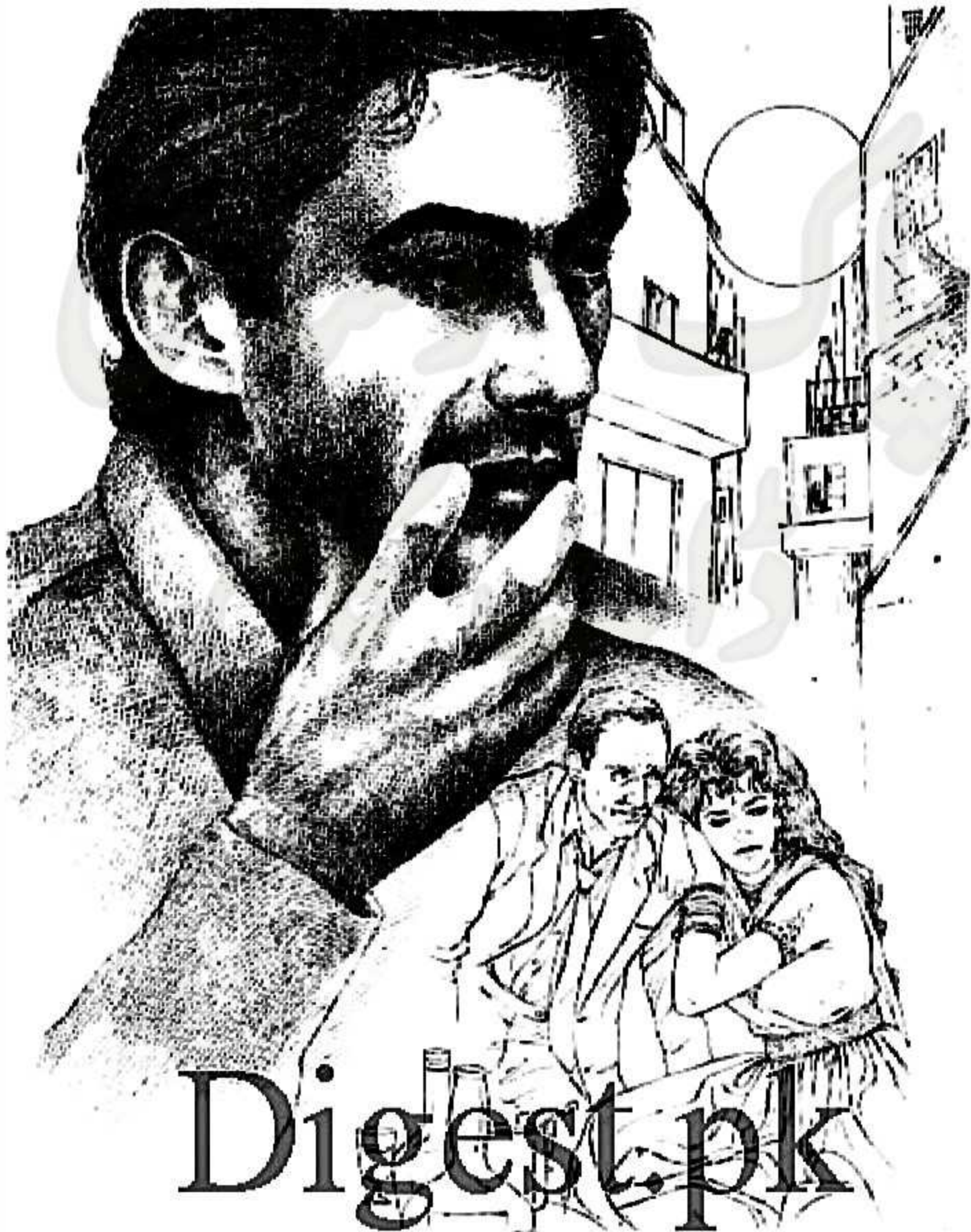
نواز خاں

وہ افغان زادہ جس نے اپنی محبوبہ کے سر سے ایک قسم کا بوجھ اُتارنے کے لیے اپنا تن من داؤ پر لگا دیا!

محبت اور جرم کا شاخسانہ نواز خان کے قلم سے

یہ ڈلہوزی کے بلند و بالا پُر فضا پہاڑوں کا واقعہ ہے۔ ڈلہوزی کی فیشن ایبل آبادی جسے "صدر" کہا جاتا ہے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں چند کالج بھی ہیں۔ اُن دنوں وہاں "کنگ کالج" کافی مشہور تھا۔ یہاں کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں تعلیم پاتے تھے۔ بے فکرے فیشن ایبل اور آزاد نوجوان اس کالج کی پہچان تھے۔ دو تین اور کالج بھی کنگ کالج کے ٹائپ کے تھے مگر کنگ کالج ہر طرح نمبرون تھا۔ کنگ کالج کے سرپرست اعلیٰ کا نام سردار اشوک رائے تھا۔ سردار صاحب بڑی بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے۔ کالونٹ میں پڑھے ہوئے تھے۔ ساری عمر اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں اُٹھتے بیٹھتے رہے تھے۔ رنگ و روپ بھی ماشاء اللہ بہت خوب تھا۔ بالکل گورے چٹے براؤن آنکھوں والے انہیں دیکھ کر کسی انگریز افسر کا گمان ہوتا تھا۔ سردار اشوک کی عمر پچاس سال سے اوپر تھی۔ تاہم وہ اب بھی صبح سویرے دوڑ لگاتے تھے اور کبھی کبھار اپنی وسیع کوٹھی کے لانز میں ٹینس کھیلتے بھی پائے گئے تھے۔ جوانی میں سردار صاحب دوڑ کے چیمپئن رہے تھے اور اب ان کا بیٹا سردار شمشیر چیمپئن سمجھا جاتا تھا۔

یہ چیمپئن شپ جس کی میں بات کر رہا ہوں طویل عرصہ پہلے شروع ہوئی تھی۔ شاید 1905ء کے لگ بھگ۔ اس کی شروعات کرنے والا ایک انگریز صاحب بہادر اسمتھ تھا۔ وہ کھیلوں کا بہت شوقین تھا اور خاص طور پر دوڑ کا۔ اُس نے اپنے شوق کے لیے ایک "ریس" کی داغ بیل ڈالی۔ میراتھن ریس کی طرح یہ ریس بھی اسٹیڈیم سے باہر ہوتی تھی۔ ریس میں حصہ لینے والے تقریباً 18 میل کا انتہائی دشوار گزار راستہ طے کرتے تھے۔ جیتنے والے کو ٹرافی اور نقد انعام دیا جاتا تھا۔ شروع میں یہ انعام 200 روپے تھا، پھر انعام کی رقم بڑھتے بڑھتے 1500 روپے تک پہنچ گئی۔ لیکن جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں اُن دنوں 1500 روپیہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔ اس ریس میں ہر کوئی حصہ لے سکتا تھا۔ بہت [illegible] مقامی اور غیر مقامی نوجوان کئی ماہ

پہلے سے دوڑنے کی تیاری شروع کردیتے تھے۔ جیتنا تو کسی ایک نے ہوتا تھا لیکن جیت کی خواہش ہر دل میں ہوتی تھی۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہر کھلاڑی ایڑی چوٹی کا زور لگا تا تھا۔

مجھے ڈلہوزی کے شمالی تھانے میں ڈیوٹی سنبھالے سات آٹھ مہینے ہوئے تھے جب مجھے پتہ چلا کہ یہاں ایک سالانہ ریس ہونے والی ہے۔ بلال شاہ ایسے معاملات کی بہت خبر رکھتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا تو اُس نے مجھے اس بارے میں بہت سی باتیں ایک ہی سانس میں بتا دیں۔

اس نے کہا کہ ”جناب! یہ ریس مارچ کی آٹھ تاریخ کو ہوگی یعنی ایک ماہ بعد، ریس کنگ کالج کی گراؤنڈ سے شروع ہوگی اور کھلاڑی کوئی اٹھارہ میل کا چکر کاٹ کر پھر کالج کی گراؤنڈ میں آ جائیں گے۔ اس دوڑ میں ڈلہوزی اور ڈلہوزی سے باہر کے قریباً دو سو دوڑنے والے حصّہ لیں گے لیکن اُن میں سے کسی کے جیتنے کی اُمید بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوڑ میں سردار اشوک کا لڑکا سردار شمشیر بھی حصّہ لے رہا ہے اور پچھلے چار سال سے وہی یہ دوڑ جیت رہا ہے۔ سردار شمشیر سے پہلے اُس کا بڑا بھائی سردار دلیپ یہ ریس جیتتا تھا اور سردار دلیپ سے پہلے اس کا ماموں زاد پرتھی پال۔ دراصل پچھلے تیس پینتیس سالوں میں اکثر سردار خاندان کے لڑکے ہی یہ دوڑ جیتتے رہے ہیں۔ صرف تین چار دفعہ ہی ایسا ہوا ہوگا کہ کسی دوسرے لڑکے نے یہ میدان مارا ہو“۔

میں نے کہا ”پھر تو عام لوگوں کی دلچسپی اس ریس میں بہت کم ہوتی ہوگی“ وہ بولا ”نہیں اب ایسی بات نہیں، اُمید پر دنیا قائم ہے، پچھلے تین چار سال سے پبلک کالج کا ایک لڑکا تیمور شمشیر کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہا ہے۔ ایک دفعہ تو وہ ریس جیتتے جیتتے رہ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس بار وہ کوئی کارنامہ دکھا ہی دے۔ اس کے علاوہ ایک اور آ سائیں لڑکا گوبند سنگھ بھی بڑا اچھا بھاگتا ہے۔ سُنا ہے وہ بڑے زور پر ہے..... دیکھیں جی، اصل نتیجہ تو ریس والے دن ہی نکلے گا“۔

مجھے ریس سے یا اُس کے نتیجے سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کے بعد بلال شاہ سے اس معاملے پر کوئی بات نہیں کی۔ ویسے اُڑتی اُڑتی باتیں میرے کانوں میں پڑتی رہیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ عام لوگ اس ریس میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں اور بعض شوقین شرطیں وغیرہ لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔

ریس والے دن میں بھی اپنے تھانے میں ہی موجود تھا۔ بلال شاہ بارہ بجے کے قریب تھانے آیا۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ اُس کا پسندیدہ کھلاڑی دوڑ نہیں جیت سکا۔ پسندیدہ کھلاڑی وہی تیمور نام کا لڑکا تھا۔ بلال شاہ ان چار ہفتوں میں اُس کا زبردست پرستار ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ مسلمان تھا۔ دوسرے غریب بھی تھا اور اپنے غریبی ڈھوے کے ساتھ سرداروں کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا ”ہاں بھئی بلال شاہ کیا خبر ہے؟“

وہ بولا ”وہی جو پچھلے تین چار سالوں سے ہے۔ سردار کا لڑکا جیت گیا ہے“۔

”اور وہ تمہارا ہیرو تیمور؟“

اُس کا تو جی کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ پتہ نہیں کیا ہوا ہے اُسے۔ انیسویں بیسویں نمبر پہ آیا ہے۔ ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا ہے اُس نے تو“۔

بلال شاہ اور اُس کے ساتھ ریس دیکھ کر آنے والا ایک سپاہی کافی دیر مایوسی کا اظہار کرتے رہے۔ انہیں اپنے اتھلیٹ کی ہار کا دُکھ بھی تھا اور اُس کی کارکردگی پر غصّہ بھی آ رہا تھا۔ اچانک بلال شاہ کو کچھ یاد آیا، کہنے لگا:۔

”ایک کام خراب ہوا ہے خان صاحب! ایک لڑکا گم ہو گیا ہے دوڑ میں، پتہ ہی نہیں چلا کدھر گیا ہے؟“۔

"کون لڑکا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی گوبند سنگھ جی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں اُس کے بارے میں۔ کافی اچھا دوڑنے والا تھا وہ بھی۔ اُس نے سب کے ساتھ ہی دوڑ شروع کی تھی۔ آدھی دوڑ میں وہ ساتھ رہا ہے پھر کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔ کئی لڑکے اب اُسے ڈھونڈنے نکلے ہوئے ہیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک وہ نہ ملا تو میرا خیال ہے اُس کے والی وارث تھانے پہنچ جائیں گے"۔

ابھی بلال شاہ کی بات منہ میں ہی تھی کہ تھانے کے سامنے کار رُکنے کی آواز آئی اور پھر تین چار افراد گیٹ سے گزر کر اندر آ گئے۔ ان میں کنگ کالج کے ایک پروفیسر کو میں جانتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اَدھیڑ عمر شخص تھا اور دو جوشیلے سے لڑکے تھے۔ یہ ہیرو ٹائپ لڑکے بھی کنگ کالج کے ہی تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر بلال شاہ فوراً بولا "لو جی آ گئے گوبند سنگھ کے والی وارث"۔

سلام دُعا کے بعد وہ لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کنگ کالج کے پروفیسر راجیو رائے نے گمبھیر لہجے میں کہا "انسپکٹر صاحب ہمارے کالج کا لڑکا گم ہو گیا ہے اور کوشش کے باوجود نہیں ملا آپ کو پتہ ہوگا آج صبح دوڑ تھی......!!"۔

"ہاں مجھے پتہ ہے" میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ اصل بات بتائیں"۔

وہ بولا "اصل بات یہی ہے جی کہ آدھی دوڑ کے بعد سندر گاؤں کے آس پاس گوبند کہیں گم ہو گیا ہے اور ہمیں پورا وشواس ہے کہ اُسے گم کیا گیا ہے"۔

میں نے کہا "پروفیسر صاحب! میری اطلاع کے مطابق آپ کی دوڑ ختم ہوئے ابھی صرف دو گھنٹے ہوئے ہیں۔ اتنے تھوڑے وقت میں آپ اس نتیجے پر کیسے پہنچ گئے کہ لڑکے کو گم کیا گیا ہے اور اُسے ڈھونڈنے کے لیے پولیس کی مدد لینا ضروری ہے...... میرا مطلب ہے [illegible] آپ کو؟"

"شک نہیں جی پورا وشواس ہے" لڑکے کے والد رنجیت سنگھ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "گوبند کو ماسٹر کے لڑکے تیمور نے مارا ہے، کسی سے مروا کر اور زخمی کر کے کہیں پھینک دیا ہے۔ وہ کمینہ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ میرے بیٹے کے گلے پڑ چکا ہے...... بڑا زہریلا ہے وہ۔ ہر وقت موقعے کی تلاش میں رہتا تھا۔ سب لوگوں نے بتایا ہے کہ آدھی دوڑ میں وہ اور گوبند سنگھ سب سے آگے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ سندر گاؤں کے پاس بھی درجنوں لوگوں نے انہیں ساتھ ساتھ دوڑتے دیکھا ہے۔ اُس وقت سردار صاحب کا بیٹا سردار شنکر کوئی ایک فرلانگ پیچھے تھا۔ لیکن ٹیکر اگلی کے قریب کھڑے لوگوں نے سردار شنکر کو سب سے آگے دیکھا ہے۔ اُس وقت نہ گوبند شنکر کے آس پاس تھا اور نہ وہ کمینہ تیمور۔ بعد میں تیمور انیسویں نمبر پر کالج گراؤنڈ میں پہنچا ہے۔ ہمیں ایک سو ایک فیصد یقین ہے جی کہ گوبند کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں تیمور کا ہاتھ ہے بلکہ اس نے خود کیا ہے سب کچھ"۔

ایک ساتھ مقابلے میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں میں اکثر چپقلش ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے پر بھی اُتر آتے ہیں۔ ممکن تھا کہ یہ بھی کوئی ایسا ہی واقعہ ہو۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔ یہ قریباً 18 میل لمبی ریس تھی اور سارے راستے میں خطرناک پہاڑی موڑ، تنگ گھاٹیاں اور چھوٹے چھوٹے پل تھے۔ اس راستے پر دوڑتے دوڑتے اپنے کسی ساتھی کو دھکا دے کر موت کے گڑھے میں پھینک دینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بہر حال میرا ذاتی خیال تھا کہ گوبند کے گھر والوں کو اتنی جلدی کسی پر الزام نہیں لگانا چاہیے۔

میں نے کنگ کالج کے پروفیسر سے [illegible] گمشدگی میں تیمور کا

ہاتھ ہے اگر ایسا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟"

وہ بولا "وجہ یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتے تھے۔ روز تو ہمیشہ سردار شنکر ہی جیتتا تھا لیکن وہ دونوں دوسرے تیسرے نمبر پر رہتے تھے۔ اس وجہ سے اُن میں کھینچا تانی بھی تھی۔ یہ کھینچا تانی اُس وقت اور بڑھ گئی جب گوبند نے تیمور کو کنگ کالج کی ایک لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھا۔ پبلک کالج کے لوفر عموماً کنگ کالج کی لڑکیوں کو تنگ کرتے رہتے ہیں لیکن یہ ہمت کبھی کسی کو نہیں تھی کہ یوں لڑکی کو چھاپ کر لے جائے۔ اس معاملے پر کافی لے دے ہوئی تھی اور تیمور کو اُس کالج سے نکال بھی دیا گیا تھا۔ بعد میں ماسٹر حیات نے منت سماجت کر کے بیٹے کو معافی دلائی تھی"۔

میں نے گوبند کے والد اور پروفیسر کے تمام الزامات دھیان سے سُنے اور اُنھیں چائے وغیرہ پلائی۔ اس دوران لڑکے ہانپتے کانپتے ہوئے تھانے پہنچ گئے اور انھوں نے بتایا کہ گوبند کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔ دوسری طرف تیمور بھی اپنے گھر سے غائب ہو گیا ہے۔ یہ معاملہ اب قدرے سنگین ہو گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر اپنے اے ایس آئی کو دو سپاہی دے کر بھیجا اور اُسے کہا کہ وہ تیمور کو تھانے لائے۔ کنگ کالج کے نئے آنے والے لڑکوں نے بتایا کہ نیگرا اگلی سے تقریباً دو فرلانگ پیچھے سڑک کے ساتھ ڈھلوان پر خون کے دھبّے ملے ہیں اور فلیٹ بوٹوں کے نشان بھی ہیں۔ یہ بے حد اہم اطلاع تھی۔

گوبند کے باپ کا رنگ سفید ہو گیا۔ وہ ہذیانی انداز میں بولنے لگا " اُس خونی نے میرے بیٹے کی ہتھیا کر دی ہے، اُس نے مار دیا ہے اُسے، وا ہگرو یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا، میں کیا منہ دکھاؤں گا گوبند کی ماں کو....." وہ مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ بدفال منہ سے نہ نکالے۔ کچھ نہیں ہوا

اُس کے بیٹے کو، ہم ابھی اُسے ڈھونڈنے نکلتے ہیں۔

جیپ پر سوار ہم نیگرا اگلی روانہ ہوئے۔ دو کاروں پر سوار کنگ کالج کے لڑکے بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ سب کے سب غصّے سے بھرے ہوئے تھے۔ اُن کے تیور دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ گوبند نہ ملا تو تیمور کو فوراً گرفتار کر لوں گا۔ ایسے موقعے پر اگر ملزم کو گرفتار نہ کیا جائے تو خود اُس کی جان کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ نیگرا اگلی تین میل کے فاصلے پر تھی۔ ہم کنگ کالج کی گراؤنڈ کے سامنے سے ہو کر گزرے۔ وہاں لڑکوں کا ہجوم تھا اور وہ ٹولیوں میں کھڑے چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ کنگ کالج سے نیگرا اگلی کا فاصلہ تقریباً دو ڈھائی فرلانگ تھا۔ اس کا مطلب تھا گوبند دوڑ کے آخری مرحلے میں غائب ہوا ہے۔

نیگرا اگلی کے بازار سے دو ڈھائی فرلانگ آگے نکل کر ہم نے گاڑیاں سڑک کے کنارے روک دیں۔ ایک طرف بلند و بالا پہاڑ تھا۔ دوسری طرف سینکڑوں فٹ گہری کھڈ تھی۔ بڑا خطرناک موڑ تھا۔ رات بارش ہوئی تھی اور اب بھی ہلکی بوندا باندی جاری تھی۔ سڑک گیلی تھی اور بالکل سیاہ نظر آ رہی تھی۔ سبزہ بھی دُھل دُھلا کر اپنے اصل رنگ روپ میں چمک رہا تھا۔ دُور نیچے دریا کا سفید پانی دکھائی دے رہا تھا۔ ہم سنبھل سنبھل کر کھڈ میں اُترے اور کوئی سو فٹ نیچے چیڑ اور دیودار کے گھنے درختوں میں پہنچ گئے۔ یہاں جگہ ذرا ہموار تھی لیکن اس سے آگے کھڈ ایک دم عمودی ہو گئی تھی اور وہاں کھڑے ہو کر کوئی پتھر گرایا جاتا تو وہ کہیں ٹکرائے بغیر سیدھا دریا میں جا گرتا۔ دیودار کے درختوں کے درمیان ایک جگہ چھوٹے چھوٹے پتھر رکھ کر کیاری سی بنا دی گئی تھی۔ یہ کیاری کنگ کالج کے لڑکوں نے بنائی تھی۔ کیاری کے درمیان خون کے دھبّے صاف نظر آ رہے تھے۔ کیاری کے پاس ہی تھوڑی سی جگہ

زمین تھی۔ وہاں مجھے فلیٹ بوٹ کے نشان صاف نظر آئے۔ صورت حال واقعی سنگین تھی۔ دوڑنے والوں میں سے ایک یا دو لڑکے یقیناً اس ڈھلوان پر پہنچے تھے اور اُن میں سے کوئی شدید زخمی بھی ہوا تھا۔ زخمی ہونے کے بعد وہ کہاں گیا؟ اس سوال کے یوں تو کئی جواب تھے لیکن ایک جواب شور مچاتا' اچھلتا کودتا دریا بھی دے رہا تھا۔ کسی کو مار کر ٹھکانے لگانے کے لیے یہ جگہ موزوں ترین تھی۔ دریا کی گزرگاہ یہاں بہت تنگ تھی اس لیے پانی گہرا ہو گیا تھا۔ ایک دو تو کیا درجنوں لاشیں پھینک دی جاتیں تو پانی اُن کا نام و نشان مٹا دیتا۔ اچھا ہوا تھا کہ گوبند کا باپ ہمارے ساتھ نہیں آیا۔ وہ اس خطرناک مقام پر خون کے یہ دھبے دیکھ لیتا تو یقیناً بے ہوش ہو جاتا۔

میں نے فوری طور پر جگہ کا نقشہ تیار کروایا اور اپنے ساتھ آنے والے عملے کو گمشدہ لڑکے کی تلاش پر لگا دیا۔ دریا میں ڈھونڈنا بالکل فضول تھا۔ یہاں پانی کا بہاؤ تیز تھا اور اگر وہ دریا میں گرا تھا تو اس کی لاش اب تک کئی میل آگے جا چکی تھی۔ میرے عملے کے ساتھ کنگ کالج کے لڑکے بھی تلاش میں شریک ہو گئے۔ ایک ایک جھاڑی ایک ایک کونہ دیکھا جانے لگا۔ مجھے جائے واردات پر عجیب طرح کا شبہ ہو رہا تھا۔ ایک جگہ مجھے شیشے کی کرچیاں بکھری نظر آئیں۔ ایک جگہ پلاسٹک کا ایک ناقابل شناخت ٹکڑا پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کسی گاڑی کا ٹوٹا ہوا بمپر ہو۔ پھر مجھے ایک گول شیشہ دکھائی دیا۔ یہ کسی دستی گھڑی کا تھا۔ سائز سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ زنانہ گھڑی کا شیشہ ہے۔ میں نے شیشہ صاف کر کے جیب میں رکھ لیا۔ تھوڑی دیر بعد میرا اے ایس آئی پلاسٹک کا ایک اور لمبوترا ٹکڑا لے آیا۔ یہ بھی کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ ان اشیاء کو دیکھ کر یہ شبہ ہو[illegible] تھا کہ شاید سڑک سے پھسلنے کے بعد کوئی گاڑی یہاں [illegible] اور گر[illegible]

سیدھی دریا میں چلی گئی ہے۔ یہ ایک خوفناک تصور تھا لیکن اس تصویر پر یقین کرنا آسان نہیں تھا۔ موقع دیکھ کر صاف اندازہ ہو جاتا تھا کہ سڑک سے لڑھکنے کے بعد کوئی چھوٹی موٹی گاڑی دریا میں نہیں گر سکتی۔ وجہ وہ تناور درخت تھے جو سڑک اور دریا کے درمیان حائل تھے۔ خدانخواستہ کوئی گاڑی سڑک سے لڑھکتی تو ستر اسی فٹ نیچے آ کر ان درختوں میں اٹک جاتی۔ اگر واقعی کوئی گاڑی آج سڑک سے پھسل کر گری تھی تو پھر وہ لازماً ان درختوں میں ہونی چاہئے تھی۔ مگر یہاں کسی گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ان حالات میں یہی سوچا جا سکتا تھا کہ موقعے سے ملنے والی مختلف چیزوں کی حیثیت کوڑے کرکٹ کی ہے اور یہ چیزیں پہلے سے یہاں پڑی ہوئی تھیں۔

دو ڈھائی گھنٹے کی تلاش کے باوجود گوبند کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہ بالکل سنسان جگہ تھی۔ نہ کوئی کھیت تھا نہ مکان، بس گھنے درخت تھے اور اُن پر شاخ شاخ جھولتے ہوئے بندر۔ ایسی جگہ کسی سے کیا بیان حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ہم موقعے کی تفصیل لے کر واپس تھانے آ گئے۔

میرا اے ایس آئی تیمور کو پکڑ لایا تھا۔ میں تھانے پہنچا تو تیمور پریشان چہرے کے ساتھ کمرے میں بیٹھا تھا۔ حراست میں لیتے ہوئے اے ایس آئی نے اس کی تھوڑی بہت پٹائی بھی کی تھی۔ اُس کا ایک گال سرخ ہو رہا تھا اور گریبان بھی پھٹا ہوا تھا۔ وہ انیس بیس سال کا نوجوان تھا۔ جسم مضبوط، پیشانی چوڑی اور شانے کشادہ تھے۔ معمولی لباس میں بھی وہ ٹھیک ٹھاک نظر آ رہا تھا۔ اگر کنگ کالج کی ایک لڑکی اس پر مرمٹی تھی تو یہ اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

اُس کا پورا نام تیمور احسن تھا۔ وہ ڈلہوزی کی مضافاتی آبادی ست دھا[illegible] کا رہنے والا تھا۔ اُس کا [illegible] لوگ اس سے

کپڑے سلانے کے لیے ہفتوں انتظار کرتے تھے۔
تیمور سے تعارف کے دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ایک بیمار ماں اور تین جوان بہنوں کا بھائی ہے اور اُس پر بہت سی ذمے داریاں ہیں۔ میں نے اس سے کہا "تمہیں گوبند کی گمشدگی کا پتہ ہے؟"
وہ اقرار میں سر ہلا کر بولا "جی ہاں! ریس کے بعد پتہ چلا تھا کہ وہ مل نہیں رہا"۔
میں نے کہا "اس کی گمشدگی کا الزام تم پر لگایا جا رہا ہے"۔
وہ کہنے لگا "مجھے پتہ چل گیا ہے جی، میں اس لیے گھر سے چلا گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کنگ کالج کے لڑکے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ مجھ پر سراسر جھوٹا الزام لگایا جا رہا ہے جی، مجھے گوبند کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ وہ آدھی ریس تک میرے ساتھ تھا۔ اس کے بعد تین چار اور لڑکے ہمارے ساتھ بھاگنے لگے۔ بعد میں اُس کا کچھ پتہ نہیں چلا"۔
میں نے کہا "سندر گاؤں تک تم اور گوبند ریس میں سب سے آگے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس دفعہ تمہارے اور ششیکر کے درمیان سخت مقابلہ ہوگا لیکن پھر تم دونوں مقابلے سے باہر ہو گئے۔ تم شاید انیسویں نمبر پر آئے ہو اور گوبند ابھی تک پہنچا ہی نہیں"۔
"میں گوبند کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں مجھے تو اپنا پتہ ہے۔ سندر گاؤں سے آگے دو میل کی چڑھائی ہے۔ اس چڑھائی پر کافی سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جو لڑکے پہلے آہستہ دوڑ رہے ہوتے ہیں وہ اس چڑھائی پر پہنچ کر زیادہ زور لگاتے ہیں اور اُن میں سے کئی لیڈ بھی لے جاتے ہیں۔ سردار ششیکر نے بھی چڑھائی پر "لیڈ" لی تھی۔ اس مرتبہ میں اس چڑھائی پر اپنا سانس قابو میں نہیں رکھ سکا اور پیچھے رہ گیا"۔
میں نے کہا "تم آنکھوں میں مرچیں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو۔ [illegible] کا انحصار تو تمہاری بات

پر یقین کر سکتا ہے۔ تین چار منٹ کی ہوتی تو مانی بھی جا سکتی تھی۔ تم پورے انیس منٹ لیٹ پہنچے ہو..... اور اٹھارہ کھلاڑی تم سے آگے نکلے ہیں"۔
وہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا۔ اس کا اصرار تھا کہ وہ ایک دم ہی نڈھال سا ہو گیا تھا اور پھر آگے تک سر توڑ کوشش کے باوجود اپنی رفتار تیز نہیں کر سکا۔ میں نے گوبند کے گھر سے اُس کے بوٹ منگوائے۔ بوٹوں کے تلوؤں پر وہی ڈیزائن تھا جس کا کھرا جائے وقوعہ کی کچی زمین سے ملا تھا لیکن اس ثبوت کی بنا پر تیمور کو مجرم قرار دینا مناسب نہیں تھا۔ دوڑ میں شامل درجنوں لڑکوں کے بوٹ اسی ڈیزائن کے ہوں گے۔ میں نے تیمور کو شاملِ تفتیش کر کے حراست میں لے لیا اور پھر اگلے روز کورٹ میں پیش کر کے اُس کا سات روزہ ریمانڈ حاصل کر لیا۔ اس کے علاوہ میں نے کنگ کالج اور پبلک کالج کے پرنسپل حضرات سے ملاقات کی اور انہیں وارننگ دی کہ وہ اپنے اپنے لڑکوں کو سنبھال کر رکھیں۔ گمشدہ لڑکے کی وجہ سے کسی طرح کا ہنگامہ کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو زیادہ جوشیلے لڑکوں کے ناموں کی لسٹ دے دیں تاکہ امن وامان کی خاطر انہیں ایک دو دن کے لیے پکڑ لیا جائے..... مجھے لڑکوں کے نام تو فراہم نہیں کیے گئے لیکن دونوں پرنسپل حضرات نے یقین دلایا کہ گڑبڑ نہیں ہوگی۔
اگلے روز شام کو تیمور کا والد بہت گھبرایا ہوا تھانے پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ محلے کے دو تین معتبر افراد بھی تھے۔ وہ دراصل شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اب آیا تھا تو بیٹے کی گرفتاری کی اطلاع ملی تھی۔ اور یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ اسے تھانے میں مارا پیٹا جا رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ جوانی میں وہ خود بھی دوڑ میں حصہ لیتا رہا ہے۔ اس زمانے میں سردار ششیکر کا والد [illegible] سردار [illegible] جوان تھا اور اس اٹھارہ میل کی

روڈ کا چیمپئن سمجھا جاتا تھا۔ ماسٹر حیات محمد، سردار اشوک کے اچھے حریفوں میں سے ایک تھا لیکن وہ کبھی سردار کو ہرا نہیں سکا۔ ایک طرح سے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ سردار اشوک کی جگہ شنکر نے اور ماسٹر حیات کی جگہ تیمور نے لے لی تھی۔ ماسٹر حیات کا والد تو معلوم نہیں اس "روڈ ریس" کے حق میں تھا یا نہیں لیکن ماسٹر حیات اپنے بیٹے کو اس شوق سے دُور رکھنا چاہتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ سرداروں کے ہوتے ہوئے اس روڈ میں جیتنا اور انعام حاصل کرنا ممکن ہی نہیں اور اگر ایسا ممکن ہوا بھی تو معلوم نہیں کب ہو..... اُسے فوری طور پر سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جوان بیٹا اس کا بازو بنے اور اُس کے ساتھ مل کر بہنوں کا بوجھ اُٹھائے۔ وہ میری منتیں سماجتیں کرنے لگا۔ "انسپکٹر صاحب! مجھ پر اتنا ظلم نہ کریں یہ لڑکا جسے آپ نے حوالات میں بند کیا ہے میری ساری زندگی کی پونجی ہے۔ مجھ سے یہ پونجی نہ چھینیں، ہم جیتے جی مر جائیں گے"۔

ماسٹر حیات مجھے بھلا آدمی نظر آ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر یقین نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک قاتل کا باپ ہے۔ بہرحال اتنی جلدی کوئی فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ خاص طور پر یہ بات ذہن میں بہت کھٹکتی تھی کہ تیمور ریس کے دوران کم از کم چودہ منٹ کے لیے کہیں اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ بہانہ بنا رہا تھا کہ وہ اچانک نڈھال ہو گیا تھا اور اس کی رفتار سست ہو گئی تھی وہ سراسر جھوٹ بول رہا تھا اور اس جھوٹ کو خود بھی محسوس کر رہا تھا۔

مجھے خون کی رپورٹ کا انتظار تھا۔ وقوعہ سے خون کا نمونہ حاصل کر کے تجزیے کے لیے لیبارٹری بھجوا دیا گیا تھا۔ اتفاق سے ہمیں گوبند کا خون گروپ معلوم ہو گیا تھا۔ لیبارٹری کی رپورٹ تصدیق کر سکتی تھی کہ یہ خون گوبند کا ہے یا نہیں۔ واردات کے چوتھے روز یہ رپورٹ موصول ہو گئی۔ اس رپورٹ کے مطابق نیلکا نگل کے قریب ڈھلوان پر پائے جانے والے خون کے دھبے گوبند کے نہیں تھے یہ بالکل مختلف گروپ کا خون تھا۔

یہ رپورٹ ملنے کے بعد جہاں گوبند کے وارثوں کو کچھ تسلی ہوئی وہاں تیمور کو ضمانت پر رہا کرنے کا جواز بھی پیدا ہو گیا۔ اگلے ہی روز میں نے اسے ضمانت پر رہا کر دیا..... گوبند کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ نہ ہی کہیں سے اُس کے بارے میں کوئی اطلاع آئی تھی۔ میں نے خود معلومات اکٹھی کیں۔ اُن سے پتہ چلا کہ گوبند اتنا اچھا اتھلیٹ بھی نہیں تھا جتنا اُس کے حمایتی بتا رہے تھے۔ وہ اس "کراس کنٹری ریس" میں اکثر آٹھویں دسویں نمبر پر آیا کرتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ گوبند اور تیمور میں "ریس" کی وجہ سے کوئی چپقلش تھی تو یہ بالکل غلط ہوگا۔ گوبند اور تیمور کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ تیمور کا اصل مقابلہ سردار شنکر سے تھا۔

دو تین ہفتے بعد ایک بار پھر ریس کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ اس مرتبہ یہ ریس پٹھانکوٹ میں ہو رہی تھی۔ وہاں موسم بہار کے اتھلیٹک مقابلے تھے۔ اردگرد کے کئی شہروں کی ٹیمیں حصہ لے رہی تھیں۔ اس ریس میں ایک بار پھر سردار شنکر تیمور کے مقابل تھا۔ پچھلے سال اس ریس میں شنکر دوسرے نمبر پر اور تیمور تیسرے نمبر پر رہا تھا۔ اس سال پہلے نمبر پر آنے والا لڑکا ان فٹ ہو گیا تھا اس لیے کنگ کالج کو پوری اُمید تھی کہ شنکر یہ گولڈ میڈل جیت جائے گا۔ دوسری طرف تیمور بھی پُر اُمید نظر آ رہا تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے تیاری کر رہا تھا اور اُس کا جوش و خروش دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ پچھلی ریس میں وہ جان بوجھ کر ہار گیا ہے۔ بلال شاہ کی زبانی پتہ چلا کہ کئی اور لوگ بھی یہی بات کہہ رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ تیمور کے ہارنے میں کوئی راز ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تیمور کے اپنے علاقے کے لوگوں میں جوش و خروش پایا جاتا ہے۔

ایک طرح سے یہ کنگ کالج اور پبلک کالج کا مقابلہ بن چکا تھا۔ کنگ کالج کے حمایتی ظاہر ہے "ہائی جنٹری" کے لوگ تھے۔ دوسری طرف پبلک کالج اور تیمور کے چاہنے والے درمیانی اور غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑی گرما گرمی کا ماحول تھا۔ ایک روز مجھے پتہ چلا کہ تیمور کے والد نے ناراض ہو کر اُسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تیمور بار بار سرداروں سے مقابلہ کرے اور ہار کر ذلیل ہو۔ گھر سے نکل کر تیمور اپنے پرستاروں میں اور مقبول ہو گیا تھا۔ وہ اُسے کندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے پھرتے تھے۔ ہر طرح اس کے ناز اُٹھا رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کر رہے تھے کہ باپ بیٹے میں صلح ہو جائے ..... باپ نے سوچا ہو گا کہ گھر سے نکل کر اور بھوکے پیٹ سڑکوں پر سو کر بیٹے کی عقل ٹھکانے آ جائے گی لیکن نتیجہ بالکل اُلٹ نکلا۔ آخر باپ بیٹے میں صلح ہو گئی۔

یہ پٹھانکوٹ میں ہونے والی ریس سے چھ یا سات روز پہلے کی بات ہے۔ میں تھانے میں بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا کہ ایک برقعہ پوش عورت بہت گھبرائی ہوئی سی تھانے میں داخل ہوئی۔ اس نے ٹوپی والا دیسی برقعہ پہن رکھا تھا۔ ایسے برقعوں میں آنکھوں کی جگہ ایک جالی سی ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں چہرہ سب کچھ چھپا رہتا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ کوئی ادھیڑ عمر عورت اپنی پریشانی لے کر آئی ہے۔ مگر جب "عورت" بولی تو مجھے شدید جھٹکا لگا۔ وہ کھنک دار آواز والی ایک نوعمر لڑکی تھی اور خاصی پڑھی لکھی محسوس ہوتی تھی۔ لرزاں آواز میں کہنے لگی۔

"انسپکٹر صاحب! پلیز آپ تیمور کو بچا لیں۔ میرے بھائی..... میرے بھائی غصے میں بھرے ہوئے اس کی طرف گئے ہیں وہ اُسے قتل کر دیں گے"۔

لڑکی کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں چونک کر رہ گیا۔ مجھے فوراً [illegible] بات یاد آ گئی۔

اس نے کہا تھا کہ تیمور کا کنگ کالج کی ایک لڑکی سے چکر ہے اور وہ اکثر آپس میں ملتے ہیں۔ بلال شاہ نے لڑکی کا نام انجم بتایا تھا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔

"تم انجم تو نہیں ہو" وہ ذرا ٹھٹکی، پھر اقرار میں سر ہلانے لگی۔

"جی ہاں میرا نام انجم ہے۔ میں کنگ کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہوں' تیمور..... اور میں ..... میرا مطلب ہے ہم..... ایک دوسرے کے اچھے دوست ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اُسے کوئی نقصان پہنچے یا اس کی وجہ سے میرے بھائی مجرم بنیں..... پلیز آپ انہیں لڑنے سے روک لیجئے" بڑے بے باک لہجے میں بات کر رہی تھی وہ۔

معاملہ یقیناً سنگین تھا۔ اگر سنگین نہ ہوتا تو انجم اس طرح تھانے میں بھاگی نہ آتی۔ تھانے اور ہسپتال کا رُخ لوگ اسی وقت کرتے ہیں جب پانی سر سے گزر چکا ہو۔ میں نے انجم سے تفصیل پوچھی۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے دو جڑواں بھائی ہیں۔ وہ دو تین سال سے انگلینڈ میں کاروبار کر رہے ہیں۔ دو ہفتے پہلے وہ واپس آئے ہیں۔ کسی نے تیمور کے خلاف اُن کے کان بھر دیے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے مجھے بُری طرح مارا ہے اور اب غصے میں بھرے ہوئے "مست دھارا" کی طرف چلے گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے وہ تیمور کو بھی بُری طرح ماریں گے....."

باتوں کے دوران لڑکی نے چہرے سے برقعہ ہٹا لیا تھا۔ وہ خاصی بلکہ خطرناک حد تک خوبصورت تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس معاملے کو خود دیکھا جائے۔ تھانے میں جیپ موجود تھی۔ بلال شاہ کو تیمور کے گھر کا پتہ تھا۔ میں نے بلال شاہ کے علاوہ دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور مست دھارا کی طرف روانہ ہو گیا۔ انجم نے بتایا تھا کہ اس کے بھائی کے پاس [illegible] سرخ موڑس [illegible] "ممی" بھی ان کے ساتھ

ہے۔ "شاہی" کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ دنگے فساد اور مار دھاڑ میں اس کا بڑا نام تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ شاہی "سرداروں" کا پالتو کتا ہے۔

ست دھارا کی طرف ابھی ہم نے دو تہائی فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک منظر دیکھ کر ہمیں رُکنا پڑا۔ ہمارے ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف وادی تھی۔ وادی میں دُور نیچے ایک جگہ لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ اردگرد کے مکانوں سے لوگ نکل کر تیزی سے ہجوم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یقیناً کوئی خاص واقعہ ہو گیا تھا۔ ہماری گاڑی دیکھ کر کئی لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں نیچے بلانے لگے۔ ہم نے ایک کانسٹیبل اور ڈرائیور کو گاڑی میں چھوڑا اور خود نیچے اُترنے لگے۔ چند افراد نے بتایا کہ "شاہی" نے دو لڑکوں کو مار مار کر ادھ موا کر دیا ہے۔ وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ ہم تیزی سے ڈھلوان طے کر کے موقعے پر پہنچے۔ میرے سامنے تیمور خون میں لت پت بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے ساتھی لڑکے کو لوگ اٹھا کر چارپائی پر ڈال رہے تھے۔ وہ بھی شدید زخمی تھا۔ اُس کا سر پھٹا ہوا تھا اور پہلو سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ میں نے جھک کر تیمور کا معائنہ کیا وہ بظاہر مُردہ نظر آتا تھا لیکن سانس چل رہی تھی اور نبض بھی ابھی ڈوبی نہیں تھی۔ اپنے زخمی ساتھی کی طرح تیمور بھی نیکر اور بنیان میں تھا۔ پاؤں میں شوز تھے۔ وہ ساتھی کے ہمراہ مشق کے لیے نکلا ہوا تھا کہ دھر لیا گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مقامی لوگ ایک اور چارپائی لے آئے۔ افراتفری میں تیمور کو بھی چارپائی پر ڈالا گیا۔ جب اُسے چارپائی پر ڈالا جا رہا تھا میری نگاہ اُس کی خون آلود ٹانگ پر پڑی اور میں بُری طرح لرز گیا۔ تیمور کی بائیں ٹانگ پنڈلی پر سے ٹوٹی ہوئی تھی اور ایسی بُری طرح ٹوٹی ہوئی تھی کہ ٹوٹ کر [illegible] پہلے گئی تھی۔۔۔۔ ہم نے دونوں زخمیوں کو حتی الامکان جلدی

سے سڑک تک پہنچایا اور جیپ میں ڈال کر سول ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔

بروقت طبی امداد ملنے سے دونوں لڑکوں کی جان بچ گئی۔ تاہم تیمور کی ٹانگ تقریباً ناکارہ ہو گئی۔ پنڈلی کی دونوں ہڈیاں چکنا چور ہو گئی تھیں۔ شاہی اور انجم کے بھائیوں نے اُسے زمین پر لٹا کر اور باقاعدہ جکڑ کر ٹانگ پر بندوق کے آہنی کندے سے ضربیں لگائی تھیں۔ ڈاکٹر نے ایک بڑے آپریشن کے بعد ہڈیاں جوڑ کر پلاسٹر چڑھا دیا اور زخموں پر ٹانکے لگا دیے۔ تیمور کے ساتھی پر تلوار سے وار کیا گیا تھا۔ اس کے پہلو پر گہرا زخم آیا تھا اور بہت سا خون راستے میں ضائع ہو گیا تھا۔ قسمت اچھی تھی جو وہ بچ گیا۔ اُسے بلال شاہ نے خون دیا تھا۔ شاید اس کے بچ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُسے "بلال شاہ" کا خون لگا تھا...... وہ روڑیوں اور دودھ جلیبیوں سے بنا ہوا خون تھا۔ کچھ نہ کچھ تو کرامت دکھانی تھی اس نے۔ ہاں اس خون سے محروم ہو کر بلال شاہ کی حالت بہت پتلی ہو گئی تھی۔ صرف ایک بوتل خون دیا تھا اُس نے مگر یوں لگتا تھا کہ ایک خون کے علاوہ باقی سارا اُس میں سے نکال لیا گیا ہے۔

اس واردات کے سلسلے میں کوئی بھی گواہی دینے کو تیار نہیں تھا۔ "شاہی" سے ٹکر لینے کی ہمت بھلا کون کر سکتا تھا۔ شاہی ایک کشمیری ڈوگرا تھا۔ سنا تھا فوج سے بھاگا ہوا ہے۔ اُس کے پاس رائفل کے علاوہ ہر وقت ایک تلوار بھی رہتی تھی۔ مشہور تھا کہ بڑا زبردست تلوار زن ہے اور چار چار تلوار بازوں سے بیک وقت مقابلہ کرتا ہے۔ وہ سردار اشوک کا ملازم تھا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی کہ چشم دید گواہ ہونے کا دعویٰ کرتا حالانکہ درجنوں لوگوں نے یہ خونی واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مجھے جو تفصیلات معلوم ہوئیں (یعنی جو کچھ تیمور اور اس کے ساتھی نے بتایا) اُن سے پتہ چلا کہ [illegible] شاہی [illegible] ہاتھ [illegible] تیمور کے

گھر گئے تھے۔ وہاں سے انہیں پتہ چلا کہ تیمور روڈ کے لباس میں صدر کی طرف گیا ہے۔ وہ واپس چل دیے۔ انہیں معلوم تھا کہ تیمور کسی بھی راستے جائے ست دھارا نالے کے پل سے ضرور گزرے گا۔ انہوں نے اپنی سرخ گاڑی اوپر سڑک پر کھڑی کی اور پل کے قریب درختوں میں منڈلانے لگے۔ جونہی تیمور اور اس کے ساتھی انعام خان پل پر نمودار ہوئے انہوں نے تیمور کو دبوچ لیا۔ انہوں نے اُسے غلیظ گالیاں دیں اور بُری طرح مارنے لگے۔ انعام خاں نے دوست کو بچانے کی کوشش کی تو اُسے بھی تھپڑ مارے گئے اور بھاگ جانے کا مشورہ دیا گیا لیکن وہ ڈٹ گیا تو شاہی نے طیش میں آکر اُسے ٹھوکر گھونپ دی اور لات مار کر نشیب میں پھینک دیا۔ تیمور کو انجم کے بھائیوں نے نیچے گرا کر دبوچ لیا اور شاہی نے بندوق کے وزنی کندے سے پے در پے ضربیں لگا کر اس کی ٹانگ توڑ دی۔ وہ بیچارا بُری طرح چیختا چلاتا رہا لیکن کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ یہاں تک کہ زخموں کی تاب نہ لاکر وہ بے ہوش ہوگیا۔ بے ہوشی کے بعد بھی وہ اُسے مارتے رہے۔ غالباً اُن کا ارادہ اُسے جان سے مار دینے کا تھا۔

انجم اور مضروبین کے بیان کے بعد ضروری تھا کہ انجم کے بھائیوں اور شاہی کو گرفتار کروں مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ وہ تینوں اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کرا چکے تھے۔

کھلاڑی جسمانی طور پر معذور ہو جائے تو اس کی دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ تیمور کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ اس کے تمام خواب اس کی پنڈلی کے ساتھ ہی چکنا چور ہو گئے۔ کچھ روز پہلے وہ لوگوں کے کندھوں پر سوار تھا اور اس کی آنکھوں میں کامرانی کے سپنے سجے ہوئے تھے۔ اب وہ ایک پر کٹے پرندے کی طرح [illegible] رہا تھا۔ [illegible] اس [illegible] کے بغیر [illegible]

اور ظاہر ہے اس کا فاتح شمشیر ہی تھا۔

میں "شاہی" اور انجم کے بھائیوں کو پکڑنا چاہتا تھا لیکن یہ بات بھی مجھے معلوم تھی کہ جب تک سرداروں کی مرضی نہ ہوگی میں ان پر ہاتھ نہ ڈال سکوں گا۔ سردار اشوک رائے کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی کو غیر قانونی فعل میں ملوث نہیں ہونے دیتا..... حالانکہ سردار اشوک کے ملازم شاہی نے تیمور کو مارا تھا اس کے باوجود اکثر لوگ سردار اشوک کو اس معاملے میں ملوث نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ شاہی کا ذاتی فعل ہے۔ اس نے انجم کے بھائیوں سے رقم وغیرہ لے کر یہ کام کیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس بارے میں سردار اشوک سے ملاقات کرنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حد تک قانون پسند شخص ہے۔ ایک روز میں سادہ لباس میں سرداروں کی شاندار رہائش گاہ پر جا پہنچا۔ بہت بڑے آہنی گیٹ کے سامنے مسلح چوکیدار نے میرا استقبال کیا۔ اپنے مالک کی طرح وہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اندر اطلاع پہنچائی اور تھوڑی دیر بعد میں سردار اشوک رائے کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں اشوک رائے کے سامنے بیٹھا تھا۔ اشوک رائے ہمیشہ سفید لباس پہنتا تھا جیسا میں نے بتایا کہ انگریز افسروں جیسی رعب دار شخصیت تھی۔ سردار کے عقب میں کارنس پر کئی چھوٹی بڑی ٹرافیاں اور تصویریں آویزاں تھیں۔ اس قسم کی ٹرافیاں اور فریم شدہ فوٹوگراف پورے ڈرائنگ روم میں نظر آرہے تھے۔ یہ پچھلے تیس چالیس برسوں کی تاریخ تھی اور اس تاریخ سے پتہ چلتا تھا کہ سرداروں کی نیلی ہمیشہ ہونہار اتھلیٹ پیدا کرتی رہی ہے۔

رسمی گفتگو کے بعد میں نے شاہی کا ذکر چھیڑا اور بتایا کہ میں نے گرفتاری سے بچنے کے لیے ضمانت قبل از گرفتاری [illegible] ہے [illegible] میں عدالت سے

سیارہ ڈائجسٹ کی حسبِ روایت ایک اور عظیم پیشکش
والدین نمبر
شائع ہو گیا ہے۔
ایک تاریخی دستاویز جو انشاء اللہ یقیناً ہر گھر کی کامیابی اور فلاح کا ذریعہ بنے گی۔
جس میں قرآن اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں:
والدین کے فضائل، آداب، حقوق، فرائض اور ان کے شایانِ شان مستند مواد اور محکم استنباط پر مبنی واقعات اور دیگر مواد کو یکجا کر دیا گیا ہے۔
قیمت: 160 روپے
خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھائیے
ہر گھر میں پیار و محبت کی تحریک کا آغاز کیجیے
سیارہ ڈائجسٹ۔ 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور
فون: 042-37245412

منسوخ کرانا چاہتا ہوں۔

سردار اشوک نے کہا ”مجھے معلوم تھا تم مجھ سے اس سلسلے میں ملو گے۔ ضمانت قبل از گرفتاری کرانا آج کل آسان نہیں ہے اور یقیناً تمہارا خیال ہوگا کہ یہ ضمانت میں نے کروائی ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اس معاملے میں پڑا ہوں اور نہ پڑوں گا“۔

میں نے کہا ”سردار صاحب! مجھے معلوم ہے. آپ کسی مجرم کی پشت پناہی نہیں کرسکتے یہی وجہ ہے کہ میں نے آپ سے یوں کھل کر بات کی ہے“۔

وہ بولا ”ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ شک کر رہے ہوں۔ تیمور میرے بیٹے کا حریف ہے اور ہر دوڑ میں اُن دونوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے ذہن میں آسکتا تھا کہ میں نے تیمور کو مقابلوں سے خارج کرنے کے لیے اُس کی ٹانگ تڑوا دی ہے تم اس معاملے میں کھل کر تحقیق کرو اور شاہی سمیت کسی بھی شخص سے رعایت نہ کرو۔ جو بھی سچ ہے وہ سامنے آجائے گا“۔

سردار اشوک رائے سے مل کر میرا ذہن صاف ہوگیا اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ شاہی کو ضرور گرفتار کروں گا۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک دو بار من مانی کرچکا تھا اور لوگوں سے کہتا پھرتا تھا کہ وہ کسی تھانے کچہری کو نہیں مانتا۔ اُس کے لیے سب کچھ سردار اشوک رائے ہے۔

لڑکوں کو زخمی کرنے کے بعد انجم کے جڑواں بھائی تو کہیں غائب ہوچکے تھے تاہم شاہی ڈلہوزی میں ہی دندناتا پھرتا تھا۔ میں نے اُسے گرفتار کرنے کا پروگرام بنایا۔ گرفتاری کے لیے اس کی ضمانت منسوخ کرانا ضروری تھی۔ میں عدالت سے رجوع کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ صورت حال اچانک تبدیل ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ فریقین میں صلح ہوگئی ہے۔ تیمور اور انعام کے ملنشوں نے ملزموں کو معاف کردیا ہے۔ بدلے میں لڑکوں کے علاج معالجے کے لیے اُن کے والدین کو بھاری رقم دے دی گئی ہے۔ دونوں لڑکے غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور ایسے گھر اپنی ضرورتوں کے غلام ہوتے ہیں۔ ان کی مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے انجم کے گھر والوں نے دولت کا سہارا لیا تھا اور یہ معاملہ رفع دفع کرادیا تھا۔ انجم کے بھائی تو پہلے ہی غائب ہوچکے تھے۔ اب انجم کو بھی ڈلہوزی سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ یہ جسمانی ضرر کا کیس تھا اور قابل راضی نامہ نہیں تھا۔ میں چاہتا تو اب بھی قانونی کارروائی کرسکتا تھا مگر جب مدعی ہی سست پڑ گئے تھے تو کیس سے جان نہ نکلتی تو کیا ہوتا۔

پندرہ بیس روز ہسپتال میں رہنے کے بعد تیمور واپس ڈلہوزی کی پرانی آبادی میں اپنے گھر آگیا۔ اب وہ ایک بدلا ہوا تیمور تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں بیساکھیاں تھیں اور چہرے پر ہمیشہ کی شکست لکھی ہوئی تھی...... پھر ایک روز مجھے بلال شاہ کی زبانی پتہ چلا کہ تیمور نشہ کرنے لگا ہے اور باپ سے اس کا جھگڑا ہوا ہے...... اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً تیمور کی بے راہروی اور گھر والوں سے اس کے لڑائی جھگڑے کی خبریں ملتی رہیں۔ آخر ایک دن یہ خبر ملی کہ باپ نے اُسے گھر سے نکال دیا ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی اُسے گھر نکالا گیا تھا مگر اُس وقت حالات مختلف تھے۔ اُس کے پرستاروں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اُسے مقابلے کے لیے تیار کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا تھا۔ اب وہ ایک بدنصیب نوجوان تھا جس کے سامنے تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ تاریکی میں تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ تیمور کے چاہنے والے بھی ایک ایک کرکے پیچھے ہٹ چکے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ اس کی بڑھتی ہوئی بے راہروی دیکھ کر دور ہوگئے تھے۔ تیمور اب ایک بالکل بدلا ہوا لڑکا تھا۔ ایک روز تھانے سے کسی کام کے

لیے "ست دھارا" جاتے ہوئے میں نے اُسے ایک بازار میں دیکھا۔ وہ ایک دکان کے تھڑے کے نیچے اوندھا پڑا تھا۔ لباس کی جگہ جسم پر چیتھڑے تھے اور منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ شاید میں تو اُسے پہچان بھی نہ پاتا۔ میرے ایک کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ یہ ماسٹر حیات کا لڑکا تیمور ہے۔ میری نگاہوں میں پانچ چھ ماہ پہلے کا وہ صحت مند اتھلیٹ گھوم گیا جو معمولی سے لباس میں بھی ہیرے کی طرح چمک رہا تھا اور بڑی شان سے میرے دفتر میں کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ جیسے حوالاتی نہ ہو کوئی فلمی ہیرو ہو۔ آج وہ گندی نالی کے کنارے ایک حقیر کیڑے کی طرح پڑا تھا۔ اُس کی حالت پر مجھے ترس آیا۔ میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن ایک بات کا مجھے پورا یقین تھا وہ ارادے کا بہت مضبوط لڑکا تھا۔ یہ اس کے ارادے کی مضبوطی ہی تھی کہ شمشیر سے مسلسل ہارنے کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری تھی اور نا تک سے معذور ہونے تک اُس کے مقابلے میں ڈٹا رہا تھا۔ اُس کے ارادے کی مضبوطی کا دوسرا ثبوت مجھے گوبند کی گمشدگی والے معاملے میں ملا تھا۔ میں نے تیمور کو کئی روز حوالات میں بند رکھا تھا اور اُس سے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ ریس کے دوران وہ پندرہ بیس منٹ کے لیے اوجھل کیوں ہو گیا تھا۔ میری انتہائی کوشش کے باوجود تیمور نے زبان کا تالا نہیں کھولا تھا حالانکہ مجھے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بہتری کے لیے نہیں، کسی دوسرے کی بہتری کے لیے خاموش ہے۔ حوالات میں پوچھ گچھ کے دوران بہت کم ملزم اتنی مضبوطی سے اپنے ارادے پر قائم رہ سکتے ہیں...... اب وہی مضبوط ارادے والا نوجوان حالات کی تیز ہوا میں راکھ کے ڈھیر کی طرح دکھائی دے رہا تھا...... میں اور میرے کانسٹیبل ایک جانب کھڑے تیمور کا جائزہ لے رہے تھے کہ ایک عجیب شور کے ساتھ دو گاڑیاں بازار میں داخل ہوئیں۔ یہ بغیر چھت کے کاریں تھیں۔ کوئی پندرہ بیس لڑکے لڑکیاں ان پر لدے ہوئے تھے۔ یہ سب کنگ کالج کے طلباء تھے۔ وہ اکثر اسی طرح ڈلہوزی کی سڑکوں پر ہلا گلا کرتے رہتے تھے۔ دونوں کاریں تیمور کے قریب آ کر اچانک رُک گئیں۔ اگلی کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر انیس بیس سالہ سردار شمشیر بیٹھا تھا۔ اس کے گلے میں سونے کا لاکٹ تھا۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا اور گھونگھریالے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اُس کے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکی کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ انجم تھی۔ ایک دفعہ تھانے میں میری اس سے ملاقات ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ ٹوپی والا برقعہ پہن کر آئی تھی۔ اور میں صرف اُس کا چہرہ ہی دیکھ سکا تھا۔ اب وہ سرتاپا نظر آ رہی تھی۔ لمبے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ دوپٹہ رسّی کی طرح گلے سے لپٹا ہوا تھا اور جرسی کی آستینیں کہنیوں سے اوپر تک اڑسی ہوئی تھیں۔ میں اور کانسٹیبل تیمور سے کافی دُور کھڑے تھے اور ویسے بھی ایک سائیڈ پر تھے۔ کار سواروں میں سے کسی کی نظر ہم پر نہیں پڑ سکی۔ وہ کچھ دیر تیمور کے قریب رُک کر ہارن بجاتے اور ہنسی مذاق کرتے رہے۔ پھر سڑک پر ٹائروں کے نشان چھوڑتے اور گاڑیاں لہراتے ہوئے آگے نکل گئے۔

یہ منظر مجھے سوچنے کی دعوت دے رہا تھا۔ کنگ کالج کے لڑکوں لڑکیوں کا تیمور سے ٹھٹھا کرنا تو سمجھ میں آتا تھا مگر تیمور کی محبوبہ کا سردار شمشیر کے پہلو میں پایا جانا حیران کن تھا۔ یہ انجم ہی تھی جس کی وجہ سے تیمور اس حال کو پہنچا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس کے زخموں پر مرہم رکھتی اور اس پر ہونے والی زیادتی کی تلافی کا سوچتی وہ سردار شمشیر کے پہلو میں بیٹھ کر اس کا تماشا بنتے دیکھ رہی تھی۔ وہ کالج کی عام جذباتی لڑکیوں کی طرح بے وفائی پر اتر آئی تھی یا پھر

یہ کوئی اور معاملہ تھا؟ میں نے سوچا کہ تیمور کے دوست انعام خاں سے اس بارے میں پوچھنا چاہیے۔ یہ وہی انعام خاں تھا جو تیمور کے ساتھ زخمی ہوا تھا۔ اب وہ صحت یاب ہو کر گھر آچکا تھا۔ وہ تیمور کے بہت قریب رہا تھا لہٰذا اس سے مل کر "انجم" والی اُلجھن دُور ہو سکتی تھی۔

میں نے اُسی روز شام کے بعد اُسے تھانے بلالیا۔ میں ایک دو گھنٹے کے لیے فارغ تھا اس لیے انعام خاں سے اطمینان کے ساتھ گفتگو ہو سکتی تھی۔ میں نے اُسے سات بجے تھانے بلایا تھا۔ وہ پورے سات بجے ہی پہنچ گیا۔

میں نے کہا "بھئی! وقت کے بہت پابند ہو تم"۔

بلال شاہ قریب ہی بیٹھا تھا، فوراً چہکا "آخر خون کس کا ہے جناب"۔

میں نے کہا "اگر خون کی بات ہوتی تو یہ آٹھ بجے سے پہلے نہ پہنچتا اور آتے ساتھ ہی ایک سو ایک بہانے بنا دیتا کہ اتنی دیر کیوں ہوئی ہے"۔

انعام خاں مسکرا کر بولا "آپ کچھ بھی کہیں جناب، میں تو دل و جان سے شاہ صاحب کا احسان مند ہوں۔ انہوں نے خود بیمار ہونے کے باوجود مجھے خون دیا۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے"۔

میں نے کہا "تم سے کس نے کہا ہے کہ یہ بیمار تھا"۔

وہ بولا "میں اُس وقت نیم بے ہوش تھا۔ شاہ صاحب کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ یہ کہہ رہے تھے کہ مجھے تین چار روز سے بخار ہے"۔

میں نے کہا "اس نے تو اور بھی کئی بہانے بنائے تھے۔ بہرحال اس بات کو چھوڑو۔ تمہارا اب کیا حال ہے؟"

میں نے جملے کا پہلا حصہ بڑی آہستگی سے ادا کیا تھا لہٰذا بلال شاہ کو کچھ سنائی نہیں دیا (اس کے ایک کان کی سماعت بہت کمزور تھی) اگر وہ سن لیتا تو وہیں پانی بہت کا [illegible] جاتا تھا۔ پھر [illegible]

کو پڑ ہی گئی تھی۔ وہ تھک کر بولا۔

"خان صاحب! کیا کہا ہے جی پہلے آپ نے؟"

"تمہاری بات نہیں کی ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا "تم جاؤ سنتری سے چائے کا کہہ دو"۔

"چائے..... چائے میرے لیے تو نہ منگوائیں جناب" انعام خاں نے عاجزی سے کہا "ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے"۔ بلال شاہ اُٹھتے اُٹھتے پھر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا "دیکھ لو شاہ جی! اگر تمہارے خون کا اثر ہوتا تو یہ چائے سے انکار کرتا؟ جان پر بھی کھیلنا پڑتا تو کھیلتا لیکن چائے ضرور پیتا"۔

بلال شاہ نے منہ بنایا اور اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ تنہائی میں انعام خاں سے کھل کر بات ہو سکے۔ میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

"تیمور کو تم کب سے جانتے ہو؟"

"بچپن سے جناب، ہم پرائمری سکول، ہائی سکول اور کالج میں ایک ساتھ رہے ہیں"۔

"تمہارے خیال میں وہ کیسا لڑکا ہے؟"

"وہ میرا دوست ہے جناب، مجھے اس کی تعریف ہی کرنی چاہیے لیکن میں جو تعریف کر رہا ہوں وہ بالکل غیر جانبداری سے کر رہا ہوں۔ وہ دل کا نیک لڑکا تھا۔ کسی سے دشمنی نہیں رکھتا تھا۔ اگر کسی کی کوئی بات ناپسند ہوتی منہ پر کہہ دیتا تھا۔ اپنی غلطی ہوتی تھی تو معافی مانگ لیتا تھا۔ اُسے معلوم تھا گھر میں جوان بہنیں بیٹھی ہیں۔ والدہ بیمار ہے اور گھر کا بوجھ باپ کے بوڑھے کندھوں پر ہے۔ وہ اپنے گھر کے سارے دُکھ جانتا تھا اور انہیں دُور کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی فرق تھا تو وہ سوچ کا تھا۔ باپ کی سوچ یہ تھی کہ بیٹا ملازمت کرے یا دوکانداری سنبھالے جبکہ تیمور کے لیے کھیل کا میدان ہی سب کچھ تھا۔ وہ اس میدان میں نام پیدا نہ کرتا اور پیسہ نہ کماتا۔ وہ صرف سالانہ [illegible] ہی جیت [illegible] تا [illegible] ان کی [illegible] ہی گھر لیے پریشانیاں۔

دُور ہو سکتی تھیں...... پتہ نہیں اللہ کو کیا منظور تھا وہ اس دفعہ "فیورٹ" ہونے کے باوجود ریس نہ جیت سکا"۔

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا "کسی اور کو معلوم نہ ہو تو دوسری بات ہے لیکن تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے وہ ریس کیوں نہیں جیتا"۔

میرے چبھتے لہجے کو محسوس کر کے انعام خاں نے اپنا زخمی پہلو سہلایا اور گہری سانس لے کر بولا "انسپکٹر صاحب! چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی۔ میں اس لائق نہیں کہ آپ کے قانونی معاملات میں دخل دُوں لیکن ایک بات میں پورے یقین ایمان سے کہہ سکتا ہوں۔ گوبند کے قتل یا اُس کی گمشدگی میں تیمور کا کوئی ہاتھ نہیں۔ وہ ایسا لڑکا نہیں کہ کسی کو نقصان پہنچا سکے...... ہاں آپ کی اس بات سے مجھے بھی اتفاق ہے کہ سالانہ ریس میں اس کے ہارنے کی کوئی خاص وجہ ہے۔ دوسروں کی طرح میں نے بھی جاننے کی بہت کوشش کی ہے مگر وہ اس بارے میں بالکل خاموش رہا ہے اور اب تو اُسے ویسے ہی چپ لگ چکی ہے۔ نشے نے اُسے اس قابل چھوڑا ہی نہیں کہ وہ کسی سے کوئی ڈھنگ کی بات کر سکے"۔

میں نے کہا "یعنی تم بھی یہ بات مانتے ہو کہ اس ریس کے دوران کوئی گڑبڑ ہوئی تھی"۔

"بالکل جناب! کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تیمور کو جان بوجھ کر ہرایا گیا ہے اور ہرایا ہی نہیں گیا ڈرا دھمکا کر اس کی زبان بھی بند کردی گئی ہے کہ وہ کسی کے سامنے اپنا رونا نہ رو سکے"۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "اچھا ایک بات بتاؤ اور پوری سچائی سے بتانا، انجم سے تیمور کا میل جول کب شروع ہوا تھا؟"

وہ بولا "یہ دو ڈھائی سال پہلے کی بات ہے پہل انجم کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔ وہ گنگا کالج میں پڑھتی تھی صاف ستھرا [illegible] شاعر گھرانے کی لڑکی [illegible] تیمور میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اُس سے میل جول بڑھاتا۔ وہ خود ہی اس کوشش میں لگی رہی اور آخر کامیاب ہوئی۔ وہ تیمور سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی اور......" کچھ کہتے کہتے وہ چپ ہو گیا۔

میں نے کہا "پوری بات کرنی چاہیے یا خاموش رہنا چاہئے"۔

وہ بولا "میں یہی کہہ رہا تھا کہ وہ تیمور سے بے پناہ محبت کرتی تھی اب بھی کرتی ہے اور...... شاید ہمیشہ کرتی رہے"۔

"لیکن میں نے تو اُسے کل اور ہی ڈھنگ میں دیکھا ہے"۔

"کیا مطلب ہے جناب؟"

"مطلب یہ ہے کہ وہ سردار شمشیر کی گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور گنگا کالج کے لڑکیاں لڑکے ہلا گلا کرتے اُن کے ساتھ جا رہے تھے"۔

انعام خاں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بولا "جناب! جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ سچ نہیں اور جو سچ ہے وہ نظر نہیں آ رہا"۔

میں نے کہا "وہی سچ جاننے کے لیے تو میں نے تمہیں بلایا ہے"۔

تھوڑی سی کشمکش اور تھوڑے سے تذبذب کے بعد انعام خاں اس "سچ" سے پردہ اُٹھانے پر آمادہ ہو گیا۔ اُس نے انجم اور تیمور کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ مختصر الفاظ میں یوں ہے۔

"چھ ماہ پہلے ہونے والی سالانہ ریس میں ہارنے کے بعد تیمور کافی دل برداشتہ تھا۔ اُس وقت اُسے سہارا دینے والی انجم تھی اور اُس کے وہ تمام پرستار تھے جو کئی برسوں سے اُس کے جیتنے کی دُعائیں مانگ رہے تھے۔ ان میں "ست دھارا" کے مکین بھی تھے اور اردگرد کی غریب آبادیوں کے لوگ بھی۔ وہ سب [illegible] تیمور کی حوصلہ افزائی کرنے لگے اور

جب تیمور کے والد نے اُسے گھر سے نکالا تو وہ سراپا احتجاج بن گئے۔ مجبوراً ماسٹر حیات کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ انہی دنوں کی بات ہے ایک روز انجم تیمور سے ملنے کے لیے ست دھارا آئی۔ وہ دونوں ایک چشمے کے پاس راز و نیاز میں مصروف تھے کہ ششیکھر نے انھیں دیکھ لیا۔ درحقیقت وہ انجم کا تعاقب کرتے ہوئے ہی وہاں تک پہنچا تھا۔ انجم اور تیمور کو ایک ساتھ دیکھ کر اس نے تیمور کا مذاق اُڑایا اور کہا تُو ایک ہارا ہوا لڑکا کس منہ سے کنگ کالج کی سب سے خوبصورت لڑکی کو فتح کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ یہ طعنہ تیر کی مانند تیمور کے دل میں پیوست ہو گیا۔ تیمور اور ششیکھر میں تلخ کلامی ہوئی اور ششیکھر تیمور کو طنزیہ فقروں کا نشانہ بناتے ہوئے واپس چلا گیا۔ اُس روز تیمور نے انجم کے سامنے قسم کھائی کہ وہ جب تک ششیکھر کو ہرا نہیں لیتا، انجم کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ تیمور کی رگوں میں افغان خون تھا۔ وہ جس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا وہاں لوگ وعدہ نبھانے کی خاطر خون کے دریا بہا دیتے ہیں۔

تیمور اپنی قسم پوری کرنے کی قابلیت رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس دفعہ وہ ششیکھر کو ضرور ہرا دے گا۔ مشق کے دوران اٹھارہ میل کی دوڑ میں وہ جو ٹائم لے رہا تھا اُس سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اس دفعہ ششیکھر اور تیمور میں بہت کانٹے کا مقابلہ ہوگا لیکن پھر وہ واقعہ ہوگیا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ انجم کے بھائی انگلینڈ سے واپس آئے اور آتے ساتھ ہی انہوں نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "شاہی" سے اُس کی ٹانگ تڑوا دی گئی اور وہ معذور ہو کر ہسپتال کے وارڈ میں جالیٹا۔ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد تیمور کی زندگی ایک نئی ڈگر پر چل نکلی۔ وہ مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا اور اس کے سامنے ایک تاریک پستی [illegible] کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ باپ نے [illegible] ہار کر اُسے گھر سے

نکال دیا اور وہ اپنے دوست انعام خاں کے گھر اُس کی بیٹھک میں رہنے لگا۔ دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ ایک رات انجم برقعہ پہن کر اُس سے ملنے آگئی۔ انعام خاں کے ذریعے اُن دونوں کی ملاقات ہوئی۔ انجم تیمور کے پاؤں میں گر پڑی اور رو رو کر اُس سے معافی مانگنے لگی۔ اُس نے کہا "تمہاری بربادی کی ذمے دار میں اور صرف میں ہوں، میں تمہارے سامنے ہوں مجھ سے اپنی بربادی کا بدلہ لے لو لیکن مجھ سے بے رُخی اختیار نہ کرو"۔ تیمور نے کہا کہ وہ وہاں سے چلی جائے اب اُن کی راہیں جدا ہو چکی ہیں۔ وہ بولی میں راہیں ملانے کے لیے آئی ہوں۔ تم جیسے اور جس حال میں بھی ہو مجھے دل و جان سے قبول ہو۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں ہم دونوں بالغ ہیں۔ ہم کورٹ میں جا کر شادی کریں گے۔ میرے گھر والے مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ایک بار ہماری شادی ہوگئی تو پھر انھیں داماد کے طور پر تمھیں قبول کرنا ہی ہوگا۔ جواب میں تیمور نے کہا کہ اب وہ اُس کے قابل نہیں رہا۔ وہ بولی، تم میرے پیار کی توہین کر رہے ہو۔ یہ مجھ سے پوچھو کہ تم کس قابل ہو۔ تم ایک لڑائی نہیں جیت سکے تو کیا ہوا۔ زندگی کی لڑائی تو تمہارے پاس ہے۔ ہار جیت کے سینکڑوں میدان ہیں جہاں تم اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکتے ہو۔ اور تم منواؤ گے بھی۔ آؤ میرا ہاتھ تھام لو ہم کہیں دور نکل جائیں اور نئے عزم کے ساتھ نئی زندگی شروع کریں۔ تیمور نے انجم کی کوئی بات نہیں مانی۔ وہ مان بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی قسم کھا چکا تھا اور قسموں وعدوں کو توڑنا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ اُس نے زندگی میں بہت کم ارادے باندھے تھے لیکن جو بھی باندھے تھے انھیں پورا کیا تھا۔ اب اُسے یہ قسم بھی نبھانی تھی..... انجم صرف اسی بات ہی نہیں [illegible] اس کے بعد بھی [illegible] اس [illegible] ملتی رہی۔

اُس کی منتیں سماجتیں کرتی رہی لیکن تیمور ٹس سے مس نہیں ہوا۔ دوسری طرف سردار ششیکر نے عرصے سے انجم پر نگاہ رکھی ہوئی تھی لیکن دو وجوہات تھیں جن کی بناء پر وہ اُس سے دُور تھا۔ ایک تو انجم مسلمان تھی، دوسرے تیمور سے منسوب ہو چکی تھی۔ اب تیمور کے پیچھے ہٹنے سے ششیکر کے لیے میدان صاف ہو گیا تھا اور وہ آزادانہ انجم پر ڈورے ڈالنے لگا تھا۔ انجم نے بھی ڈورے ڈلوانے کے لیے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے تھے لیکن یہ بات نہیں تھی کہ وہ ششیکر کی طرف جھک گئی تھی۔ وہ صرف تیمور کو ہوش دلانا چاہتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ شاید رقابت کا جذبہ اُس کے بجھے ہوئے دل میں محبت کا شعلہ جگا دے۔ وہ ششیکر گروپ کے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ گھومتی تھی اور سینے میں گہرا دُکھ چھپا کر ہونٹوں پر مسکراہٹیں سجائے ہوئے تھی۔

جس روز انعام خاں سے میری ملاقات ہوئی اور اُس نے مجھے تیمور اور انجم کی پریم کہانی کے بارے میں بتایا اُس سے دو روز بعد ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ جس دریا نما پہاڑی نالے کا میں نے ذکر کیا ہے اُس کا پانی ستمبر اکتوبر میں اُتر جاتا تھا۔ اس دفعہ پانی اُترا تو ایک تباہ شدہ کار کا ڈھانچہ برآمد ہوا۔ یہ ڈھانچہ ست دھارا سے ایک فرلانگ کی دُوری پر تھا۔ خبر ملتے ہی میں موقعے پر پہنچا۔ یہ ایک چھوٹی سی ٹو سیٹر گاڑی تھی۔ اس کی چھت بوقتِ ضرورت تہہ بھی کی جا سکتی تھی۔ تاہم جس وقت گاڑی دریا میں گری چھت کھلی ہوئی تھی۔ بلندی سے گر کر گاڑی کا کچومر نکل چکا تھا۔ منچلے نوجوان ڈھانچے کو رسّے ڈال کر دریا سے باہر کھینچ رہے تھے اور اب چاروں طرف سے اُس کا جائزہ لے رہے تھے۔ موقع پر یہ خبر گرم تھی کہ یہ گاڑی چند ماہ پہلے جھما شہر کے نواب ریئسانی کے پاس تھی۔ گاڑی دیکھتے ہی میں بُری طرح چونک گیا۔ میرے ذہن میں وہ منظر تازہ ہو گیا جب ... شدگی پر ...

"فیکرا گلی" پہنچے تھے اور ڈھلوان پر خون کے دھبّوں کا معائنہ کیا تھا۔ وہاں پر پائی جانے والی کچھ شہادتوں سے شبہ ہوتا تھا کہ یہاں کسی گاڑی کو حادثہ پیش آیا ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے پلاسٹک کے وہ ٹکڑے گھوم گئے جو کسی بمپر کا حصّہ تھے۔ میں نے تباہ شدہ گاڑی کے بمپر دیکھے اور سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی گاڑی ہے (بعد میں اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی کیونکہ بمپر کے وہ ٹکڑے ابھی تک میرے پاس موجود تھے) نجانے کیوں مجھے احساس ہونے لگا کہ اس تباہ شدہ گاڑی اور تیمور کی زندگی میں آنے والے نشیب و فراز میں گہرا تعلق ہے۔ گاڑی کے تباہ ہونے کی وجہ معلوم ہوتی تو تیمور کی زندگی کے سب سے تاریک گوشے سے نقاب اُٹھ سکتا تھا۔ جھما کا فاصلہ الہوڑی سے تقریباً 20 میل ہے۔ میں نے اپنی جیپ لی اور عملے کے تین ارکان کے ساتھ سہ پہر کے وقت جھما پہنچ گیا۔ جھما کے نواح میں نواب ریئسانی کی رہائش گاہ کسی محل سے کم نہیں تھی۔ نواب عرصہ تین سال سے بیمار تھے۔ کاروبار اور زمینوں کے سارے معاملات نواب کے چودہ سالہ بیٹے اور بیگم مہربانو کے سپرد تھے۔ بیگم مہربانو کو میں نے ایک مرتبہ کسی فنکشن میں دیکھا تھا۔ اُس کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی۔ غالباً تیس پینتیس کے قریب۔ لیکن اس عمر میں بھی اُس کا حُسن آنکھوں کو خیرہ کرتا تھا۔ بڑی بھرپور اور شاداب عورت تھی وہ۔ نواب ریئسانی کو کوئی عجیب قسم کا عارضہ تھا۔ نامعلوم وجہ سے اُنھیں بخار ہو جاتا تھا۔ اندرون اور بیرون ملک اُن کا بے تحاشا علاج ہوا تھا لیکن نہ تو کسی بیماری کا پتہ چلا تھا اور نہ بخار میں افاقہ ہوا تھا۔ ویسے سُنا تھا کہ اب کچھ عرصے سے اُن کی حالت بہتر ہے۔ میں نواب ریئسانی کی شاندار ... بانو ولا پہنچا تو بیگم مہربانو نے

میرا استقبال کیا۔ اُن کی زبانی پتہ چلا کہ نواب صاحب کچھ ٹیسٹ وغیرہ کروانے کے لیے دہلی گئے ہوئے ہیں۔ نوابزادہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں نے بیگم صاحب کو بتایا کہ ڈلہوزی کے نزدیک دریا سے ایک ایسی کار کا ڈھانچہ ملا ہے جس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ وہ نواب صاحب کی ملکیت رہی ہے۔ اس اطلاع پر بیگم صاحبہ بُری طرح چونک گئیں۔ اُن کی خوبصورت آنکھوں میں حیرت کے ساتھ خوف کی جھلک بھی نظر آئی۔

وہ بولیں "ہاں..... اس سال موسم بہار میں ہماری بلیو ٹوسمکر چوری ہوگئی تھی۔ ہم نے یہاں پولیس سٹیشن میں پرچہ بھی درج کرایا تھا۔ میرا خیال ہے یہ وہی ٹوسمکر ہوگی..... بلیو رنگ کی"۔

"جی ہاں..... یہ وہی گاڑی ہے"۔

"مائی گاڈ..... وہ کیسے دریا میں گری اور ملی کیسے؟"

میں نے کہا "گرنے کا تو مجھے معلوم نہیں بیگم صاحبہ، ہاں ملنے کی وجہ پانی کا اُترنا ہے۔ آج صبح چند لڑکوں نے اُس کا ڈھانچہ دریا میں دیکھا ہے"۔

"اوہ گاڈ وہ تو بالکل برباد ہو چکی ہوگی..... ہاؤ سیڈ۔ ہمیں بہت دُکھ ہوا اس خبر پر۔ وہ بہت پرانی گاڑی تھی۔ میرے خیال میں 1912ء کی رجسٹرڈ تھی۔ مجھے پرانی چیزیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ آئی تھنک اولڈ از گولڈ"۔

بیگم صاحبہ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ انہیں واقعی پرانی چیزوں سے محبت تھی۔ کوٹھی کی نشست گاہ عجائب خانہ نظر آرہی تھی۔ قدیم فرنیچر، قدیم تصویریں، قدیم طرزِ آرائش، یہاں تک کہ بیگم صاحبہ نے جو جیولری پہن رکھی تھی وہ بھی وکٹوریہ عہد کی لگتی تھی لیکن چونکہ وہ خود بھی نویلی تھیں اس لیے ان ساری کرم خوردہ چیزوں کے درمیان [illegible] رہی تھیں۔

کار [illegible] بات کرکے ایک طرح سے ختم صاحبہ نے معاملہ ہی ختم کردیا تھا لیکن میں اتنی جلدی اس خوبصورت عورت کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ میں کرید کرید کر سوال پوچھتا رہا کہ کار کب چوری ہوئی، کیسے ہوئی اور اس کی تلاش کے لیے کیا کچھ کیا گیا..... میری جرح بیگم صاحبہ کو پسند نہیں آرہی تھی اور وہ میرے طویل سوالوں کے بڑے مختصر جواب دے رہی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میں نے تھوڑی دیر اور سوال جواب کا سلسلہ جاری رکھا تو وہ پنجے نکال کر مجھ پر جھپٹ پڑیں گی۔ بیگم صاحبہ ہونے کی وجہ سے وہ خاصی مغرور نظر آتی تھیں اور لگتا تھا کہ تیز مزاج بھی ہیں۔ گفتگو کے دوران میری نگاہ محترمہ کی کلائی پر پڑی اور میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ انہوں نے ایک بہت پرانے ماڈل کی گھڑی باندھ رکھی تھی۔ ڈائل کا فریم اور سنہری چین سیاہی مائل ہو چکا تھا لیکن گھڑی کا شیشہ بالکل نیا تھا اور چم چم کررہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے فوراً وہ شیشہ آگیا جو چھ ماہ پہلے مجھے جائے حادثہ سے ملا تھا اور جو اب دفتر میں میری میز کی دراز میں پڑا تھا۔ مجھے اپنی گھڑی کی طرف گھورتے پا کر بیگم صاحبہ ایک دم الرٹ ہوگئیں اور گھڑی والا ہاتھ اوٹ میں کرلیا..... آج صبح دریا سے برآمد ہونے والے کار کے ڈھانچے کی میں اچھی طرح تلاشی لے چکا تھا۔ اس تلاشی میں جو سب سے اہم چیز برآمد ہوئی تھی وہ سنہری بالوں کا ایک گچھا سا تھا۔ ان بالوں کو دیکھتے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ یہ کسی مرد کے ہیں اور غالباً کسی انگریز صاحب کے ہیں"۔ اس کے علاوہ ایک ٹوٹی ہوئی مالا کے چند سبز موتی بھی ملے تھے۔ یہ موتی صاف طور پر کسی عورت کی موجودگی کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اب اس سنہری گھڑی کا نیا نویلا شیشہ دیکھنے کے بعد مجھے سو فیصد یقین ہوگیا کہ جس وقت بلیو ٹوسمکر کو حادثہ پیش آیا، اس میں بیگم صاحبہ خود [illegible] میں موجود تھیں۔ ہمارے تفتیشی رویے نے

اب بیگم صاحبہ کو تقریباً مشتعل کر دیا تھا۔ وہ بولیں "سوری انسپکٹر! تمہیں اس سلسلے میں کچھ اور پوچھنا ہو تو میرے وکیل سے مل لو۔ میں اُسے تمہارے بارے میں فون کر دوں گی" اُس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

میں بدستور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ وہ برآمدے کی طرف چند قدم اُٹھانے کے بعد یک لخت میری طرف گھومیں اور مجھے گھورنے لگیں "کیا بات ہے تم جاتے کیوں نہیں ہو" انہوں نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے ابھی ہماری بات ختم نہیں ہوئی"۔ میں نے اطمینان سے کہا۔

"کیا مطلب" وہ مجھے پھاڑ کھانے پر آمادہ تھیں۔ غصے کی وجہ سے سانس تیز چل رہی تھی اور جسم کے خوبصورت نشیب و فراز اور بھی نمایاں ہو گئے تھے۔

میں نے کہا "میرا ناقص خیال یہ ہے کہ آپ کی نوسٹر چوری نہیں ہوئی تھی، اُسے چھ ماہ پہلے کیمرا گلی کے قریب آپ کے ہاتھوں حادثہ پیش آیا تھا اور جس وقت یہ حادثہ پیش آیا آپ کے ساتھ انگریز صاحب بھی موجود تھے......"۔

میرے ان چند الفاظ نے بیگم صاحبہ کے سر پر بم کے پے در پے دھماکوں کا کام کیا۔ وہ پھٹی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ کوئی نوکر انہیں اس حالت میں دیکھتا تو سمجھتا شاید بیگم صاحبہ نے میرے روپ میں فرشتہ اجل کا دیدار کیا ہے۔ وہ دھیمے قدموں سے واپس لوٹیں اور دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ میں نے تپائی پر رکھے ہوئے جگ سے پانی کا گلاس بھرا اور ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لیجیے...... پی لیں"۔ انہوں نے لرزاں ہاتھوں سے پانی کا گلاس پکڑ لیا۔ پھر جیسے چونک کر اُسے واپس تپائی پر رکھ دیا۔ میں نے "انگریز صاحب" کا ذکر گول مول انداز میں کیا تھا کیونکہ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ انگریز کون تھا اور اُس کا نام کیا تھا۔ ایک طرح سے میں نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا اور یہ تیر سیدھا بیگم صاحبہ کے کلیجے میں لگا تھا۔

وہ ایک سمجھ دار عورت تھی۔ بڑی جلدی سے اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ اب انکار فضول ہے اور اس سے بے اعتمادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ چند لمحے اپنے خوبصورت ہونٹ کاٹتے رہنے کے بعد اُس نے کہا "انسپکٹر! بہتر ہے ہم اندر چل کر بات کریں"۔

میں نے کہا "نہیں! آپ خواہ مخواہ خود کو تکلیف نہ دیں آپ مصروف ہوں گی میں آپ کے وکیل سے بات کر لوں گا"۔

وہ گڑبڑا کر رہ گئی پھر ایک دم اُس کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے۔ یوں لگا جیسے چلچلاتی دھوپ میں بارش برسنے لگی ہے۔ لوہا جتنا سخت ہو اتنی جلدی ٹوٹ جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ بھی جتنی مضبوط نظر آتی تھیں اندر سے اتنی ہی کمزور تھیں "پلیز انسپکٹر! میرے ساتھ آؤ میں...... میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں"۔

کوئی اور انسپکٹر ہوتا تو اپنا ریٹ بڑھانے کے لیے کہتا "بات تو اب عدالت میں ہو گی بیگم صاحبہ لیکن میں نے ریٹ بڑھانا تھا اور نہ اس روتی سسکتی عورت پر دباؤ ڈالنا تھا میں اُٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔

وہ موم کی طرح نرم ہو رہی تھی۔ میں نے معمولی تپش دکھا کر اُس کی "زبان" کو پگھلا لیا...... پھر جب ایک بار وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ اُس نے وہ راز میرے سامنے اُگل دیا جسے وہ چھ ماہ سے سینے میں چھپائے ہوئے تھی۔ وہ ایک عورت کا سینہ تھا اُس میں اتھاہ گہرائی تھی۔ کوئی اس گہرائی کی تہہ تک پہنچ سکا ہے نہ پہنچ سکے گا۔ مگر وہ خود اس گہرائی کو میرے سامنے ظاہر کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اُس نے بھیگی ہوئی آنکھوں اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان کے ساتھ اقرار کیا [illegible] ایک [illegible] تم [illegible] مجھ کو [illegible] اچھا دوست [illegible] یہ

فقرہ اُس کی گفتگو کی ابتداء تھا جو میرے اور مہربانو کے درمیان قریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ اس گفتگو سے میں نے جو کچھ اخذ کیا اُس کا خلاصہ یوں ہے۔

سات آٹھ ماہ پہلے بیگم مہربانو کی زندگی میں ایک مرد آیا تھا۔ وہ ایک انگریز فوٹوگرافر ایڈی تھا۔ ایڈی پہاڑی علاقوں کی تصویر کشی کے سلسلے میں نواب ریکسانی کے گھر میں ہی مقیم تھا۔ وہ ایک جواں سالہ وجیہہ مرد تھا۔ دوسری طرف مہربانو بھی اپنے سراپے میں کشش کا ایک جہاں آباد رکھتی تھی۔ کوئی دیکھ کر کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک پندرہ سالہ لڑکے کی ماں ہے۔ ایڈی اور مہربانو نہ چاہتے ہوئے بھی نگاہوں کے طلسم میں گرفتار ہو گئے۔ یہ بڑا طوفانی قسم کا عشق تھا۔ مہربانو جیسی پارسا عورت اس طوفان کی لپیٹ میں یوں آئی کہ سدھ بدھ کھو بیٹھی۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ٹھہرے ہوئے مہمان کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے اور بیمار شوہر کے سرہانے بیٹھ کر کسی اور دُنیا میں کھوئی رہتی ہے۔ وہ مارچ کی ایک ابر آلود صبح تھی۔ نواب ریکسانی اپنے صاحبزادے کے ساتھ پشاور گئے ہوئے تھے۔ انھیں وہاں کسی انگریز ڈاکٹر سے ملنا تھا۔ دوسری طرف مہربانو کو عشق کے پر لگے ہوئے تھے اور وہ سب کچھ بھول کر اونچی ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ ایڈی اُن دنوں فوٹوگرافی کے سلسلے میں ڈلہوزی گیا ہوا تھا۔ شوہر اور بیٹے کے گھر سے جاتے ہی مہربانو اپنے محبوب سے ملنے کے لیے بے تاب ہو اٹھی۔ اس نے سیاہ برقعہ پہنا، فوسٹر گاڑی نکالی اور علی الصبح منہ اندھیرے ڈلہوزی روانہ ہو گئی۔ ایڈی اور مہربانو کی ملاقات ڈلہوزی کے ایک ہوٹل میں ہوئی۔ وہاں کچھ دیر اپنی "بے تابیاں" کم کرنے کے بعد دونوں "ست دھارا" جانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ایڈی نے "ست دھارا" کے قریب ایک پرانا ڈاک بنگلہ [illegible] کرایا تھا اور [illegible] میں [illegible] ڈویلپ کرنے کے لیے لیبارٹری بنا رکھی تھی۔ وہ مہربانو کو اپنی لیبارٹری دکھانے ڈاک بنگلے لے جا رہا تھا کہ تیکرا گلی کے قریب ایک خطرناک موڑ پر پھسلن کی وجہ سے اُن کی گاڑی بے قابو ہو کر سنسان ڈھلوان پر جا گری۔ ایڈی اور مہربانو دونوں گاڑی کے اندر پھنس گئے اور گاڑی کی فیول لائن میں آگ بھڑک اٹھی۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ زخمی ایڈی اور مہربانو گاڑی کے نیچے دبے ہوئے مدد کے لیے چلا رہے تھے اور گاڑی کسی بھی لمحے دھماکے سے اُڑنے والی تھی۔ یہی موقع تھا جب پسینے میں شرابور ایک نوجوان اتھلیٹ نے سڑک پر سے نشیب میں جھانکا۔ وہ چند لمحے شدید تذبذب میں کھڑا رہا، کبھی پیچھے دیکھتا تھا اور کبھی مدد کے لیے چلاتے ہوئے مرد و زن کی طرف۔ اُن کی سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ پھر اُس کی نگاہ گاڑی کے بونٹ سے چھوٹتی ہوئی چنگاریوں پر پڑی۔ وہ صورت حال کی نزاکت جان گیا۔ چھلانگ لگا کر وہ نشیب میں آیا اور بھاگتا ہوا گاڑی تک پہنچ گیا۔ اُس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر زخمی ایڈی اور مہربانو کو گاڑی تلے سے نکالا اور پتھروں کی اوٹ میں لے گیا۔ بھک بھک کی آوازوں سے گاڑی میں آگ لگ گئی اور بارش کے سبب تھوڑی دیر میں ٹھنڈی ہو گئی۔ ایڈی کا ایک کندھا چکنا چور ہو چکا تھا۔ چہرے اور سر پر بھی گہرے زخم آئے تھے۔ دوسری طرف مہربانو بھی جزوی طور پر زخمی ہوئی تھی۔ اتھلیٹ جس کا نام تیمور تھا مدد کے لیے اپنے دیگر ساتھیوں کو بلانا چاہتا تھا مگر ایڈی اور مہربانو نے اُسے سختی سے منع کر دیا۔ مہربانو ایک ذہین عورت تھی۔ اس نازک صورت حال میں پھنس کر اُس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اُس نے تیمور سے درخواست کی کہ تباہ شدہ گاڑی کو دھکیل کر دریا میں پھینک دیا جائے۔ تیمور [illegible] معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ سمجھا کی

مشہور معروف بیگم صاحبہ کو شکل سے جانتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ساتھی مرد سے بیگم صاحبہ کا کوئی "نازک" رشتہ ہے اور وہ اس رشتے کو ہر صورت راز میں رکھنا چاہتی ہیں۔ اُس نے مہربانو اور ایڈی کے ساتھ مل کر گاڑی کو دریا میں دھکیل دیا اور پھر اُن دونوں کے ساتھ مل کر موقعے سے حادثے کی ہر نشانی مٹا ڈالی۔ مہربانو نے آنسو بھری نظروں سے تیمور کی طرف دیکھا اور التجا کی کہ وہ اس بارے میں کسی سے بات نہیں کرے گا۔

تیمور نے وعدہ کرلیا۔ وہ دوڑ میں شریک تھا اور زیادہ دیر وہاں ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ورنہ جھا کی بیگم مہربانو کا راز راز نہ رہ سکتا۔ مہربانو بھی یہ بات سمجھتی تھی۔ اس نے تیمور سے کہا کہ وہ جائے...... وہ دونوں کسی نہ کسی طرح اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔

بعد میں مہربانو کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ تیمور کون ہے اور اس نے کس طرح سالانہ ریس کے دوران اپنی جیت کو ہار میں بدل کر اُن دونوں کی مدد کی تھی۔ درحقیقت اُس وقت وہ پہلے نمبر پر جارہا تھا جب اُسے حادثے کی وجہ سے رُکنا پڑا تھا۔ وہ تیمور کی بے حد مشکور تھی۔ پھر جس طرح تیمور نے مہربانو اور ایڈی کا راز اپنے سینے میں دفن کرلیا تھا اس نے تیمور کو مہربانو کی نظروں میں اور بھی بلند مقام دے دیا تھا۔ وہ کسی طور پر تیمور کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ اس غرض سے وہ ایک دفعہ راز داری سے ڈلہوزی بھی گئی تھی لیکن تیمور سے ملاقات نہ ہوسکی۔ پھر یوں ہوا کہ اُسے اپنے بیمار شوہر کو علاج کی غرض سے انگلینڈ لے جانا پڑا۔ انگلینڈ سے وہ لوگ دو تین ہفتے پہلے ہی واپس لوٹے تھے۔ نواب ریئسانی کی حالت اب کافی بہتر تھی۔ دوسری طرف مہربانو بھی بیماری عشق سے کافی حد تک صحت یاب ہو چکی تھی۔ ایڈی اپنے ناکارہ زخمی بازو کے ساتھ واپس انگلینڈ جاچکا تھا اور مہربانو چھ سات ماہ پہلے کے شب و روز کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھلا دینا چاہتی تھی۔

......مہربانو کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اُس کے انگلینڈ جانے کے بعد یہاں تیمور کو کن حالات کا سامنا ہوا ہے۔ وہ بے خبر تھی کہ اُس کی زندگی کی خاطر اپنا کیریئر داؤ پر لگا دینے والا "بے لوث نوجوان" اپنوں اور غیروں کے ستم کا شکار ہے۔ نہ اُس کا حوصلہ سلامت رہا ہے اور نہ جسم۔ وہ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ایک حقیر مخلوق بن کر رہ گیا ہے۔ میں نے جب اُسے تیمور کے حالات بتائے تو وہ ششدر رہ گئی۔ شاید اُسے ابھی یقین نہیں آیا کہ چھ ماہ پہلے کا خوبصورت اتھلیٹ آج ایک معذور نفسی ہے......

پھر دھیرے دھیرے میں نے مہربانو کی خوبصورت آنکھوں میں ایک بے قراری پیدا ہوتے دیکھی اور ایک عزم سا طلوع ہوتے محسوس کیا......!

مہربانو کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں تیمور احسن نے کسی معمولی عورت پر احسان نہیں کیا تھا اور احسان بھی ایسا جو اپنی مثال آپ تھا۔ اپنی کامیابی اور جان داؤ پر لگا کر اُس نے مہربانو کی جان اور عزت بچائی تھی۔ سارے دُکھ اپنے سینے میں جھیل لیے تھے اور خاموش رہا تھا۔ اُس نے اپنے قصۂ غم کو لبوں تک نہیں آنے دیا تھا کیونکہ اس میں جھا کی معزز ترین پردہ نشین کا نام آتا تھا...... بیگم مہربانو سے میری ملاقات کے صرف دو روز بعد کا واقعہ ہے پتہ چلا کہ جھا کے نواب ریئسانی اپنی بیگم کے ہمراہ ڈلہوزی آئے تھے۔ گزرتے ہوئے راستے میں اُن کی نگاہ تیمور پر پڑی۔ وہ رُک کر اس کے بارے میں پوچھنے لگے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ یہ وہی لڑکا ہے جو کچھ عرصہ پہلے تک علاقے کا بہترین اتھلیٹ سمجھا جاتا تھا تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنی گاڑی کے دروازے کھول دیے اور اس غلیظ گٹھڑی کو اُٹھا کر گاڑی میں رکھ لیا۔ اب تیمور نواب صاحب کی جھا والی رہائش گاہ میں ہے اور سُنا جارہا ہے کہ نواب صاحب اُس کی [illegible] سارا [illegible]

میں جانتا تھا ان مہربانیوں کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے اور کیوں ہے۔ تیمور کو موت سے زندگی کی طرف لوٹانے کے لیے علاقے کی سب سے دولت مند اور بااثر عورت حرکت میں آچکی تھی..... اگلے ایک ماہ میں چند واقعات تیزی سے رونما ہوئے۔ پہلے معلوم ہوا کہ تیمور کو پشاور بھیجا گیا ہے جہاں اُس کا نشہ چھڑانے کی کوشش کی جارہی ہے اور دیگر علاج معالجہ ہورہا ہے پھر معلوم ہوا کہ اُسے ٹانگ کے علاج کے لیے دہلی لے جایا گیا ہے اور ایک معروف انگریز پروفیسر جو آرتھوپیڈک سرجن بھی ہے اُس کی ٹانگ کا آپریشن کرنے والا ہے۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ آپریشن کینسل ہوگیا ہے اور تیمور واپس چھما آگیا ہے۔ اس کے بعد ایک روز میں نے بلال شاہ کی زبانی سُنا کہ تیمور کا دوست انعام خان اُس سے ملا ہے۔ میں نے انعام کو بلا کر اس سے تیمور کا حال احوال پوچھا۔ اُس نے تیمور کی ایک تازہ تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک ڈیڑھ مہینے میں ہی وہ بہت حد تک صحت یاب ہو گیا تھا۔ ہڈیوں پر گوشت آگیا تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اصل مقام پر نظر آرہی تھیں۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے اور وہ صاف ستھرے لباس میں آرام کرسی پر بیٹھا ایک سپورٹس میگزین دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا ایک برباد شدہ باغ پر پھر بہار آگئی ہے اور سوکھے تنوں میں سے سبز کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔

انعام خان نے بتایا کہ وہ "بانو والا" میں بڑے مزے میں ہے۔ بیگم صاحبہ اُس پر بے حد مہربان ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تیمور ایک بار پھر کھیل کے میدان میں واپس آئے گا اور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرے گا۔ وہ کہتی ہیں کہ کتنا بھی پیسہ لگے وہ اُس کی ٹانگ ٹھیک کروائیں گے۔

انعام خان [illegible] درست [illegible]

بعد پتہ چلا کہ نواب ریسانی اپنے چیک اپ کے لیے لندن گئے ہیں اور تیمور بھی اُن کے ساتھ ہے۔ یہ "کایا پلٹ" حیران کن تھی۔ کہاں یہ کہ ڈلہوزی میں بھی تیمور کو مناسب علاج میسر نہیں تھا اور کہاں وہ آپریشن کے لیے انگلینڈ کا رُخ کر رہا تھا۔ سچ کہا گیا ہے کہ انسان کو اُس کے کرموں کا صلہ ملتا ہے۔ دیر ہوسکتی ہے لیکن اندھیر نہیں۔ انگلینڈ سے نواب ریسانی اور تیمور کی واپسی قریباً دو ماہ بعد ہوئی۔ اس سلسلے میں مجھے انعام خان اور بلال شاہ سے مسلسل خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اصل بات کا انہیں بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ صرف یہی جانتے تھے کہ نواب ریسانی اور اُن کی بیگم اچانک تیمور پر مہربان ہو گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تیمور سردار شمشیر کے مقابلے میں دوبارہ دوڑ میں حصہ لے۔

انعام خان کی زبانی پتہ چلا کہ تیمور لندن سے بالکل صحت یاب ہوکر آیا ہے اور بغیر کسی سہارے کے آرام سے چلتا پھرتا ہے۔ انعام خان نے ایک بہت خاص خبر بھی پہنچائی۔ اس نے بتایا کہ پورے آٹھ ماہ بعد تیمور اور انجم میں ملاقات ہوئی ہے۔ انجم کے لیے تیمور نے پیغام بھیجا تھا اور وہ بھاگم بھاگ اُس سے ملنے چھما پہنچ گئی تھی۔ اس ملاقات میں تیمور نے انجم کو اپنی "قسم" کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ انشاء اللہ وہ اس قسم کا بوجھ بہت جلد اپنے اور انجم کے سر سے اُتار دے گا۔ یہ "افغان بچے" کا قول تھا اور انجم کو اس قول پر پورا یقین آگیا تھا۔

بہار کی وہ سہانی صبح مجھے آج بھی یاد ہے جب ڈلہوزی کنگ کالج گراؤنڈ میں ہزاروں تماشائی 18 میل کی میراتھن ریس شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس ریس میں تیمور بھی حصہ لے رہا تھا۔ ٹانگ ٹھیک ہونے کے بعد چار پانچ ماہ کے اندر اندر اس نے خود کو اس قابل بنا لیا تھا کہ اُس ریس [illegible] شمشیر [illegible] اس دوڑ میں حصہ لے رہا

تھا۔ تاہم چند ماہ پہلے وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہوا تھا اور ویسے بھی آؤٹ آف پریکٹس رہنے سے کچھ موٹا ہو چکا تھا۔ امکان تھا کہ وہ اس ریس میں پانچویں یا چھٹے نمبر پر ہی آ سکے گا۔ دوسری طرف تیمور کے ریس جیتنے کے امکانات بھی بہت کم تھے۔ دلچسپی کی بات صرف یہ تھی کہ دیکھیں تیمور شنکر کو ہرانے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں..... اس ریس میں سب سے "فیورٹ" سردار فیملی کا ہی ایک نیا لڑکا درشن کمار تھا۔ وہ کنگ کالج میں سیکنڈ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا۔

کالج کی گراؤنڈ میں ریس کا آغاز ہوا۔ ریس کی لمحہ بہ لمحہ صورتِ حال جاننے کے لیے سردار اشوک رائے نے مختلف مقامات پر ٹیلی فون سروس کا انتظام کر رکھا تھا۔ ٹیلی فون کے ذریعے جو اطلاع کالج گراؤنڈ میں پہنچتی تھی وہ لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے تمام تماشائیوں تک پہنچا دی جاتی تھی۔ میں اور سب انسپکٹر ہاشم بھی یہ اطلاعات سننے والوں میں شامل تھے۔ ریس کے آغاز ہی سے سردار فیملی کا لڑکا درشن کمار آگے نکل گیا تھا اور امید یہی تھی کہ آخر تک آگے رہے گا۔ ریس کے تیسرے میل سے دو پرانے حریفوں یعنی شنکر اور تیمور میں سخت مقابلہ شروع ہو گیا۔ وہ ہر صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہتے تھے تاکہ فیصلہ کن مرحلے میں جیتنے کی پوری کوشش کر سکیں۔ سندر گاؤں تک تیمور آگے تھا لیکن فیکٹری تک پہنچتے پہنچتے شنکر آگے نکل گیا اور تیزی کے ساتھ اپنا فاصلہ بڑھانے لگا۔ یہاں سے "فنشنگ لائن" ڈھائی میل کے فاصلے پر تھی۔ اس ڈھائی میل کے راستے میں شنکر اور تیمور میں جان لیوا مقابلہ ہوا۔ جب کھلاڑی ہانپتے کانپتے ہوئے کالج گراؤنڈ میں داخل ہوئے تو تماشائی یہ دیکھ کر اپنی نشستوں سے اُچھل پڑے کہ ماضی کے دو حریف دوڑ میں ایک بار پھر سب سے آگے [illegible]

دوسرے کو ہرا دینے کے ایسے شدید جذبے سے دوڑ رہے تھے کہ پہلے سے لگایا ہوا ہر اندازہ غلط ثابت ہو گیا تھا۔ درشن کمار جسے چیمپئن سمجھا جا رہا تھا تیسرے نمبر پر آ رہا تھا۔ وہ باہمت نوجوان جس نے چار سال اپنی جیت کا انتظار کیا تھا اور پانچویں بار اس مقابلے کو جیت کر بھی ہار دیا تھا۔ ایک بار پھر اور شاید آخری بار یہ ریس جیتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تیمور کے حامی اُچھل اُچھل کر اُسے داد دے رہے تھے۔ گراؤنڈ میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس وقت گراؤنڈ میں موجود بیشتر لوگوں کی ہمدردیاں تیمور کے ساتھ ہو گئی ہیں۔ وہ اُسے جیتتے دیکھنا چاہتے تھے۔ تقریباً دو سو گز کی دوڑ میں زبردست مقابلہ ہوا۔ ایک مرتبہ شنکر اور تیمور بالکل برابر ہو گئے۔ لیکن آخری لمحوں میں تیمور پھر آگے نکل گیا۔ اُس نے یہ مقابلہ جیتا اور بے دم ہو کر گراؤنڈ میں گر پڑا۔ ان گنت لوگوں نے اُسے کندھوں پر اُٹھا لیا اور خوشی سے ناچنے لگے۔ الہوزی کی تاریخ میں جیت کا وہ منظر یادگار تھا۔ فرطِ جذبات میں اُچھل کود کرنے والوں میں جہاں تیمور کے دوست اور اُس کے سینکڑوں پرستار شامل تھے وہاں اُس کا باپ ماسٹر حیات بھی تھا۔ جو خواب کئی برس پہلے اُس نے دیکھا تھا وہ آج اُس کے بیٹے نے پورا کیا تھا اور یوں پورا کیا تھا کہ آدھا الہوزی مسرت سے جھوم اُٹھا تھا لیکن اس جیت کی قیمت بیٹے کو کیا ادا کرنی پڑی یہ بھی سن لیجیے۔ تیمور کی ٹانگ میں ایک بار پھر فریکچر ہو گئے۔ دوڑ جیتنے کے بعد وہ تقریباً بے ہوش ہو گیا تھا۔ بعد میں اُس نے بتایا کہ اُس کی ٹانگ میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اُسے فوری طور پر ہسپتال پہنچایا گیا۔ ٹانگ کے ایکسرے وغیرہ ہوئے بعد میں یہ ایکسرے دہلی پہنچائے گئے۔ انگریز سرجن سخت حیران ہوا کہ ایسی ٹانگ کے ساتھ وہ صرف [illegible] بھاگا۔ ہلکا اشارہ

میل کی دوڑ بھی جیتا ہے۔ سرجن کانوں کو ہاتھ لگانے لگا اور بولا کہ یہ غیر معمولی واقعہ ہے...... تیمور اس کے بعد کبھی دوڑ میں حصہ نہیں لے سکا۔ وہ اُس کی زندگی کی آخری دوڑ تھی۔ تاہم اس دوڑ میں اس نے وہ سب کچھ حاصل کرلیا تھا جس کے لیے انسان ساری زندگی دوڑتا ہے۔ اُسے جیت کی دائمی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ گرانقدر انعامات ملے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ اس نے اپنی محبت جیتی تھی۔ اس نے اپنے اور انجم کے سر سے اُس قسم کا بوجھ اُتار دیا تھا جو یوں تو ایک لفظ تھی لیکن وزن میں ہمالیہ کا پہاڑ تھی۔ شاید کچھ پڑھنے والوں کو ایک نوجوان کا قسم کھانا اور اُسے پورا کرنے کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دینا عجیب محسوس ہو لیکن زندگی میں ایسے انوکھے لوگ ملتے ہیں انہی دیوانوں کی دیوانگی سے دُنیا کا حسن قائم ہے۔

یہاں سردار اشوک رائے اور اس کے بیٹے سردار شنکر کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ انہوں نے نہ صرف ہار کو کھلے دل سے تسلیم کیا کہ بلکہ سردار اشوک رائے نے تیمور کو خصوصی انعام بھی دیا۔ یہیں پر بس نہیں ہوئی۔ سردار شنکر اس سے بھی دو قدم آگے بڑھا۔ وہ جانتا تھا کہ انجم اور تیمور ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور انجم اگر چند روز کے لیے اُس کے نزدیک آئی تھی تو وہ صرف تیمور کو دکھانے اور جلانے کے لیے۔ اُس نے تیمور اور انجم کو ملانے کے لیے اپنا کردار ادا کیا۔ انجم کے انگلینڈ پلٹ بھائی اُس کے گہرے دوست تھے۔ اُس نے انہیں سمجھایا بجھایا اور اس بات پر آمادہ کردیا کہ وہ اپنی بہن کی خوشیوں کی راہ میں دیوار نہ بنیں۔ کچھ کوشش نواب ریسانی کی طرف سے بھی ہوئی اور یوں انجم اور تیمور کے درمیان حائل رکاوٹیں ایک ایک کر کے دور ہو گئیں۔

اس کہانی کو ایک کردار نے شروع [illegible] پردے میں رہا گوبند ہے۔ گوبند کی گمشدگی ایک بالکل ہی علیحدہ معاملہ ثابت ہوا۔ تیمور انجم اور سردار شنکر وغیرہ کے قصے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس واقعے میں وہ گوار بردار ڈوگر فوجی ملوث تھا جسے علاقے کے لوگ شاہی کہتے تھے۔ ڈلہوزی کے اندھیروں اُجالوں میں اُبھرتی وہ پُرتجسس کہانی میں آپ کو آئندہ ماہ سناؤں گا۔

انجم سے شادی کے بعد تیمور کی ٹانگ کا علاج معالجہ ہوتا رہا۔ کچھ عرصے بعد وہ ٹھیک سے چلنے لگا لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے اُس آخری ریس کے بعد وہ کبھی دوڑ نہیں سکا۔ چمبا کے نواب ریسانی اور اُن کی بیگم تیمور پر بہت مہربان تھے۔ انہوں نے تیمور کو پاؤں پر کھڑا ہونے میں بہت مدد دی۔ چمبا کے فیشن ایبل علاقے میں تیمور نے سیاحوں کے لیے نوادر کی ایک دکان کھول لی۔ اس دکان کو چلنا ہی تھا کیونکہ دکان کو رونق بخشنے والے اہم اور مستقل خریداروں میں نوادر کی دیوانی بیگم مہربانو بھی شامل تھی۔ وہ پرانی چیزوں کی دیوانی تھی۔ شاید اسی لیے اُسے اپنے پرانے شوہر سے ایک بار پھر والہانہ محبت ہوگئی تھی اور یہ کوئی مصنوعی محبت نہیں تھی۔ وہ دل و جان سے اُسے چاہتی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس عورت نے کبھی اپنے شوہر سے بے وفائی کی ہوگی اور نہ آئندہ کسی نے کہا ہوگا...... نواب ریسانی کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے مہربانو جیسی بیوی ملی تھی اور مہربانو کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے تیمور اور میرے جیسے "راز دار" مل گئے تھے۔ قدرت اکثر پہلی غلطی معاف کردیتی ہے۔ مہربانو کی چندروزہ بے وفائی کی طرح یہ راز بھی ہمیشہ راز ہی رہا کہ تیمور اپنی زندگی کی "سیکنڈ لاسٹ" سالانہ ریس میں کیوں ہار گیا تھا اور پہلے دوسرے نمبر پر آتا وہ انیسویں نمبر پر کیوں چلا گیا۔

قسمت

آسنا احمد کنول

> اب وہ جھلی اور مجہول سی نظر نہیں آتی بلکہ اچھی خاصی سمارٹ بن کے آتی ہے۔ اس کی اس تبدیلی کو محسوس کر کے میں تو خوش ہوگئی تھی حالانکہ شاید میری ہی جڑیں کٹ رہی تھیں۔ میں پوری توجہ سے کام کرنے لگی تھی پھر بھی کچھ نہ کچھ ہوتا رہا۔ میں نوکری جانے کے خوف سے اتنی اپ سیٹ رہنے لگی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی غلطیاں ہونے لگیں۔

ایک دفتر میں ملازم دو عورتوں کی کہانی۔ قسمت کی دیوی اچانک اُن پر مہربان ہوگئی تھی

وہ میری دوست نہ سہی اچھی خاصی واقف کار تو تھی۔ ہم ایک ہی آفس میں ہونے کی وجہ سے ہمارے درمیان اچھی ورکنگ ریلیشن شپ تھی۔ چونکہ دونوں خواتین تھیں اس لیے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے اور ساتھ دینے کی کوشش کرتی تھیں۔ میرے اندر چونکہ ازلی نرمی اور ہمدردی بھری ہوئی تھی۔ اس لیے میں زیادہ آگے بڑھ کے اس کا ہر اچھے بُرے کام میں ساتھ دیتی، کبھی کبھار اس کی چھوٹی موٹی مدد بھی کر دیتی۔ عجیب سی بات تھی وہ سارا وقت بجھی بجھی سی رہتی۔ ایک نامعلوم سی اداسی۔۔۔ چہرے کا احاطہ کیے رہتی۔ اچھا

خاصا وجود اُس نے مجہول سا بنا رکھا تھا۔ اپنے اوپر پیسے خرچ کرنا وہ ویسے بھی حرام سمجھتی تھی یا شاید حالات اجازت نہیں دیتے ہوں گے۔ میں نے کئی دفعہ کریدنے کی کوشش کی مگر وہ بے اعتنائی سے کچھ نہیں کہہ کر چپ ہوجاتی۔ کئی دفعہ اس کے گھر جانے کو کہا مگر وہ بات ٹال جاتی۔ ہمہ وقت وہ کسی سوچ میں گم رہتی۔ میں اکثر سوچتی کہ وہ کافی زیادہ ضرورت مند ہے حالانکہ اُس نے کبھی گھریلو حالات کا تذکرہ بھی نہیں کیا تھا۔ میں اسسٹنٹ منیجر کے عہدے پر کام کررہی تھی اور وہ اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں تھی۔ میرا رابطہ براہ راست چونکہ کمپنی کے چیئرمین صاحب سے ہوتا تھا۔ درانی صاحب میرے کام سے بے حد خوش تھے۔ میں بھی اپنی فیملی کو سپورٹ کررہی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی سکولوں میں تھے والد صاحب ریٹائر ہوچکے تھے۔ والد کی ریٹائرمنٹ پر جو پیسے ملے وہ دو بہنوں کی شادی اور بھائی کو باہر بھیجنے پر لگادیے۔ ابھی میرے سمیت تین بیٹیاں باقی تھیں گھریلو حالات زیادہ بہتر نہیں تھے اس لیے مجھے نوکری نا پڑی۔ چھوٹی بہن پڑھ رہی تھی اور میرے پیارے بھائی نے وہی کیا جو اکثر سپوت کرتے ہیں۔ بوڑھے والدین کو بھول کر اپنی زندگی سنوارنے میں لگ گیا۔ اس نے کبھی فون کیا نہ اطلاع ہی دی۔ کچھ ہی عرصے بعد اُس نے وہاں شادی کرکے ہم سے بالکل ہی تعلق توڑ لیا۔ والدہ تو صدمے میں چلی گئیں۔ سارا وقت بیٹے کی یاد اور اس کی جدائی میں گھلتی رہتیں اور ہم سب ماں کو سمجھانے میں لگے رہتے۔ اُنھیں سمجھاتے کہ ہمارے ساتھ وہی ہوا ہے جو بیشتر لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور یوں مجھے اپنے والدین کا سہارا بننا پڑا۔ شادی کی عمر نکلتی جارہی تھی۔ والدین کو یہ غم بھی کھائے جاتا اور میں بے حد دکھی ہوتی رہتی [illegible] میں کیا کرسکتی تھی۔

میں منیبہ [illegible] حد [illegible] تھی۔ وہ اُس [illegible]

پُراسراریت میرے لیے معمہ بنتی جارہی تھی۔ ایک دن درانی صاحب نے اچانک مجھے اپنے کمرے میں بلالیا۔ "مس جویریہ....." درانی صاحب گویا ہوئے۔

"یس سر؟" میں نے ادب سے کہا۔ "بیٹھیے پلیز۔"

"یس سر۔" میں ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "سر کوئی خاص بات؟" میں تھوڑی سی تشویش میں مبتلا تھی۔ "آپ کتنے عرصے سے اس کمپنی میں ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔ "سر تقریباً دو سال سے۔"

"آپ کو کوئی شکایت ہے ہمارے رویے سے یا اپنے کام سے؟" انہوں نے پوچھا۔ "نہیں سر۔ میں اپنے کام سے مطمئن ہوں۔" وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"ایک خاتون اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں کام کررہی ہیں کمپیوٹر کا سارا کام وہ کرتی ہیں۔ یہ ایک فائل میرے پاس آئی ہے اسے ذرا آپ خود دیکھ لیں۔ یہ غالباً کمپنی کی نئی سائٹ سے متعلق پیپرز ہیں جو آپ نے صدیقی صاحب کے ساتھ تیار کرکے اکاؤنٹس میں بھیجے تھے۔"

"یس سر۔" میں نے فائل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ اتنا بہترین کام کرتی ہیں پھر اس میں اتنے بڑے بلنڈر کیسے ہوگئے؟"

میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکی۔ "سر، میں ابھی دیکھ لیتی ہوں۔" میں نے اُسی وقت ساری فائل چیک کی۔ ایک دو صفحات پر مجھے شک گزرا۔ "سر میں اسے ذرا دوبارہ چیک کرسکتی ہوں۔ میں نے اس کی کاپی بنا رکھی ہے۔ ایک سیکنڈ میں وہ کاپی لا کر دیتی ہوں۔ آپ خود چیک کرلیں۔" میں اپنے کیبن میں پہنچی تو منیبہ میرے کیبن میں موجود تھی۔ میں ذرا سا ٹھٹک گئی۔ نہ جانے کیوں مجھے اُس پر شک سا گزرا۔ جیسے وہ کچھ تلاش کررہی تھی۔ "وہ میں تمھیں دیکھنے آئی تھی۔" وہ گھبرا کر بولی۔ "کوئی کام ہے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔ "ہاں [illegible] ل رہے تھے۔ [illegible] رہے [illegible] ہوں۔ [illegible] نہیں ملے۔ میں

چلتی ہوں۔" وہ یہ کہہ کر جلدی سے چلتی بنی۔ میں نے اپنا دراز کھولا۔ شکر ہے مجھے وہ فائل مل گئی۔ شاید وہ اسی کی تلاش میں آئی تھی۔ میں فوراً فائل لے کر درانی صاحب کے پاس پہنچی۔ انہوں نے دونوں فائلوں کو ملا کر چیک کیا تو انہیں سمجھ آ گئی۔ "مس جویریہ آپ کی کوئی ذاتی پرخاش تو نہیں مس منیبہ کے ساتھ۔"

"نہیں سر، ایسا تو کچھ نہیں۔" میں نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"او کے آپ جائیں۔" انھوں نے ہدایت کی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ آج تو بالکل نوکری جانے والی تھی۔ شکر ہے اپنی عقلمندی سے بچ گئی لیکن کتنی دیر سوچتی رہی کہ منیبہ نے ایسا کیوں کیا؟ میں نے تو ہمیشہ اس کا ساتھ دیا اور اس کا بھلا چاہا ہے۔ ویسے بھی اب بھلائی کا زمانہ ہی نہیں۔ میں نے احتیاطاً اپنی چیزیں اور کاغذات لاک کرنے شروع کر دیے۔ پھر جیسے یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی کسی کام میں غلطی کبھی کسی کام میں کمی۔ اکثر درانی صاحب کے سامنے میری پیشی ہونے لگی۔ "مس جویریہ کیا ہو گیا ہے؟ آپ تو بہت محنتی خاتون ہیں آپ کا کام بھی درست ہوتا ہے پھر اب کیا ہوا۔ اکثر غلطیاں نکلنے لگی ہیں۔ آپ کی توجہ کہیں اور ہے شاید۔" درانی صاحب نے تو نارمل طریقے سے ہی کہا مگر میں بے حد شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ "سر آئی ایم سوری۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گی کہ ایسا نہ ہو لیکن میں اب تک سمجھ نہیں پائی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"ایک بات بتائیے.....؟" درانی صاحب سوچتے ہوئے بولے۔ "کوئی ایسا شخص جو جان بوجھ کر آپ کے کام میں گڑبڑ کر رہا ہو؟" کچھ دیر کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے ہمدرد ہیں۔ "سر چونکہ میں ایسا کچھ جانتی نہیں اس لیے کسی کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"آپ غفران صدیقی کے ماتحت ہیں؟"

"جی۔"

"او کے۔ اور وہ مس منیبہ ان کے کیبن میں بیٹھتی ہیں؟"

"یس سر۔"

"او کے آپ جائیں اور آئندہ کوشش کریں کہ اپنے اردگرد لوگوں پر نظر رکھیں۔ مجھے آپ کے کام پر شک نہیں ہے۔"

میں باہر آ کر سوچنے لگی۔ مجھے یاد آنے لگا کہ آج کل منیبہ اور صدیقی صاحب کے درمیان کافی فرینک نس ہے۔ منیبہ بھی اب پہلے سے کافی بدلی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اب وہ جھلی اور مجہول سی نظر نہیں آتی بلکہ اچھی خاصی سمارٹ بن کے آتی ہے۔ اس کی اس تبدیلی کو محسوس کر کے میں تو خوش ہو گئی تھی حالانکہ شاید میری ہی جڑیں کٹ رہی تھیں۔ میں پوری توجہ سے کام کرنے لگی تھی پھر بھی کچھ نہ کچھ ہوتا رہا۔ میں نوکری جانے کے خوف سے اتنی اپ سیٹ رہنے لگی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی غلطیاں ہونے لگیں اور کچھ لوگ شاید یہی چاہتے تھے۔ مگر درانی صاحب کو ابھی تک مجھ پر یقین تھا اس لیے نوکری چل رہی تھی۔ 6 مہینے اسی آنکھ مچولی میں گزر گئے۔ پھر ایک دن بالآخر صدیقی صاحب درانی صاحب کے پاس جا پہنچے۔ ان کی خواہش تھی کہ چونکہ مس جویریہ کام کو اچھے سے سنبھال نہیں پا رہی ہیں اس لیے ان سے ذمہ داریاں لے کر منیبہ کو دے دی جائیں، وہ اپنے کام سے زیادہ وفادار ہیں اور بہتر کام کرتی ہیں۔ غفران صدیقی صاحب چونکہ 25 فیصد شیئرز کے مالک بھی تھے لہٰذا وہ فیصلہ بھی کروا سکتے تھے۔

"میں سوچتا ہوں اس بارے میں، مگر منیبہ صاحبہ کو اتنی بھاری ذمہ داری دے دینا بھی آسان نہیں۔" درانی صاحب نے کہا۔ ... صدیقی صاحب نے ... زندگی ... میں ان تمام باتوں سے

انجان تھی۔ اچانک درانی صاحب کا پی اے ایک لیٹر لے کر میرے پاس آیا۔ ”کیا ہے یہ جاوید صاحب؟“ میں نے پوچھا۔ ”میڈم یہ درانی صاحب نے دیا ہے۔ آپ کے لیے۔“ میں نے کانپتے ہاتھوں سے لیٹر کھولا۔ میری ترقی کردی گئی تھی درانی صاحب نے مجھے منیجر بنا کر فیکٹری کے آفس میں بھیج دیا تھا ساتھ میں پک اینڈ ڈراپ کی سہولت بھی دے دی تھی۔ گاڑی گھر سے لاتی اور لے جاتی۔ فیکٹری میں کسی کو بھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ ہیڈ آفس میں منیبہ کو صدیقی صاحب کا اسسٹنٹ بنادیا گیا مگر اُسے کمپیوٹر کے علاوہ کچھ پتہ نہیں تھا۔ صدیقی صاحب اس کے سارے کام کرتے۔ آفس میں بھی دو اکیلے ایک ہی کیبن میں کام کرتے تھے۔ کئی لوگوں نے انہیں عجیب حرکات کرتے دیکھا۔ ایک دن تو حد ہی ہوگئی جب درانی صاحب کو اچانک صدیقی صاحب کے کیبن میں جانا پڑا۔ وہاں صدیقی صاحب اپنی اسسٹنٹ کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں موجود تھے۔ دروازہ پر بیٹھا گارڈ درانی صاحب کو نہ روک سکا تھا اور صدیقی صاحب کا تو تو بدن میں لہو نہیں کی مثال بن گئے تھے۔ درانی صاحب نے اپنا غصہ ضبط کیا اور صدیقی صاحب سے کہا کہ وہ ان کے آفس میں آجائیں۔ کچھ ہی دیر بعد دھواں دار باتوں کا سلسلہ باہر نکلا۔ تمام ورکرز پریشان اور ہراساں کھڑے تھے۔ جو بات ان کی سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ صدیقی صاحب نے ایک شریف لڑکی کو ورغلایا ہے لہٰذا اُس سے شادی کرلیں ورنہ بہت بدنامی ہوگی اور صدیقی صاحب نے جواباً درانی صاحب پر الزامات کی بوچھاڑ کردی۔ اس نے کہا ”آپ بھی تو مس جویریہ کے ہمدرد ہیں انہیں آفس میں بلاتے ہیں۔ ان کو پروموٹ کیا، منیجر بنادیا۔ آپ نے ایک نالائق خاتون کو اتنا بڑا عہدہ دے دیا۔ میری بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔“

”صدیقی صا[illegible] آپ [illegible] کہنے کا کیا مطلب ہے۔“ درانی صاحب غصے میں آگئے۔ ”وہ ایک لائق خاتون ہے اور وہ اپنے کام کو بہت اچھے انداز میں چلا رہی ہیں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔ اس آفس میں ان کے کام کی خرابی صرف آپ کی اور اس لڑکی کی وجہ سے ہوئی۔ میں یہ بات جانتا ہوں سمجھے آپ۔ آپ یہ بات فائنل کریں کے آپ مس منیبہ سے نکاح کررہے ہیں یا نہیں؟“

”سر میں ایسا ہرگز نہیں کرسکتا وہ میرے سٹینڈرڈ کی نہیں۔“

”جو بھی ہو، آپ کو نکاح کرنا ہی ہوگا ورنہ آپ کی اس آفس میں کوئی جگہ نہیں۔“ درانی صاحب نے دوٹوک انداز میں کہا۔

اب صدیقی صاحب پریشان ہوگئے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد گویا ہوئے۔ ”ٹھیک ہے مگر ایک شرط پر۔“

”شرط وہ کیوں؟“

”آپ کو بھی مس جویریہ سے شادی کرنی پڑے گی۔“

”وہ کیوں؟“ درانی صاحب زور سے چلائے۔

”کرنی پڑے گی ورنہ میں بھی آپ کی پول کھول دوں گا۔“ صدیقی نے دھمکی دی۔ ”تم جانتے ہو میں شادی شدہ ہوں۔“ درانی صاحب اس بات پر سنجیدہ ہوگئے۔

”شادی شدہ ہیں پھر کیا ہوا۔“ صدیقی نے بے رحمی سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں اس بات پر سوچوں گا۔“

”نہیں سر نہیں فوری فیصلہ جیسے میرے لیے کیا آپ نے۔“ صدیقی نے ڈھٹائی سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں کروں گا مگر پہلے تم منیبہ سے نکاح کرو۔“

اور یوں منیبہ صدیقی کو گھرداری مل گئی۔ اور میں جویریہ درانی ایگزیکٹو بورڈ میں شامل ہو کر درانی صاحب کی شریک حیات بن چکی ہوں۔

قسمت کبھی کبھی یوں بھی بدلتی ہے۔

طنز و مزاح

یاراں دا ویلا

اقبال جسیم

ماسی کا مطلب ہے...... ماں ٹھنڈی گرم چھاں کی سوتیلی نہیں سگی بہن...... لیکن یہ گھروں میں کام کرنے والی یا والیوں کو پتہ نہیں اتنا بڑا رتبہ کس شوہر کی دشمن یا دشمنیوں نے دے رکھا ہے معمولی سی حیثیت کی ماسیوں کو ان کی ماؤں کی بہنیں بنا دیا ہے بلکہ نندیں بنا کے انہیں سر جھاڑنے کے لیے سر پہ چڑھا رکھا ہے......!

طنز و مزاح کی چاشنی لیے شگفتہ اور چلبلی تحریر

ماسی یا ماسیاں صرف ایک حال میں خوش رہ سکتی ہیں اور وہ ہے ''شادی ہال'' کہ وہاں کھانے کو کھلے ''کھابے'' ملتے ہیں۔

ایک ماسی کے شوہر نے اپنے دوستوں کے سامنے اپنی شریک حیات، آس حیات کی خوب خوب تعریف کی اور اچھل کر کہنے لگا۔

''ارے تیری ماسی تو......اوہ سوری...... میری بیوی تو مجھے اپنا رب کہتی ہے۔'' ''کیا......؟ رب کہتی ہے؟'' دوستوں نے حیرت سے پوچھا تو جواب ملا۔

''ہاں...... مصیبت کہتی ہے''

"وہ کس طرح......؟"

میں جب بھی شراب پی کر گھر میں داخل ہوتا ہوں تو میری بیوی مجھے دیکھتے ہی اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے "ہائے اوے میریا ریا......اج فیر پی کے آگیا ایں (اف میرے اللہ آج پھر پی کر آگئے ہو......)۔

اسی طرح ایک امی نے اپنی نئی پڑوسن کے سامنے اپنے اعلیٰ قسم کے نمبر ٹانگنے کے لیے اپنے شوہر کی اعلیٰ قسم کی تعریف کی۔

ارے بھئی میرے شوہر تو مجھے اپنی "جان" کہہ کر پکارتے ہیں۔

"جھوٹ بالکل جھوٹ......" قریب کھڑی ہوئی اس کی چھوٹی بیٹی نے شور مچا دیا اور کہنے لگی۔

"ڈیڈی تو اپنی جان صرف "ماسی" کو کہتے ہیں"۔

ایک دیہاتی میرے دوست سے بار بار کہہ رہا تھا "میں اپنی ماسی کے گھر جا رہا ہوں میں اپنی ماسی کے گھر جا رہا ہوں" میں بھی قریب ہی کھڑا ہوا سن رہا تھا لہٰذا میں نے شرارت کے طور پر پوچھ لیا (وہ کہاں رہتی ہے؟) جواب ملا جلو موڑ۔

وہ تو سرحدی علاقہ ہے وہاں وہ کیا کرتی ہے؟ میں نے دیہاتی کے "کھلے پن" کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو جواب ذرا سا تلخی سے ملا۔

"ہاں سرحدی علاقہ میں رہتی ہے اور وہاں پر دشمنوں کی گردنیں مروڑتی ہے......تم نے بھی اپنی گردن مڑوانی ہے؟"

دیہاتی کا جواب سن کر میں نے اسی لمحے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور جب ذرا تسلی ہو گئی کہ میری گردن اپنی جگہ پر ہی قائم ہے، ادھر ادھر نہیں پھسل رہی تو دل ہی دل میں اللہ سوہنے کا شکر ادا کرتے ہوئے دیہاتی کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھا تو نازل ہوتا ہی میرے لیے چیلنج بن گیا لہٰذا اسی وقت میں نے دیہاتی سے ایک سوال اور جڑ دیا "کتنے......[illegible]

"میں نے فوجیوں کی کبھی گنتی نہیں کی۔" جواب آیا اور میں نے اسی وقت دوسرا مہمل سا جواب گھڑا "یعنی اتنے زیادہ ہیں؟ تمہاری ماسی ہے یا......؟"

"کیا ماسی ہے؟" پینڈو نے ذرا تیز لہجے سے پوچھا۔

"ماسی......؟ میری ماں کی بہن اور کون......؟"

میں نے ذرا سنبھل کر جواب دیا۔

"تو پھر یہ فوجی کیا ہے؟ میں نے فوجیوں کی گنتی کبھی نہیں کی......سمجھے......؟"

"اویار میں نے تمہاری ماسی کے فوجی جوان پوچھے ہیں"۔

"اوہاں میری ماسی دے فوجی یعنی میری ماسی کے پتر؟ اس کی اولاد؟ اوئے شہریو......تسی بہت تخولی ہو بلکہ پکے "ڈھولی" ہو......"

چلو جی...... دیہاتی نے مجھے شادی بیاہ میں ڈھول پیٹنے والوں میں شامل کر دیا ہے، مگر میرا سوال وہیں تھا۔ میں نے اپنی جان بچانے کی فکر میں صرف اتنا کہا۔

"کتنے......؟" اور جواب میں دیہاتی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "دس"۔

بس بھئی بس زیادہ بات نہیں سیٹھ صاحب میں نے دس کے جواب میں فلمی گیت کا مصرعہ جڑ دیا اور پینڈو مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے گھورتا ہوا خاموش ہو گیا سو مجھے بھی اپنے منہ پر ٹیشو، تاول یا تولیہ رکھنا پڑا۔

ماسی کا مطلب ہے...... ماں ٹھنڈی گرم چھاں کی سوتیلی نہیں سگی بہن......لیکن یہ گھروں میں کام کرنے والی یا والیوں کو پتہ نہیں اتنا بڑا درجہ کس شوہر کی دشمن یا دشمنوں نے دے رکھا ہے معمولی سی حیثیت کی ماسیوں کو ان کی ماؤں کی بہنیں بنا دیا ہے بلکہ تندیں بنا کے انہیں سر جھاڑنے کے لیے سر پر چڑھا رکھا ہے شاید اس لیے کہ ہوم منسٹری [illegible] شوہر [illegible] جنوں کو یعنی اپنی [illegible] ہی نہیں [illegible] کر سکتیں اسی

لیے انہوں نے شوہروں کی بہنوں کو گھروں کی نوکرانیاں دوسرے لفظوں میں ماسیاں بنا دیا ہے یا پھر اس خطرے کے پیش نظر کہ ان کے شوہر ماسیوں پر بگڑتی ہوئی یا چبھتی ہوئی نظر نہ رکھیں انہیں ماسی کا خطاب دے دیا ہے لیکن فائدہ تو انہیں پھر بھی نہیں ہوا کہ ماسی کی بیٹی کے بقول ہزار پردے ڈالنے کے باوجود شوہروں کی جان تو صرف ماسیاں ہی ہیں، آپ کو پتہ ہی ہوگا کہ لفظ "ماسی" طنزیہ طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جی ہاں جیسے دو پڑوسیوں کے درمیان جنگ ترکی، قبرص اور یونان چھڑ گئی، گھمسان کی لفظی گولہ باری ہو رہی تھی کہ تیسری پڑوسن بیچ میں دھم سے کود پڑی اور بیچ بچاؤ کرانے لگی جب تیسری نے ایک خاتون کو "نیچا" مار کر اپنے کلاوے میں لے لیا اور دونوں کو الگ الگ کرنے کی کوشش کی تو دوسری نے نشانہ باندھ کر پہلی کو اس کے ابھرتے ہوئے پیٹ پر دولتی جھاڑ دی اب تو پہلی کے لیے چیلنج بن گیا کہ وہ بھی مدمقابل کو دولتی کی نوک پر رکھ لے ورنہ سخت قسم کی توہین عدالت ہوگی لہٰذا اس نے کلاوہ مارنے والی عورت سے اپنی جان چھڑاتے ہوئے تیسری سے طنزیہ جملہ کہہ دیا۔ ارے چھوڑ ماسی کی بچی...... تم کہاں کی ماسی کی بچی بھی درمیان میں آ کودی ہو؟

لیکن جب تیسری نے ماسی کو چھوڑنے میں ذرا سی عجلت سے کام لیا تو دوسری نے جھٹکا دے کر تیسری سے اپنی جان چھڑائی لیکن دوسری کے لیے اس کا جان چھڑانا عذاب ہو گیا کہ دوسری نے پہلی کے پیٹ پر ایک شاندار "ککّ" رسید کر دی اور ساتھ میں اسے طنزیہ جملہ بھی کہہ دیا۔

"ماسی دی پتر؟"

اب تو تیسری کی پھرکی فل سپیڈ سے گھوم گئی کہ ہائیں...... میں اور ماسی دی پتر؟ یعنی میں اور [illegible] کمین کی بیٹی؟ میں کسی کمین کی [illegible] ہوں؟ اچھا ٹھہر تو [illegible]

ابھی حزہ چکھاتی ہوں اور اس نے اسی وقت آباد دیکھا نہ گیا دھڑ سے دوسری کو اپنا ہاتھ گھما کر زور سے تھپڑ دے مارا اتفاق کہیے دوسری تو اچانک تھوڑی سی پیچھے ہٹ کر زنانے دار تھپڑ سے بچ گئی لیکن اس کے پیچھے ہی کھڑی ہوئی پہلی اس تھپڑ کی زد میں آ گئی۔ اب تو سہ فریقی ہاتھا پائی کی جنگ عروج پر تھی اور ان کے مشغل میلہ دیکھنے والوں کے ٹھٹھے کے ٹھٹھے اس ٹھٹھولوں سے بھرپور لطف اندوز ہوتے ہوئے تالیاں پیٹ رہے تھے۔

ایک ماسی نے اپنی غربت کا شہد کی مکھیوں پھر صرافی مکھیوں کی طرح جہاں جہاں کا رونق افروز رونا روتے ہوئے ایک بڑی ہی دلچسپ بات بتائی کہنے لگی۔ میری ساسو ماں "بج گال" ...... کی طرح ہر وقت منہ مارتی رہتی تھی ایک مرتبہ اس نے میرے شوہر کی کسی بات سے خوش ہو کر تعریف کی اور پھر اس موقع پر اسے اپنی طرف سے یہ دعا بھی دی:۔

"جا وے پترا...... تیرے پاس بہت دولت ہو، تیرا ہاتھ اوپر رہے نیچے نہ ہو، اور اس کا ہاتھ واقعی ہی اوپر رہا کہ وہ ایک پرائیویٹ دفتر میں کیشیئر جا لگا، دن بھر دولت اس کے ہاتھ میں بھنگڑا ڈالتی لیکن شام ہونے سے پہلے پہلے اس کے ہاتھوں میں رقص بھنگڑا کرنے والی دولت کا رقص اور سولو ڈانس ختم ہو جاتا تھا کہ مختلف "مد" میں وہ خرچ ہو جاتے تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ" اس کا ہاتھ اوپر ہی رہتا تھا نیچے نہیں آتا تھا اس کا ہاتھ اس وقت نیچے آتا تھا جب اسے "تن خواہ" یا پھر تنخواہ ملتی تھی"۔

ایک اور نخرہ کرو ماسی نے بتایا کہ ان کے گھر پر زکوٰۃ دینے والے سرکاری کارندے آئے اور اس سے فارم پر انگوٹھا لگوانے سے پہلے ایسا تاثر دینے لگے جیسے وہ مجھے کئی ہزار روپے زکوٰۃ دیں گے اور جب اس نے اپنا انگوٹھا فارم پر گاڑ دیا تو میری خدمت عالیہ [illegible] میں...... مجھے [illegible] ایک [illegible] روپے کا نوٹ [illegible] نہایت فخر و غرور

کے ساتھ پیش کر دیا جس سے دس کلو آٹا بھی شاید پورا نہیں آتا تو دیگر اخراجات کا کیا بنے گا؟ میری زکوٰۃ کمیٹی والوں سے ہاتھ جوڑ کر گزارش ہے کہ وہ اپنا نوٹ واپس لے جائیں میرے اخراجات "ماسی گیری" سے ایسے جیسے تیسے پورے ہو ہی جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے بھیک میں دیے ہوئے ایک ہزار روپے کے نوٹ کو ہوا نہیں لگنے دی اور اسی لیے وہ اب تک کڑک ہے بالکل نیا نکور ہے۔ بلکہ میک اپ زدہ ہے۔ اسے واپس لے جائیں مجھے خطرہ ہے اس ایک ہزار کے نوٹ کی بنا پر میری کروڑوں کی جان نہ چلی جائے کہ اس نوٹ کو چھانے کے لیے بے شمار ڈاکو چور اپنی غربت مٹانے کے لیے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں"۔

ایک ماسی میری سگی ماسی کے گھر میں بھی کام کرتی تھی وہ روزانہ صبح دس بجے کے قریب میری ماسی کے گھر آتی تھی اور دو بجے کے قریب "کھانا ڈاف" یا پھر "ڈکار" کر نکل جاتی تھی ایک روز ماببدولت صبح ہی اپنی ماسی کے گھر مہمان بن کر وارد ہو گیا اور اپنی ماسی جی سے اپنے سر پر پیار لے کر ادھر اُدھر کی ٹھیک ٹھاک مارنا شروع کر دیں ہم باتیں کرتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک میری ماسی جی کے گھر میں کام کرنے والی ماسی کی آواز میرے کانوں کے دھانوں یا پھر دونوں اطراف کے ماتھوں یا ماتیک تک پہنچی......

"ماسی..... نی ماسی..... یاراں واویلا ہو گیا اے"۔

پہلی بار تو میں نے اس کی آواز پر کچھ توجہ نہیں دی۔ سنی ان سنی کر دی تھی لیکن وہی آواز جب مسلسل آنے لگی تو میرے "کھڑ کنے" سے کان "ڈنگی" کے کان کی طرح موسم کا حال جاننے کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن مطلع ابر آلود ہونے لگا۔ ہلکے بادلوں میں سے چلی سی لیکن کھنکناتی ہوئی سی آواز محسوس ہونے لگی، آخر جب کچھ سمجھ نہ آئی کہ ماسی کہہ کیا رہی ہے یا کہنا کیا چاہتی [illegible] جملے کا مطلب کیا ہے......؟ تو پھر میں نے مطلب کو سمجھنے کے لیے اپنے کھڑ کنے سے کانوں میں انگلی پھیری...... اب ظاہر ہے کان میں انگلی پھیرنے سے کان ہی کو مزہ آتا ہے انگلی کو نہیں سو میرے بھی کانوں کو مزہ آنے لگا تھا اس لیے ماسی کی آواز بھی صاف ہوتی گئی۔ اب جب کانوں کی موٹر سائیکل کی طرح اچھی طرح "ٹیوننگ" ہو گئی تو آنے والی آواز بھی کلیئر ہو گئی ماسی کی آواز اب بھی مسلسل آ رہی تھی۔

"نی ماسی یاراں واویلا ہو گیا اے"

لیکن اس جملے کا مطلب "اَلَم غَلَم غَلَّا" ہی تھا سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ

"ماسی کہنا کیا چاہ رہی ہے؟"۔

لہٰذا اس جملے کا مطلب سمجھنے کے لیے میں نے سگی ماسی خالہ اور بجلی خالہ "حقیقی خالہ" ہی ماسی سے مدد لی۔

"ماسی جی یہ ماسی کیا کہہ رہی ہے؟"

"وے پتر، یہ ماسی چائے پینے کی بڑی شوقین ہے میرا خیال ہے اس کا جسم نچوڑا جائے تو اس کے جسم سے خون کی جگہ بھی چائے ہی نکلے گی اور اس وقت یہ مجھے یاد کرا رہی ہے کہ دن کے گیارہ بجنے والے ہیں لہٰذا چائے بنائی جائے اور جب تک میں ماسی کو "اچھا" کی آواز نہیں دوں گی اس کی یہ کیسٹ ٹیپ ریکارڈر پر لگی ہوئی یونہی چلتی رہے گی اور جب تک میں اس کے آگے چائے رکھ نہیں دوں گی اور یہ شڑوپ شڑوپ کی آواز کے ساتھ پی نہیں لے گی یہ برتنوں کو دھونے کے لیے "چوکے" پر یونہی بیٹھی ہوئی آوازیں نکالتی رہے گی۔ اس کے بعد بھی یہ باتیں زیادہ اور کام کم اس وقت تک کرتی رہے گی جب تک دن کے دو نہیں بج جاتے اور جب دیکھے گی دو بجنے والے ہیں اور اب روٹی کے گی تو فٹافٹ ہاتھ دھوئے گی اور کھانا کھانے کے لیے وہ بیٹھ رہے [illegible]

میں نے اپنی ماسی کی پوری بات سن کر ادب کے ساتھ عرض کیا۔

ماسی جی اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی اس ماسی کے ساتھ تھوڑا سا مذاق کرنا چاہتا ہوں۔

اجازت ہے۔ میری ماسی جی نے بلا سوچے سمجھے اکبر بادشاہ کی طرح اپنی انارکلی کو چھیڑنے کی اجازت دے دی اور میں نے بھی اپنی ماسی جی کے حضور میں کورنش بجا لاتے ہوئے اس کے اختراقی حکم پر فوری عمل کیا۔ اور اسی وقت کمرے یا چھت کی طرف اپنے قدم بڑھا دیئے یہاں ماسی فارغ بیٹھی ہوئی "جسم توڑ" انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اسے مودبانہ تہذیب کے ساتھ سلام عرض کیا اور عرض کی۔

"ماسی ...... آپ یہ ایکسرسائز نہ کریں اور یہ سب فضولیات چھوڑ دیں ...... اور پہلے اپنا حال احوال سنائیں...... کیسی ہیں؟ ماسی اس اخلاق سے بہت تو نہیں تھوڑی سی متاثر ہوئی اور اسی خوشی میں اس نے میرا بھی حال دریافت کرلیا کہنے لگی۔

"ویرا تیرا کیہ حال اے......؟" میں نے جواباً کہا۔

"بہت اچھا حال ہے آپ سنائیں کیسی گزر رہی ہے؟" جواب میں برا سا منہ بنا کر کہنے لگی۔

بس جی میں ٹھیک ہوں ......" اس کے ساتھ ہی اس نے مزید کچا چٹھہ کھول دیا، کیا ٹھیک ہونا ہے جی مہنگائی نے جان کڈھ لی ہے بس میری اکھیاں تے اللہ ول گڈیاں نے۔ ہاں جی او ہی ہم غریباں کے دن سنوارے گا پیسے پیسے نوں ترستی ہوں، اللہ کدے تے ساڈی وی سنے گا، ماسی نے فوراً ہی مجھ سے "لوٹ" توڑنے کے لیے مجھے اپنی غربت کی کہانی سنا دی لیکن ماسی کی طرح میں بھول شغے کچے بنٹوں سے نہیں کھیلا تھا لہٰذا میں نے بھی اسی لیے لمبی چھوڑی۔

اچھا اچھا...... تب ہی...... میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو چونک کر پوچھا...... کی......؟؟"

بس آپ اٹھیں...... ایسی مشکل میں صرف میں ہی آپ کے کام آسکتا ہوں...... بس آپ فٹافٹ اٹھیں...... اٹھیں اٹھیں...... آپ کی مشکل کا حل صرف اور صرف میرے پاس ہے...... اور کسی کے پاس نہیں"۔ یہ میری ماسی جی تو بس باتیں کرنا جانتی ہے حل کوئی بھی نہیں...... آپ اتنی دیر سے ماسی...... ماسی ...... پکارے چلی جارہی ہیں کب سے چلی جارہی ہیں ماسی جی یاراں وا ویلا ہو گیا اے۔

مگر اس کو اثر ہی نہیں...... آپ کی آواز کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دے رہا، حد ہوگئی ہے...... آپ اٹھیں...... اور بس میرے ساتھ چلیں، میں نے ماسی کے کندھے کو دروازہ سمجھ کر کھٹکھٹایا اور پھر کندھے ہی سے پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا ماسی اٹھتے اٹھتے کہنے لگی۔

"کدھر جانا ہے" اور میرے ساتھ چل پڑی لیکن دروازے سے باہر نکلتے نکلتے ایک بار پھر کہنے لگی۔

"ویرا کتھے جانا ہے؟" (بھائی کہاں جانا ہے؟)

فکر نہ کریں ...... ماسی...... آپ میرے ساتھ چلیں...... بس آجائیں، اور میں اسے دروازے سے باہر لے گیا، باہر لے جا کر اسے سڑک کے کنارے تپتی سلگتی دھوپ میں کھڑا کر کے کہا۔

"لیں ماسی...... آزادی کے ساتھ یہاں کھڑے ہو کر اپنے آنے والے "یاروں" کا انتظار کریں اور ماسی ہکا بکا ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی اور جب میری اون دار ریکارڈ ٹاپ کی "کرتوت" کی خبر واپس ماسی جی کے گھر میں پہنچی تو پھر اگلی کہانی نہ پوچھیے۔ چلتے چلتے اتنا بتا دوں کہ ماسی نے میری ماسی جی کو نوکری چھوڑ دینے کی دھمکی دے دی تھی لیکن بعد کی اطلاع کے مطابق ماسی آج بھی میری ماسی جی کے لیے سوڑے کی کسلی ٹریٹمنٹ دور جمل ہے"۔

......

پھلوں کا بادشاہ......آم

بلال تنویر بٹ

آم کی کاشت کا ماخذ کہلانے کے باوجود ہم اس کی پیداوار میں میکسیکو اور انڈونیشیا جیسے ممالک سے پیچھے رہ گئے ہیں! حالانکہ پاکستانی آم کا ذائقہ اور کوالٹی کے اعتبار سے کوئی ثانی نہیں۔

اپریل، مئی، میں اگر آپ صبح کی نماز کے بعد چہل قدمی کے لیے شہر سے نکل کر نزدیکی کسی گاؤں میں جائیں، جہاں آم کے باغات ہوں، تو آم کے پودوں پر کھلے بور کی منفرد مہک آپ کے دماغ کو تر و تازہ کر دیتی ہے۔ اُن دنوں آم کے پودے پور سے ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں اور چاروں طرف بور کی

خوشبو ہی خوشبو ہوتی ہے۔ چند روز بعد جب اس بور میں دانہ تنک جاتا ہے تو فالتو بور خود بخود زمین پر گر جاتا ہے اور صرف دانے رہ جاتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ جتنا بور شاخوں پر لگتا ہے دانے اس سے کم نکلتے ہیں کیوں کہ اگر پورا بور ہی دانوں میں تبدیل ہو جائے تو موٹی موٹی شاخیں بھی پھل کی وزن دار ہونے پر ٹوٹ جائیں۔ مٹھاس ذائقے اور غذائیت کے لحاظ سے پھلوں کا بادشاہ کہلانے والے "آم" کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مختلف تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ آم کا درخت ہندوستان میں شروع سے پایا جاتا تھا۔ چار ہزار سال سے پہلے کی تاریخی اہمیت کے حامل اس درخت کے پھل کو سنسکرت زبان میں "Amra" کہتے ہیں۔ 640 صدی عیسوی میں Hsiian-jsang نامی سیاح ہندوستان سے واپسی پر آم اپنے ساتھ لے گیا اور اس طرح پہلی بار آم باہر کی دنیا میں متعارف ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں مغل بادشاہ اکبر اعظم نے پہلی بار ایک باقاعدہ باغ کی بنیاد رکھی جس میں تقریباً ایک لاکھ آم کے درخت ترتیب وار لگائے گئے۔ آج دنیا کے کافی سارے ممالک میں آموں کے باغات موجود ہیں۔

انٹرنیٹ پر موجود آم کے باغات کا رقبہ اور پھل برآمد کے اعداد و شمار کا جائزہ لیں تو حیران کن نتائج سامنے آتے ہیں کہ آم کا اصل وارث ہندوستان (بشمول پاکستان) آم کی کاشت اور برآمد میں دنیا کے دیگر ممالک سے پیچھے رہ گیا ہے۔ حالانکہ ذائقہ اور کوالٹی میں پاکستانی آموں کا کوئی ثانی نہیں۔ پھر بھی میکسیکو اور انڈونیشیا اس وقت آم کے باغات اور پھل کی برآمد میں پہلے نمبر پر ہیں۔ دوسرے نمبر پر فلپائن ہے جس کو یہ [illegible] بھی [illegible] ہے کہ [illegible] کا سب سے میٹھا [illegible] (Elena) [illegible] اس ملک کی پیداوار ہے۔ تیسرے نمبر پر پاکستان، چوتھے نمبر پر برازیل ہے۔ اور انڈیا جو کہ خود کو اصل وارث کہتا تھا، پانچویں نمبر پر ہے۔ بھرپور غذائیت کی وجہ سے آم کے پھل کی پوری دنیا میں بہت مانگ ہے۔ صرف امریکہ بہادر سالانہ تقریباً تین سو ہزار ٹن سے زائد آم درآمد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ چین، ہانگ کانگ، نیدرلینڈ، یو اے ای، فرانس، ملائیشیا، یو کے، سعودی عرب، جرمنی، سنگاپور وغیرہ ایسے ممالک میں شامل ہیں جو آم بڑی تعداد میں درآمد کرتے ہیں۔ حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے پاکستان اور ہندوستان پیچھے رہ گئے اور باقی ممالک نے آم کو باقاعدہ ایک انڈسٹری کے طور پر اپنایا اور اپنے ملک کے لیے کثیر زرمبادلہ کمایا۔

وطن عزیز میں ہر سال آم پر سیمینار ہوتے ہیں۔ حکومتی عہدے دار بڑی بڑی تقریریں کرتے ہیں۔ بڑے بڑے دعوے کیے جاتے ہیں مگر جب آم کا سیزن شروع ہوتا ہے تو کاشتکار روایتی ٹھیکے دار اور مڈل مین کے چکر میں پڑ کر "گھن چکر" ہو جاتا ہے۔ آم کی زیادہ پیداوار اور ایکسپورٹ کے لیے چند تجاویز پیش خدمت ہیں۔

1۔ زرخیز اور قابل کاشت زمینوں کو رہائشی کالونیوں میں تبدیل کرنے پر مکمل پابندی لگائی جانی چاہیے۔ آم کے مرکز ضلع ملتان کو ڈی ایچ اے سمیت تمام نجی رہائشی کالونیوں سے پاک علاقہ قرار دیا جائے۔

2۔ ضلع کی سطح پر مینگو ریسرچ سنٹر بنائے جائیں۔ ان سنٹرز میں مینگو کوالیفائیڈ افسروں کے علاوہ مینگو گروورز کو بھی نمائندگی ملنی چاہیے۔

3۔ چیمبر آف کامرس کی طرز پر چیمبر آف مینگو گروور قائم ہونی چاہیے۔ مینگو ریسرچ سنٹر اس چیمبر کے ماتحت ہونا چاہیے۔ اس چیمبر [illegible] حکومتی [illegible] ضلع [illegible] اس چیمبر کا باقاعدہ [illegible] سال [illegible] ہونا [illegible] اس۔ علاوہ اس

چیمبر کا باقاعدہ دفتر اور سہولیات مہیا ہونی چاہیے۔

4۔ ضلعی سطح پر مینگو سیمینار ہونے چاہئیں۔ یہ سیمینار آم کے علاقوں کے علاوہ پورے ملک کے چھوٹے بڑے شہروں میں ہونے چاہئیں۔

5۔ ٹھیکے دار کی نسبت باغ کا مالک آم کے پھل کی کاشت بہتر طریقے سے کرتا ہے اور کوالٹی کا خاص خیال رکھتا ہے مگر مالی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے کاشت کار مجبور ہو کر پودے پر کھڑا پھل سرمایہ دار کو سستے داموں بیچ دیتا ہے۔ اس لیے آم کے سیزن میں باغبانوں کو ون ونڈو سکیم کے تحت زرعی قرضے آسان شرائط پر جاری کیے جائیں تاکہ ٹھیکے دار اپنے سرمایہ کی وجہ سے باغبانوں کا استحصال نہ کر سکے۔

6۔ آم کے باغات کے علاقوں میں زرعی ادویات (برائے سپرے) کے لیے حکومتی سطح پر چیمبر آف مینگو گروورز کے ذریعے سنٹرز بنائے جائیں جہاں کاشت کاروں کو زرعی ادویات نقد و آسان اقساط پر مہیا کی جائیں۔ پرائیویٹ سیکٹر یہ کام کر رہا ہے مگر ادویات کا معیار انتہائی ناقص ہے۔ ان پر حکومتی چیک اینڈ بیلنس نہ ہونے کے برابر ہے۔ مزید برآں کچھ ملٹی نیشنل کمپنیوں نے آم کے درخت کے لیے ایسی دوا تیار کی ہے جس سے مذکورہ درخت اپنی بساط سے زیادہ پھل دیتا ہے۔ یہ غیر فطری عمل ہے جو کہ درخت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس دوائی کے استعمال سے درخت کی اوسط عمر کم ہو جاتی ہے اور وہ بے کار ہو کر پھل دینا ختم کر دیتا ہے۔ ایسی غیر فطری ادویات پر مکمل پابندی ہونی چاہیے۔

7۔ آم کا سیزن مئی سے لے کر اگست تک ہوتا ہے ان چار ماہ میں ایکسپورٹ پروموشن بیورو کا ایک افسر آم کے ضلعوں میں چیمبر آف مینگو گروورز میں تعینات کیا جائے تاکہ جو گروورز اپنے آم کو بیرون ملک بھیجنا چاہتے ہیں وہ با قاعدہ ان کی رہنمائی کرے۔

بھیڑوں کے لیے خصوصی ہوٹل

کتے اور بلیوں کے بعد اب جاپان میں بھیڑوں کے لیے بھی خصوصی ہوٹل قائم کیا گیا ہے۔ Guest Sheep Hotel ی اس شاندار عمارت میں بھیڑوں کے علاوہ دوسرے تمام جانوروں کا داخلہ ممنوع ہے جہاں پالتو بھیڑوں کے مالکان شہر سے باہر جانے کی صورت میں اپنی بھیڑوں کو یہاں ٹھہرا سکتے ہیں۔ اس ہوٹل کے مالکان کا کہنا ہے کہ دنیا بھر کے امیر افراد میں بھیڑ پالنا ایک فیشن بنتا جا رہا ہے اور اس ہوٹل کا مقصد انہیں بہتر سہولیات فراہم کرنا ہے۔

(مرسلہ: فرقان احمد۔ کراچی)

8۔ حکومت کی طرف سے مینگو گروورز کے لیے ایکسپورٹ کے پیچیدہ نظام کو آسان کیا جائے تاکہ عام کاشت کار بھی اپنے آم بیرون ملک بھیج سکیں۔ اس کے علاوہ پہلی بار آم ایکسپورٹ کرنے پر کاشت کار کو سہولیات دینی چاہئیں۔

9۔ آم کے باغات کے علاقوں میں شوگر ملیں نہیں لگنی چاہئیں۔ رحیم یار خان جو باغات کے لیے مشہور تھا وہاں اتنی زیادہ شوگر ملیں بااثر لوگوں نے لگا دی ہیں کہ باغبانوں نے باغات کٹوانے شروع کر دیے ہیں۔

10۔ آم کے سیزن (چار ماہ) کے لیے پی آئی اے کو ہدایت ہونی چاہیے کہ وہ کراچی، ملتان اور رحیم یار خان کے ایئر پورٹ پر روزانہ کی بنیاد پر کارگو جہاز (C-130) مہیا کرے کیوں کہ آم کی شیلف لائف کم ہوتی ہے اس لیے آم کے علاقوں میں کارگو [illegible] کی سہولت ہونی چاہیے۔ اس وقت صرف کراچی [illegible] اسلام آباد اور [illegible] آباد سے

کار کو سروس مہیا ہے۔

11۔ مینگو پراسیسنگ یونٹس کے ذریعے آم کی شیلف لائف بڑھائی جا سکتی ہے لہٰذا حکومتی سطح پر آم کے علاقوں میں پلانٹس تعمیر کیے جائیں تاکہ عام کاشت کار بھی اس سہولت کا فائدہ اٹھا سکیں۔

12۔ بیرون ملک پاکستانی سفارت خانوں میں آم سیزن کے دوران چیمبر آف مینگو گروورز کا نمائندہ عارضی طور پر تعینات کیا جائے جو بیرون ملک آم کی ترسیل میں مدد فراہم کرے اور غیر ضروری تاخیر سے بچا جا سکے۔

13۔ بیرونی ممالک میں آم کے سیزن میں مینگو شو منعقد کرائے جائیں۔ آم کا سیزن چونکہ گرمیوں میں ہوتا ہے اس سیزن میں یورپ، امریکہ، کینیڈا، روس وغیرہ میں موسم خوشگوار ہوتا ہے اس لیے یہ شو سفارت خانوں کی عمارت کی بجائے عوامی مقامات پر کرائے جائیں۔ اس شو میں سفارت خانوں میں تعینات افسروں کے عزیز و اقارب اور دوستوں کے علاوہ عام لوگوں کو بھی مدعو کیا جائے تاکہ پاکستانی آم کی مٹھاس ہر خاص و عام تک پہنچے۔ شو کے بعد آم شو میں شامل افراد کو مفت دیے جائیں جیسے تاکہ لوگوں کو ان کا عادی بنایا جائے۔ اس تمام شو میں چیمبر آف مینگو گروورز کا نمائندہ اپنی خدمات سرانجام دے سکتا ہے۔

14۔ بیرون ممالک میں قائم سفارت خانوں میں علیحدہ مینگو سٹور بنائے جائیں تاکہ ایکسپورٹر عارضی طور پر اپنا آم اس میں سٹور کر سکیں۔ اس کے علاوہ آم کے سیزن (چار ماہ) کے لیے بیرون ممالک میں حکومتی سطح پر مختلف شہروں کے شاپنگ سنٹرز میں دکانیں کرایہ پر حاصل کی جانی چاہئیں جہاں صرف پاکستانی آم فروخت کیا جائے۔

15۔ مینگو کی [illegible] کے بارے میں انٹرنیٹ اور الیکٹرانک میڈیا [illegible] مہم چلائی جائے۔ شوز کا اہتمام کیا جائے جس میں ڈاکٹرز کی خدمات حاصل کی جائیں جو انسانی جسم کے لیے آم کی افادیت پر روشنی ڈالیں۔

16۔ جس طرح "Popeye the Sailor" کارٹون طاقت کے لیے پالک کا استعمال کرتا ہے، "Humty Dumty" انڈے کی افادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح بچوں میں آم کی چاہت بڑھانے کے لیے مینگو سپرمین کارٹون ذرائع ابلاغ میں متعارف کرایا جائے۔

17۔ مشروب ساز کمپنیوں کو ہدایت دینی چاہیے کہ وہ مینگو فلیور انرجی ڈرنک بھی متعارف کرائیں۔

18۔ حکومتی سطح پر صدر پاکستان، وزیراعظم پاکستان، چیئرمین سینٹ، سپیکر قومی اسمبلی، وفاقی وزراء، آرمی چیف، چیف جسٹس سپریم کورٹ دنیا کے تمام ممالک میں اپنے اپنے ہم منصب افراد کو پاکستانی آم تحفے میں بھیجیں۔

19۔ جس طرح ہاکی پاکستان کا قومی کھیل ہے۔ چنبیلی قومی پھول ہے۔ اسی طرح آم کو قومی پھل کا درجہ دیا جائے اور پاکستان کے قومی بجٹ میں آم کا عکس شامل کیا جائے۔

20۔ ویلنٹائن ڈے، کشمیر ڈے، مزدور ڈے، فادر ڈے، مدر ڈے کی طرح آم کے سیزن (مئی سے اگست) کے مہینوں میں سے کوئی ایک دن منتخب کیا جائے جس کو مینگو ڈے کے طور پر قومی سطح پر منایا جائے۔ اسی طرح بیرون ممالک میں قائم سفارت خانوں میں بھی ہر سال یہ دن منایا جائے۔ اس دن پاکستان اور بیرون ملک مینگو شوز منعقد کرائے جائیں۔

مندرجہ بالا تجاویز سے پاکستانی آم کو عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوگی اور آم کی ایکسپورٹ میں اضافہ ہوگا۔ جس سے کثیر زرمبادلہ حاصل ہوگا۔

کسی کی ڈفلی پر میرا راگ

نوشابہ اختر

وہ تو جیسے میرا ذہن پڑھ چکا تھا "فون بند نہ کرنا بہت دُکھ سے بتا رہا ہوں کہ کل ایک شادی میں بارات اس لیے واپس چلی گئی کہ غریب والدین سٹیج کو "مارننگ شوز" کے مطابق سجا نہیں سکے اور Reception بھی ویسا نہیں تھا۔

گھر گھر کی کہانی، ہماری نئی نسل کے اپنی اقدار سے دُور ہونے کا المیہ

فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔ میں نے اُس وقت صلوٰۃ التسبیح شروع کی تھی اور عموماً اس میں پندرہ سے بیس منٹ ضرور لگ جاتے ہیں۔ بہرحال گھنٹی بجتی رہی۔ بجانے والا بھی کافی مستقل مزاج بندہ ہی تھا ورنہ بندہ یہی سوچ لے کہ کہیں کوئی واش روم میں بھی ہوسکتا ہے۔

بہرحال نماز مکمل کرکے اور دعا کے بعد میں نے فون اُٹھایا، نمبر تو دیکھا بھالا تھا۔ مگر آواز کچھ نامانوس سی لگی۔

''گڈ مارننگ''۔ میں حیران کہ کون ہے، میں نے حسب عادت السلام علیکم کہا۔ تو ذرا جھنجھلائی ہوئی آواز آئی۔ ''گڈ مارننگ کا جواب بھی گڈ مارننگ ہی ہوتا ہے''۔

''آپ کون ہیں۔ ذرا تعارف تو کرادیں''۔ میں نے پوچھا تو جیسے بھڑ کا چھتا ہی چھڑ گیا۔

''او ہیلو! خود پہچانو ایک تو تم لکھاری اوٹ پٹانگ ڈرامے لکھ کر ساری قوم کی مت مار رہے ہو اور پھر کہتے ہو تعارف کرواؤ''۔

مجھے بڑے زور کی ہنسی آئی ''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں افسانہ نویس ہوں ڈرامہ نویس نہیں''۔

''تم میں سے کسی کے بھی سر پر سینگ نظر نہیں آئے مگر ہو تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے''۔ بڑی رُعب دار آواز تھی۔

''دیکھو بھئی تم جو بھی ہو اس وقت تو مجھے اجازت دو۔ مجھے ایک کلاس اٹینڈ کرنی ہے اللہ حافظ''۔

''ہائے ہائے! پھر بات ہوگی'' اس نے اللہ حافظ کے جواب میں ہائے کہہ کر پھر مجھے تھپڑ دے مارا۔

سب کام کرتے میرا دماغ اس بات پر اُلجھا رہا کہ یہ کون تھا؟ نمبر جانا پہچانا سا تھا مگر آواز اور لہجہ عجب بے گانہ سا۔

دوپہر کو کھانا کھا کر مجھے تھوڑا لیٹنے کی عادت ہے۔ ابھی میں بیڈ پر لیٹی ہی تھی کہ پھر فون بج اُٹھا۔ ریسیور اُٹھا کر میں نے السلام علیکم کہا تو پھر وہی آواز۔

''گڈ آفٹر نون! ابھی قتل تو نہیں ہوا''۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ فرمائیں کیا بات ہے اور پلیز اب بتا ہی دیں کہ آپ کون ہیں؟'' میں نے بات آرام سے کی [illegible] جھنجھلاہٹ

''او ہیلو!'' عجیب طنزیہ گرہ تھی مجھے اس او ہیلو سے بڑی چڑ ہے۔ اور وہ تو جیسے مجھ سے خار کھائے بیٹھا تھا ''اب اس کے بعد میرا تعارف نہ مانگنا لیکن مجھے تم یہ بتاؤ کہ یہ تم لکھاری اتنے منافق کیوں ہو، خود تو گوتم بدھ بنے رہتے ہو اور قوم کو کیا کیا درس دے رہے ہو، کیسی کیسی آسان ترکیبیں تھیں ڈراموں میں جوانانِ ملت کو بے راہ رو کرنے کی''۔

''دیکھو بھئی! مجھے ڈرامہ نگاری کا کوئی شوق نہیں تم ان ڈرامہ لکھنے والوں کا سر کھاؤ نا، میں تو افسانہ نگار ہوں۔ کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ اصلاح کا کوئی پہلو کیا جائے'' میں نے معذرت خواہانہ رویہ اپنا لیا تھا۔

ادھر سے ایک تمسخر آمیز قہقہے کی آواز آئی ''بہت ہی اچھے، گڈ ویری گڈ، ڈرامے دیکھے نہیں کبھی''۔

''ہاں! دیکھتی ہوں اور اُن پر تنقید بھی کرتی ہوں''

''تنقید اپنے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر، یہ بھی کوئی تنقید ہے۔ یہ تو منافقت ہے ذرا میدان میں نکلو اور لکھو کہ یہ ڈرامے ہمارا ستیاناس کر رہے ہیں''۔

اور میں واقعی سوچ میں پڑ گئی۔ مجھے یاد آیا کافی عرصہ پہلے ایک ڈرامہ جنگل آتا تھا جس میں بھینسیں چوری کرنے والوں نے بھینسوں کے پاؤں چادروں میں لپیٹ دیئے تھے تاکہ کھرا نہ اُٹھایا جاسکے۔ اور گھر کے بزرگوں نے اعتراض کیا تھا کہ یہ اب نئی نئی راہیں بھار رہے ہیں ڈاکے ڈالنے کی۔

تو آج کیا ہو رہا ہے۔ اخلاق پر ڈاکہ ڈالنے کے سارے انتظام ہو رہے ہیں۔ مجھے پرانے خیالات کی مالک ہونے کا طعنہ بھی مل سکتا ہے لیکن واقعی میرا ذہن اس طرف جھک رہا تھا کہ اصلاح معاشرہ کے لیے کچھ تو کیا [illegible]ئے۔

[illegible] ڈرامے [illegible] ہیروئن جس [illegible] سے شادی

کرنا چاہتی ہے یا دوسرے الفاظ میں ہیرو کے عشق میں مبتلا ہو چکی ہے۔ ماں اُس پر انکار کرتی ہے کیونکہ وہ ہیرو صاحب اُن کے Status پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ ماں کے منع کرنے کے باوجود وہ لڑکی اس سے شادی کر کے ماں کو فون کرتی ہے "ماما! ہم نے شادی کرلی ہے"۔ یہاں پر میں قصور وار ماں کو بھی سمجھوں گی۔ جس نے اپنی بیٹی کو یہ تعلیم بھی نہیں دی کہ اچھائی کس چیز میں ہے اور بُرا کیا ہے۔ کیا صرف سٹیٹس ہی اچھا ہونے کی بنیاد ہے؟ اور جو ماں صرف اور صرف سٹیٹس دینے کے چکر میں مصروف رہ کر بچوں کی تربیت پر توجہ نہیں دے سکتی۔ اس کو ہم سب کیا کہیں گے۔ اور آج یہ گھر گھر کا المیہ ہے۔

آیئے آپ کو بتاؤں، ماں کیا ہوتی ہے۔ وہ جو اپنا من مار کر اولاد کے مستقبل کو سنوارتی ہے۔ خود پڑھی لکھی نہ ہونے کے باوجود اپنی اولاد کو پڑھا لکھا کر ایک اچھا انسان دیکھنا چاہتی ہے۔ جو انہیں بہترین انسانوں کی کہانیاں سنا سنا کر اُن کی روحوں میں اُجالے بکھیرتی ہے۔ اور اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے بعد جب اولاد کو راہ راست پر لانے کے لیے کبھی سختی بھی کرتی ہے تو اس کا انداز مہربانیاں لیے ہوتا ہے۔

اُس دن بھی باجی نے امی سے کوئی بات کہہ دی اور امی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ تم کل سے برقعہ پہن کر سکول جاؤ گی۔ میں تو جناب مجھے سے اکھڑ گئی لیکن وہاں بھی فولادی ہاتھ تھے۔ جائے پناہ ابا جی کو سمجھ کر اُن سے لپٹ کر رو دی۔ ابا جی ابھی مجھے برقعہ نہیں پہننا۔ بڑے لاڈ سے میں نے ابا جی کا ہاتھ پکڑا، بڑے مان کے ساتھ کیونکہ وہاں میری زیادہ شنوائی تھی لیکن نہ جی اصول تو اصول ہوتے ہیں "نہ بیٹا! آپ کی اماں جو کہہ رہی ہیں وہی ٹھیک ہے" ابا جی نے بڑی نرمی اور پیار سے فرمایا اور میں رو پڑی "میں سکول نہیں جاؤں گی" ابا جی امی کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور امی بولیں "ٹھیک ہے پھر تمہاری پڑھائی کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ سوچ لو، امتحان ہونے والے ہیں۔ پڑھنا نہ پڑھنا اب تمہاری مرضی ہے۔ کیا صرف ایک برقعہ نہ پہننے کی ضد میں علم سے محروم رہ جانا چاہتی ہو"۔ یہ سرزنش جس میں گہرا پیار تھا۔ مجھے پریشان کر گیا۔ امی کو پتہ تھا مجھے سکول سے عشق ہے اور انہوں نے بڑے آرام سے میری کمزوری پر ہاتھ رکھا "سوچ لو بیٹا! صبح تک تمہارے پاس کافی وقت ہے" اور میں صبح جب سکول جانے کے لیے یونیفارم پہن کر ناشتہ کرنے کے لیے پہنچی تو نہ جانے کس صدی کا پرانا برقعہ وہی جو آپ سب نے کابل کی پٹھانیوں کو پہنے دیکھا ہے میرے سامنے رکھا تھا اور میں نے آرام سے وہ برقعہ اوڑھا اپنے لڑکپن کے جذبات کو تھپکی دے کر سلا دیا اور آج میں جو کچھ ہوں۔ اپنے والدین کی اس وقت کی تربیت اور بے حد گہرے احساسات سے بھرے پیار کی بدولت ہوں۔

صرف ایک بات نوٹ کیجئے ماں اور باپ دونوں کی ذہنی مطابقت بہت ضروری ہے۔ آج اگر ماں کسی بات سے روکتی ہے تو والد صاحب دیوار چین بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور یوں بچے عموماً والدین کے اس رویے سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے رہتے ہیں۔ یہی والدین کے رویوں کا وہ فرق ہے جو اچھے شہری بننے میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔

دو دن گزر گئے، فون بھی خاموش تھا اور میں بھی سوچوں میں گم تھی کہ کام والی لڑکی اندر آئی "آج پھر کوئی جوڑا پارک میں بیٹھا ہوا ہے آنٹی جی" اس نے کہا اور واپس مڑ گئی۔

مسئلہ دراصل یہ ہے کہ [illegible] پارک کے ساتھ [illegible] نظر آتے ہیں۔

میں اسی وقت باہر نکلی اور ٹہلتی ہوئی پارک میں چلی گئی۔ عشق و عاشقی چل رہی تھی۔ میں اُن کے قریب چلی گئی۔ "السلام علیکم" میں نے حسب عادت سلام میں پہل کی۔ انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا، میں نے لڑکی سے سوال کیا۔ "آپ کون سے سکول میں پڑھتی تھیں اور اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

اس ذلیل اور معقولات پر لڑکے نے میری اطلاع کے لیے لب کھولے "جی یہ میری منگیتر ہے"۔

"بیٹا! کیا آپ اپنے یا اس لڑکی کے گھر میں اس طرح بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں اور میں نے آپ سے نہیں اس بچی سے سوال کیا ہے"۔

"جی جی کرتی" بچی جو بمشکل چودہ پندرہ سال کی تھی۔ کچھ بول نہ سکی "بچے میری ایک بات یاد رکھو، لڑکی کی عزت ایک شیشے کی طرح ہوتی ہے جس میں ایک بار دراڑ آ جائے تو کبھی جڑ نہیں سکتی۔ میں نہیں جانتی آپ کہاں سے آئی ہیں اور کون ہیں لیکن یاد رکھو والدین کی عزت آبرو آپ کے ہاتھ میں ہے چاہے تو انہیں عزت بخش دیں اور چاہیں تو انہیں رسوائی کے گہرے کھڈ میں دھکیل دیں"۔

میں نہیں جانتی ان پر میری باتوں کا اچھا اثر ہوا یا نہیں لیکن وہ لڑکی سکول کی طرف چل گئی۔

فون کی گھنٹی بج رہی تھی میں نے اندر آ کر فون اُٹھایا تو وہی نمبر اور وہی آواز۔

"گڈ ایوننگ! بہت اچھے اب تو آپ مصلح کی پلیٹ اپنے گیٹ پر لگا دیں، واہ آج تو بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا"۔

"بھئی ایک تو مجھے آپ کی سمجھ نہیں آ رہی۔ یہ اصلاح کا کام تو میں کافی عرصے سے کر رہی ہوں اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے یہ قوت عطا کی ہے۔ حالانکہ میرے اپنے بچے مجھے اس بات سے روکتے ہیں کہ "امی کیسے [illegible] آپ [illegible] نے تو نہ [illegible]

جائے، پلیز آپ لوگوں کو نہ روکا کریں"۔

"ہاہاہا" دوسری طرف سے زبردست قہقہہ بلند ہوا۔ "تو آپ بھی جام شہادت نوش فرمانا چاہتی ہیں یعنی بتا رہی ہیں کہ آپ یعنی "میں بھی کچھ ہوں"۔

"بات سنو! خدارا میری باتوں کو غلط مطلب نہ دو۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ یہ تو اللہ کی کرم نوازی ہے کہ وہ مجھے ہمت دیتا ہے"۔ میں نے فون بند کر دیا۔ اب اگر لوگوں سے ڈر کر نیکی کرنا ہی چھوڑ دیں تو پھر نئی پود کو الزام تو نہ دیں۔

میں نے جب ڈراموں پر غور کرنا شروع کیا تو لرز کر رہ گئی۔ موبائل فون نے ہمیں تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ فری چارج اور سستے کال ریٹس اور رات رات بھر کے لیے فری Massages ہم تو اس وقت ایک گہری کھائی کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ ماں باپ کو کچھ خبر نہیں کہ بچے رات رات بھر کیا کر رہے ہیں۔ ایک ہمارے والدین تھے کہ انہیں ہمارے ہر پل کی خبر ہوتی تھی۔ مجھے چونکہ کہانیاں لکھنے کا شوق تھا تو اس لیے بچوں کے رسالوں کے لیے کہانیاں لکھتی تھی اور میری پیاری ماں جو خود پڑھی لکھی تھیں۔ میرے پاس آ جاتیں "اب سناؤ کیا لکھا ہے" اور کئی مرتبہ میرے لکھے جملے کو ایک بہتر جملہ بنا دیتی تھیں اور یقین جانیں اُن کے اس طرزِ عمل نے مجھے بہت زیادہ اعتماد دیا۔

کالے رنگ کی لش پش کرتی پجارو گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ کالے شیشوں والی اس گاڑی میں بھلا کون تھا۔ جی لیلیٰ مجنوں کی نئی جوڑی، تھوڑی دیر بعد گاڑی کا شیشہ نیچے ہوا اور مکڈونلڈ کے ڈبوں اور جوس کی بوتلوں والا لفافہ تھما کر کے باہر پھینک دیا گیا۔ بھلا پجارو کا اخلاقیات سے کیا تعلق لیکن میں تو جل اٹھی۔ فوراً جا کے ان کا شیشہ [illegible]یا۔ شیشہ نیچے [illegible] ہوا کیا" [illegible] ہم لوگ پیسے

دے کر یہاں صفائی کرواتے ہیں اور یہاں کوئی گند نہیں پھینکتا۔ آپ پلیز اس کو اٹھا لیجیے"۔ لو جی پجارو کے مالک کی عزت نفس یہ کام کیسے کرنے دیتی۔ انہوں نے مڑ کر اپنی بے حد سمارٹ سلیولیس' لو نیک شرٹ پہنے گرل فرینڈ کو دیکھا، شاید کہہ رہے تھے کیا کروں لیکن وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے چشم محبت سے کچھ اشارہ کیا۔ پجارو کا مالک نیچے جھکا اور وہ گند والے پیکٹ اٹھا کر گاڑی کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا۔ "شکریہ بیٹا! اب اپنی زندگی کو بھی گندا ہونے سے بچا لینا"۔ بہرحال وہ چلے گئے۔ کہاں یہ تو رب ہی جانتا ہے۔

"آنٹی کیا بچوں کی اخلاقی روحانی پرورش میں والد کا بھی کوئی حصہ ہوتا ہے" یہ میری بیٹی کی ایک دوست مجھ سے پوچھ رہی تھی اور میری نگاہوں میں اپنے والد مرحوم و مغفور کا سراپا گھوم رہا تھا۔

"کیوں نہیں بیٹی! یہ تو رسول اللہ ﷺ کا بھی فرمان ہے کہ "جس باپ نے اپنے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا"۔

وہ زور سے ہنس پڑی "لگتا ہے اس دور کے باپ تو اس اعزاز سے محروم ہی رہیں گے کیونکہ ان کی ذمہ داری بچے کو KFC یا Mcdonald لے جانے کی ہے، روحانی اور اخلاقی پرورش کی نہیں"۔

اس کی آواز میں بڑی کاٹ تھی۔ دو بچوں کی ماں اپنے شوہر سے کیا مانگ رہی تھی۔ کاش آج کا ہر باپ یہ سوچ سکے۔

بات تو ڈراموں سے چلی تھی اور میں کہاں جا نکلی۔ ہاں تو میں اکثر پر رات رات بھر باتیں کرتے دکھاتا تو اکثر ڈرامہ نگاروں کا کمال ہے اور اسی پر بس نہیں اماں جی کے تکیے کے نیچے سے بڑے آرام سے چابی نکال کر گیٹ کھول کر باہر نکل جاتا اور گھنٹے دو گھنٹے بعد لوٹ آتا اور چابی کو واپس رکھ دے [illegible] بھی بڑی [illegible]

بات ہے اور یہ تعلیم بڑے خوبصورت انداز میں ٹی وی سکرین ہماری نوجوان نسل تک پہنچا رہی ہے۔

والدین میں ذہنی ہم آہنگی بالکل نہیں۔ ایسے کہاں ہے؟ دراصل یہ بات معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ میں سائیکاٹرسٹ تو ہوں نہیں کہ کچھ بتا سکوں لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہمارے مرد نے اپنے ذریعے کی بلندی کے لیے عورت کو سیڑھی تو بنا لیا اور اُسے ملازمت کرنے کی اجازت دے دی لیکن وہ جو برتری کا احساس مرد میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے وہ ایک فرق طریقے سے اولاد کے ساتھ برتاؤ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں سے اختلاف جنم لیتا ہے اور وہ اولاد کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے کے ایف سی اور میکڈونلڈ کا سہارا لیتا ہے۔

"اوہیلو!" فون کی تیز آواز سن کر میں چونکی اور فون اُٹھایا تو وہی انتہائی ناپسندیدہ طرز تخاطب۔

"جی ارشاد" میں نے مودبانہ عرض کرنے کی کوشش کی تو ادھر سے پھر ایک خوفناک دھاڑ سنائی دی" وہ ڈرامہ دیکھ رہی ہیں آپ "Tug of War between the Parents"۔

میں فوراً سمجھ گئی یہ کس ڈرامے کی بات ہے" جی یقیناً میں دیکھ رہی ہوں"

"تو پھر اس کے متعلق کیا خیال ہے ذرا بیان کرونا" وہ تو جیسے میرے سے ادھار کھائے بیٹھا تھا۔

"دیکھیے صاحب! اس میں والدہ صاحبہ انتہائی مضحکہ خیز طریقے سے اپنے بھانجے صاحب کا ساتھ نبھانے کی کوشش کر رہی تھیں" میں نے جواب دیا تو ادھر سے تمسخر بھرا قہقہہ اُبل پڑا۔ "چلیں آپ نے اپنی جنس کی بھی کسی غلطی کو پکڑا تو' اب بتا دیں والد صاحب کا کردار کیسا ہے"۔

"انتہائی قابل تعریف۔ لیکن بیٹی کی محبت کے سامنے کہیں کہیں [illegible] بھی کمزور نظر آتے ہیں"۔ ظاہر ہے

میں نے تو بے لاگ تبصرہ کرتا تھا مگر وہ تو اُچھل پڑا۔
"رہنے دیں بے لاگ تبصرہ اس کی ماں کی بے وقوفوں والی حرکت بھی قابل غور ہے"۔
"بالکل ہے۔ چھان پھٹک کر چلنا ہر انسان کے بس کی بات بھی تو نہیں لیکن اولاد کے معاملے میں یہ بہت ضروری ہے۔ کچھ مہمانوں کے آنے کی وجہ سے بات وہیں ٹھہر گئی۔ اور بعض اوقات وقت رُک سا جاتا ہے۔ کئی روز کے بعد کاغذ قلم سنبھالا تو ذہن ایک اور ڈرامے کے طواف کر رہا تھا۔ جس میں ہر کردار دوسرے کردار سے یا تو جھوٹ بول رہا ہے یا پھر اس کے ساتھ فراڈ کر رہا ہے۔ ایک ہی چھت تلے رہنے والے کئی لوگ ہمیں کیا سکھا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی جڑیں کھوکھلی کرتے رہو اور دوسری چیز جو آج کل کے ڈراموں میں دکھائی جا رہی ہے یہ ہے کہ مائیں بچے کی ہر جائز اور ناجائز خواہش پوری کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں اور جب اس کی شادی کی بات چلتی ہے تو اپنا دوپٹہ اُتار کر بیٹے یا بیٹی کے پاؤں میں ڈال دیتی ہیں "میں تمہاری خالہ یا تمہارے ماموں کو یا تمہارے چچا کو یا تمہاری پھوپھی کو زبان دے چکی ہوں۔ اب میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے" اب اس طرح کے دباؤ کے نتیجے میں جو رشتہ بندھے گا اس کی عمر کتنی ہوگی۔ آپ خود ہی بتا دیں۔

فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی اور میرا ذرا برابر جی نہیں چاہ رہا تھا کہ فون سنوں لیکن پھر ریسیور اٹھانا پڑا۔ "آپ کیا ہمسائیوں کے گھر گئی ہوئی تھیں، کب سے فون کر رہا ہوں" اس کی آواز سن کر میں جل سی گئی "تمہارا فون سننے کو جی نہیں چاہ رہا تھا" میں نے صاف دلی سے بیان دیا۔ تو وہ چڑ گیا "اچھا بتاؤ تمہارے پاس سفید کپڑے ہیں یعنی شلوار قمیص دوپٹہ"۔ وہ آج غصے میں نہیں تھا "اگر نہیں ہیں تو پھر جاؤ فورا ایک سفید سوٹ لے کر آؤ تمہاری باجی کی نند کی بھابھی کے بھائی کی تیسری بیوی کی والدہ فوت ہو گئی تھیں اور تمہیں پتہ ہے اب تو سفید لباس پہننا لازمی ہے۔ جاؤ جلدی سے جوڑا خرید کر لاؤ شام چھ بجے تو جنازہ ہے"۔ اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

میری تو ہمیشہ سے یہی عادت تھی کہ جنازے پر جانا ہے یا ختم قل پر صبح نہا دھو کے جو لباس پہنا ہوتا اُسی طرح چلے گئے لیکن اب دیکھیں ہم نے "مشرقی انداز" اپنا لیا ہے نا۔ وہاں تو کفن دفن آرام سے ہوتے ہیں۔ وقت مل جاتا ہے کالا لباس پہننے کا۔ ہمارے لیے تو حکم ہے کہ جنازہ جلد سے جلد اُٹھا لیا جائے۔ یہ ٹی وی والے ہمیں کس طرف لے جا رہے ہیں۔ بہرحال میں نے اسی قمیص کے ساتھ سفید شلوار دوپٹہ جوڑا اور وہاں جا پہنچی لیکن میں تو بے حد مس فٹ تھی۔ ہر طرف سفید جوڑوں میں ملبوس مرد عورتیں تھیں...... اور میں؟

شاید یہ فیشن بہت ہی پرانا ہو چکا ہے۔ امی کہا کرتی تھیں کہ خاوند کی عزت کرنا۔ جن گھروں میں خاوند کو عزت کی سیڑھی سے نیچے گرا دیا جاتا ہے وہاں برکت ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ کی رحمتیں ناپید ہو جاتی ہیں اور ہم نے ہمیشہ ان کی عزت کی اور بدلے میں ہمیشہ عزت پائی بھی اور رب کی رحمتیں بھی جھولیاں بھر بھر کے سمیٹیں لیکن یہاں تو نوک جھوک کو بھی زندگی سمجھا جا رہا ہے۔ اُس ڈرامے میں میاں صاحب پیار بھری تعریف کرتے ہیں کہ انھیں اپنی بیوی پر اس لیے بے انتہا پیار آ رہا ہے کہ اُس کو ماسی کی طرح صفائی کرنا پڑی ہے اور اس پیار بھری تعریف پر دلہن بی بی کی زبان بھی پھول برساتی ہے "یعنی اس ننھی ماسی کی شکل میں میں تمہیں اچھی لگتی ہوں"۔ اور میں پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ہماری کورس کی اُردو کی کتاب میں بالکل ہماری ماؤں کی تصویر تھی۔ میں اگر کہیں ... ہوتی ہوں تو کیا میں ... بن گئی ... کھانا پکاتی ہوں تو کیا میں

باورچن بن گئی۔ گھر کی صفائی ستھرائی کرتی ہوں تو کیا میں جمعدارن بن گئی۔ نہیں بلکہ یہ ایک عورت کی پہچان ہے ایک ایسی عورت کی جو اپنے گھر کو مکمل اور خوبصورت بنانا چاہتی ہے۔

آج کی لڑکی کی تصویر بالکل مختلف ہے۔ گھر میں چاہے وہ جیسی بھی زندگی گزار رہی تھی سسرال جاتے ہی اُسے سب بھول جانا چاہیے۔ مائیں بھی تو ہوا دے رہی ہوتی ہیں "جو بھی چاہے کرو، ہم تمہارے ساتھ ہیں"۔ لڑکیوں کے نزدیک شادی تو ہوتی ہی عیش موج کا نام ہے اور پھر جب ذرا مختلف حالات ملیں تو آج کی لڑکیاں طلاق کے مطالبے سے بھی نہیں گھبراتیں، ہاں دے دو مجھے طلاق مجھے تمہارے ساتھ رہنے کا کوئی شوق نہیں۔ دراصل جس عمارت کی بنیاد ہی مضبوط نہ ہو وہ تیز ہواؤں کو کہاں تک سہہ سکے گی۔ ہلا گلا ہنگامے برتھ ڈے پارٹیاں اگر یہ سب نہیں تو زندگی نامکمل ہے اور پھر تو تو میں میں کا نتیجہ۔ طلاق۔ طلاق، رب رحیم و کریم کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔ یعنی اس کی اجازت صرف اور صرف سخت حاجت کے وقت رکھی گئی ہے اور حدیث میں ہے نکاح کرو اور طلاق نہ دو اس لیے کہ طلاق دینے سے عرش ہلتا ہے۔

اور آج ہمارا میڈیا کیا سکھا رہا ہے "خاوند کو اتنا تنگ کرو کہ وہ طلاق دینے پر مجبور ہو جائے" اور بنی صاحبہ فرماتی ہیں "بہت ڈھیٹ ہے اپتہ نہیں کس مٹی کا بنا ہے کوئی اور ہوتا تو اب تک سب ختم ہو چکا ہوتا ہے"۔

طلاق، جس سے عرش ہلنے کی حدیث آچکی آج ایک مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ اللہ ہمیں راہ ہدایت عطا فرمائے۔

فون کی گھنٹی بج رہی تھی اٹھایا تو "آمنہ" کی آواز اور تھوڑا سا تمسخر والا لہجہ "کسی پلیٹ فارم پہ کھڑے ہو کر بڑا اچھا لیکچر دے سکتی تھیں آپ! بہرحال پوائنٹ اچھا پکڑا ہے۔ آج تو طلاق اور پھر حلالہ کو ایسے دکھایا جا رہا ہے کہ لڑکیوں کے ذہنوں میں یہ چیزیں راسخ ہو جائیں۔ یعنی مذاق بن چکا ہے اور آپ جانتی ہیں نا اللہ کے فرمان کا مذاق اڑانے کا نتیجہ کیا ہے؟"

میں خوفزدہ ہو گئی۔ "خدارا کوئی بُری بات منہ سے نہ نکالنا۔ میں نے تو صرف اور صرف اپنی قوم کے لیے ہدایت کی دعا مانگی ہے"۔

"وہ تو ٹھیک ہے آپ بیٹھیں اور دعا کریں لیکن ان لوگوں کو یہ بھی بتا دیں کہ وہ جو مغضوب ہوئے جن پر عذاب آئے وہ سب اللہ کے فرمانوں کو جھٹلانے والے تھے"۔

"اچھا دیکھو آج تو اپنا تعارف کروا دو" میں نے موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہا تو وہ ہنس پڑی "موقعہ پرست خاتون اندازوں کا کسی دن بتاؤں گی"۔

اور میں سوچ میں پڑ گئی۔ خرابی کہاں سے شروع ہو رہی ہے۔ سورۃ نور کی ایک آیت ہے "اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کرو" ہم کیا کر رہے ہیں۔ عورت کو خوبصورت، جوان لڑکیوں کو خوبصورت ترین بنا کر ہر اشتہار کی زینت بنا دیا گیا ہے۔ سڑکوں پہ لگے بینرز ٹی وی پہ چلتے اشتہار کیا ہم اللہ کے احکام کی کھلی خلاف ورزی نہیں کر رہے۔ یہ تو اللہ کے احکام کے خلاف ایک جنگ ہے اور سوچیں کہ ہم اللہ کے غضب کو کس طرح دعوت دے رہے ہیں؟

"ذرا مارننگ شوز پہ آ جائیں نا" میں نے جھنجھلا کر فون اٹھایا تو وہ تو جیسے میرا ذہن پڑھ چکا تھا "فون بند نہ کرنا [illegible] بتا رہا ہوں کہ کل ایک شادی [illegible] ات اس لیے واپس چلی گئی کہ

غریب والدین بچی کو "مارننگ شوز" کے مطابق سجا نہیں سکے اور Reception بھی دیا نہیں تھا۔ سوچو ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہائے۔" وہ تو یہ کہہ کر شاہ سے فون رکھ کر غائب تھا اور میں مارننگ شوز کی بھول بھلیوں میں یہ بھی بھول چکی تھی کہ چولہے پہ پڑا سالن بھی میری طرح اندر سے جل چکا ہے۔

"نہیں! میں دقیانوسی نہیں ہوں۔ میں اکثر مولویوں کی طرح ہرگز نہیں سوچتی لیکن پھر بھی کچھ تو سوچئے کیا بارات کے لوٹ جانے پر اُس گھر میں قیامت نہیں آ گئی ہوگی۔ اس بچی کے نصیبوں پر طعنے مارے جا رہے ہوں گے۔ ذلت و رسوائی کے عذاب میں ڈوبا باپ سرگنتوں میں دیئے، یک ٹک کہاں دیکھ رہا ہوگا کہ یہ تو پہلی بیٹی تھی تین اور بیٹیاں ابھی باقی ہیں اور دنیا کے طعنے، مجھے ڈر ہے کہیں وہ کوئی بہت ہی ناپسندیدہ عمل نہ کر بیٹھے۔

مارننگ شوز والو! یہ معاشرہ صرف تمہارا معاشرہ نہیں یہاں وہ بھی رہتے ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی نہیں ملتی، وہ بھی جن کی بچیاں صبح منہ اندھیرے فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے چلی جاتی ہیں اور غمزدہ مائیں ان کی عزت سے واپسی کے لیے سارا دن دعائیں کرتی رہتی ہیں۔ کہیں تمہارا یہ ہنسی مذاق، یہ زندہ دلی، یہ ہر روز ایک گھنٹے کی برین واشنگ بہت سوں کے لیے سنگین مذاق نہ بن جائے۔ میں مانتی ہوں ہم ٹی وی اپنی تفریح کے لیے دیکھتے ہیں۔ ہم زندگی کی تکلیف دہ حقیقتوں سے کچھ دیر کے لیے دُور ہو جانا چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی اپنے ماحول کی کلفتوں سے فرار چاہئے لیکن کسی کا گھر جلا کے آگ تاپنا کہاں کی انسانیت ہے۔ ڈراموں میں لڑکیاں گھروں سے فرار ہو رہی ہیں۔ اس فرار کا آخری نتیجہ کیا ہے۔ ان ڈراموں کو دیکھنے والی کوئی بھی بیٹی کوئی بھی بہن اپنے [illegible] میں ڈال دیتی ہے، قصوروار کون ہے؟

مارننگ شوز میں اچھے شوز بھی ہیں۔ اچھی باتیں بھی بتائی جا رہی ہیں لیکن بعض شوز اتنی صبح ہوتے ہیں خصوصاً اسلامیات اور اخلاقیات کا درس دینے والے کہ شاید نوجوان نسل اس وقت سو رہی ہوتی ہے۔ کم از کم میرے اردگرد تو ایسا ہی ہے۔ وہ بھی جو گھروں میں کام کرتی ہیں ان کے بچے بھی اور ان عورتوں کے بھی جو منہ اندھیرے اُٹھ کر درس قرآن سننے آتی تھیں اور روتی ہیں کہ ان کے بچے صبح اُٹھتے ہی نہیں۔ نماز نہیں پڑھتے، کچھ سنتے ہی نہیں۔

اور میں سوچتی ہوں، ایک وہ وقت تھا..... ابا جی (مرحوم) مسجد میں جانے سے پہلے صرف ایک آواز دیتے تھے۔ "بچو! اُٹھ جاؤ، فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے"۔ اور ہم سب اُٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ نماز اور تلاوت قرآن روز صبح کا معمول تھا۔ اور اس کے بعد کچھ پڑھائی اور پھر امی جان کی تھوڑی مدد۔ ہم کہاں آ گئے ہیں؟ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ان عورتوں سے میں صرف یہی کہتی ہوں۔ اللہ سے دعا کرو۔ وہی ہم سب کو ہدایت عطا فرمانے والا ہے۔ مگر کمی کہاں ہے؟ والدین کی تربیت میں معاشرے کے اطوار میں یا نئی پود کے اندر کوئی ایسی چیز ہے جو انہیں دُور اور دُور لئے جا رہی ہے۔ علامہ اقبال کی طرح میں بھی مایوس نہیں ہوں کیونکہ یہ مٹی بڑی زرخیز ہے۔ دراصل ایک اچھا بہت اچھا ساقی ہمیں چاہئے۔ وہ قدریں جو بدل چکی ہیں۔ اُن قدروں کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے ایک مصلح چاہیے۔

اُس روز بھی مجھ پہ اُداسی کا دورہ پڑا تھا اور بے وجہ غصہ آ رہا تھا، میں اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ بار بار میری نظریں فون کو تکنے لگتیں۔ آج وہ بھی خاموش تھا کہ میری دوست [illegible] چالاک دھڑ سے [illegible]

"یاالٰہی خیر۔ کیا ہوا؟" میرا دل ہول اُٹھا۔ اتنی مسکین طبیعت والی حمنہ اور اتنا غصہ۔

"خیر ہی تو نہیں ہے نا۔" وہ ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے اشتہارات کو کوس رہی تھی۔

"لو جی یک نہ شد دو شد! میں بھی تو اسی الاؤ میں دہک رہی ہوں۔" میں نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ دُکھ سے میرا پور پور جل رہا تھا۔ جو ملک ہم نے کلمہ کے نام پر حاصل کیا تھا اُس میں ہر طرف انڈیا کی چھاپ نظر آ رہی ہے اور ہمارے سیاستدان اپنی اپنی بیٹھک سجائے شیشہ پی رہے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے اتنا چلاؤں اتنا چلاؤں کہ یا تو سب کو جگا دوں یا خود جل کر خاک ہو جاؤں"۔

یک لخت فون چیخ اُٹھا۔ ریسیور اٹھایا تو وہی استہزائیہ قہقہہ۔ "او بلے بلے۔ آج تو بہت جوش میں تھیں آپ! ابھی سے جلنے کے پروگرام بن رہے ہیں آخر کیوں؟"۔

"دیکھو آج تم نہ ہی بولو تو اچھا ہے۔ میں واقعی ایک آگ میں جل رہی ہوں۔ میرے اردگرد میری اپنی اگلی نسل جل بھن رہی ہے۔ مجھے اُن کے متعلق سوچ کے ہول اٹھتے ہیں کہ ہم اُنھیں کن راہوں پر چلا اور کن منزلوں کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ چند ٹکوں کے عوض ایمان بک رہے ہیں۔ ہم اپنے بچوں کے تلفظ ہی ٹھیک نہیں کر پا رہے جو رخ کو رکھ اور خوش کو کھش کہتے ہیں۔ یہ تو بڑی معمولی بات ہے اور کیا کچھ کہوں۔ ہمارا اپنا تشخص اپنی اقدار کہاں کھو گئی ہیں۔

آج میں جی بھر کے بولوں گی کیونکہ میں بہت چھوٹی تھی جب "بٹ کے رہے گا ہندوستان اور لے کے رہیں گے" پاکستان کے نعرے گونجتے تھے۔ جب ننھے بچے [illegible]ستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کی صدائیں [illegible] وخروش سے [illegible]

تھے۔ ہم جو قبل بٹوارہ کی نسل تھیں ایسی نسل جس کو اس وقت صرف یہ علم تھا کہ کچھ ہو رہا ہے کیا، کیوں اور کیسے؟ یہ علم نہیں تھا۔ آج جب مڑ کر دیکھتے ہیں تو اس بات کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ جنھوں نے اُس وقت دل سے اس بٹوارے کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ آج کتنے کامیاب ہو چکے ہیں۔ میری نظروں میں جب اُس شہید کی لاش آتی ہے جسے میں نے اپنے بچپن میں فسادات کی نذر ہوتے دیکھا تھا۔ تو وہ سارے شہید سامنے کھڑے ہوتے ہیں جو لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ وہ جوان لڑکیاں جنھوں نے اپنی عصمتوں کی قربانیاں دیں۔ وہ مائیں جن کے بچے اُن کی نظروں کے سامنے نیزوں کی انیوں میں پرو دیے گئے۔ تو وہ واحد شہید جو میں نے پانچ سال کی عمر میں دیکھا تھا۔ چیخ کر مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا ہمارے خون کی لاج رکھنے والا کوئی بھی نہیں۔ اس شہید کی کہانی کبھی انشاء اللہ سناؤں گی لیکن ابھی تو مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ انڈیا کی وہ چھاپ جو ہماری صرف چہروں پر نہیں ہماری آنے والی نسلوں کی ہستیوں پر بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اُس کو روک لیں۔ اس ملک کو جس مقصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ واضح طور پر نئی نسل کے سامنے وہ مقصد لایا جائے۔ ٹی وی کے بہت اچھے پروگرام ایسے طرز کے ہوتے تھے اور ایسے وقت پر آنے چاہئیں جب ہمارے بوڑھے نہیں تو جوان بھی اُن کو دیکھ سکیں۔"

مارننگ شوز کے متعلق کافی شور اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر مذہب میں صبح عبادت کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک ہم ہیں جو ڈھول باجوں اور رقص و موسیقی کے ساتھ اپنی آنکھیں کھولتے ہیں۔ اللہ کرے یہ تبدیلی جو آ رہی ہے ساری قوم کے لیے مثبت نتائج لے کر آئے۔ آمین

سائے کے پیچھے

نعیم بیگ

کندن شاید نہا رہا تھا۔ اس کے سارے جسم میں نقاہت آچکی تھی۔ وہ اٹھی اور اسی طرح باتھ روم کی طرف چل پڑی۔ جونہی وہ باتھ روم کے قریب پہنچی تو اندر لائٹ آف ہوگئی۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے کہ ایک ہاتھ نے اسے جھٹکے سے اندر کھینچ لیا۔

ایک عورت کی کہانی جو تنہائی کا شکار تھی، سسپنس سے بھرپور شاہکار

کانپتے ہاتھ میں پستول پکڑے ننگے پاؤں رشنی دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اس نے آہستہ سے اپنا دایاں کان دروازے سے لگایا اور سننے کی کوشش کی لیکن باہر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ صرف خاموشی کی ایک طوفان کی گونج میں اسے اپنے دل کی دھڑکن ضرور سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ سینے پر رکھا اور لمحہ بھر کو سوچا کہ کیا دل باہر بھی آسکتا ہے۔ وہ کافی دیر تک خاموش وہیں کھڑی رہی لیکن دروازہ دوبارہ نہیں کھٹکھٹایا گیا۔ یہ دوسری دستک تھی جس پر رشنی کو کچھ خوف محسوس ہوا تھا لیکن

اب جیسے کوئی واپس چلا گیا ہو۔
رشنی نے ایک سکون کا سانس لیا اور واپس کچن میں آ گئی وہ اپنے لیے سینڈوچ بنا رہی تھی جب دروازہ اس زور سے بجا کہ اس کا دل ایک دم بیٹھ گیا تھا۔ رشنی نے اپنا سینڈوچ اور کافی کا مگ اٹھایا اور لاؤنج میں چلی آئی۔ دسمبر کی ابھی ابتدائی سرد راتیں تھیں اور رات کا دوسرا پہر ہی تھا۔ کندن نے جاتے جاتے اسے بار بار تنبیہ کی تھی کہ کچھ بھی ہو تم نے دروازہ نہیں کھولنا۔ اسے معلوم تھا کہ کندن آج کل جس سرکاری خفیہ پروجیکٹ پر کام کر رہا ہے وہ شہر سے باہر مشرق میں مردانگر کے قریب ہی کہیں ہے اور اسے اکثر رات کو دیر گئے ہی واپس آتا ہے۔ کندن نے ایک عدد امریکن کمپیکٹ تھری ایٹی پسٹل بھی اسے دے رکھا تھا۔ جو اس کے نازک ہاتھوں میں صرف ایک کھلونا ہی دکھائی دیتا تھا لیکن جب کندن نے اسے چلانا سکھایا تھا تو اسے لگا کہ یہ پسٹل تو اسی کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ کندن کا معمول تھا کہ جب وہ نیچے پارکنگ میں پہنچ جاتا تو اسے کال کرتا کہ دروازہ کھولو میں آ رہا ہوں۔ یہ سب احتیاطی تدابیر اسے اپنی خفیہ سرگرمیوں کی وجہ سے کرنی پڑتی تھیں۔

رشنی کے مگ سے اٹھتی بھاپ کے مرغولے جیسے اس کے سامنے تھرتھراتے ہوئے راک اینڈ رول پیش کر رہے تھے۔ اس نے اپنی انگلی بھاپ کے درمیان گزاری اور یوں انگلی کو دیکھا جیسے وہ کوئی غیر مرئی شے ہو اور وہ خود بخود مسکرا دی۔

دونوں میاں بیوی فرید آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ شادی کے ایک مہینے کے بعد کندن کی دہلی ٹرانسفر پر انہیں یہاں آنا پڑا تھا اور یہ دوسرا ماہ تھا۔ ریس کلب کے قریبی سرکاری فلیٹوں میں ان کا قیام تھا۔ قسمت ان دنوں کندن پر مہربان تھی [illegible] کی شادی اور وہ بھی یوں چٹکیوں میں ہوئی کہ رشنی [illegible] ابھی بھی کچھ [illegible]

تو اپنی بیماری سے اٹھی تھی۔ جاگتے سوتے خیالات کا عفریت ہمیشہ اس کے سر پر سوار رہتا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ رشنی قابو سے باہر ہو گئی۔ ترقی کے اس دور میں آنند کھنہ اپنی بیٹی کو توہمات کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے رشنی کا ملک کے معروف ڈاکٹروں سے نفسیاتی علاج کروایا اور اب رشنی کافی بہتر تھی۔ بہر حال ان کے کہنے پر آنند کھنہ رشنی کی شادی اس کے کلاس فیلو کندن سے کرنے پر رضامند ہو گئے۔ کندن تو جیسے نہال ہو گیا۔ اس نے نوکری کی اور شادی ہو گئی۔ کندن چاہتا تھا وہ اپنا کیریئر سراغ رساں ادارے میں بنائے اور اس کی یہ دعا بھی قبول ہو گئی تھی۔ اب وہ خوبصورت رشنی کا شوہر اور اپنے ادارے کا ایک ذمہ دار آفیسر تھا۔

یوں زندگی ایک ڈگر پر رواں دواں تھی لیکن کندن کا رات گئے تک باہر رہنا خود اسے بھی پسند نہیں تھا لیکن مجبوری تھی۔ البتہ جب بھی وہ باہر جاتا رشنی کو خوب تاکید کر کے جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ علاقہ سرکاری ملازمین کا اور محفوظ ہے تاہم اسے اپنے سسر کی بات یاد آ جاتی تھی جب انہوں نے رخصت ہوتے ہوئے رشنی کی بیماری کا کندن کو کچھ اشارہ کیا تھا۔ احتیاطاً اس نے رشنی کو کہہ رکھا تھا کہ جب اداس ہو جایا کرو تو اپنی بڑی بہن آشا کے پاس کرول باغ میں چلی جایا کرو اور رشنی ایسا کرتی بھی تھی۔ لیکن اب چند دنوں سے بہت بور ہو رہی تھی۔ گھر کے سارے کام کاج دن کے تیسرے پہر تک ختم ہو جاتے پھر کچھ نہ کچھ کھا کر رشنی ٹی وی دیکھتی۔ شام ہوتے ہی وہ لاؤنج میں ادھر ادھر بھاگ کر ایکسر سائز کر لیتی۔ بس اکیلے باہر جانے کی پابندی نے اسے تنہائیوں سے مانوس کر دیا تھا۔ وہ دن اس کا پارٹی ڈے ہوتا جب وہ دونوں باہر نکلتے لیکن اب ایک دو ہفتوں سے ایسا نہ ہو سکا تھا۔ وہ آج صبح سے ہی خود کو کچھ زود رنج اداس اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کوئی اسے کہاں باہر لے جانے والا نہیں تھا [illegible] کندن [illegible] بھی آ رہا تھا۔

ٹرررن.....ٹرررن.....پاس رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے ایکدم چونکا دیا۔

دھڑکتے دل سے رشنی نے ریسیور اٹھایا.....ہیلو.....ہیلو لیکن ریسیور خاموش تھا اور پھر ایکدم اس میں ڈائل ٹون آگئی جیسے کسی نے بند کر دیا ہو۔

اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور کافی کا آخری گھونٹ پینے کے لیے مگ ابھی منہ سے لگایا ہی تھا کہ کسی نے فلیٹ کے دروازے پر بار بار زور دار دستک دی۔ رشنی کے ہاتھ سے مگ نیچے قالین پر گر گیا۔ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ خوف کی ایک سرد لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ یہ کون ہے جو دروازے کی بیل بجانے کی بجائے دروازہ پیٹ رہا ہے۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں جیسے کسی چیز کو ڈھونڈ رہی ہو۔ اس نے جلدی جلدی صوفے پر، کرسی پر، ٹیبل پر، سامنے رکھے سنٹر ٹیبل پر اپنا پسٹل ڈھونڈا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا پسٹل کھو چکا ہے۔ اب کوئی دروازہ شدت سے پیٹ رہا تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے تک آئی۔

”کون.....؟“ رشنی نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

”ارے میں ہوں اور کون.....؟“ یہ کندن تھا۔

رشنی نے ایک گہرا سانس لیا اور لاک، چٹخنی اور زنجیر تینوں کو ہٹایا اور دروازے کو کھول دیا۔ سامنے روشن کوریڈور میں کندن کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”تم نے کال کیوں نہیں کیا؟“ خوف کی ماری رشنی اسے دیکھتے ہی رو پڑی اور لرزتی ہوئی کندن کی بانہوں میں جھول گئی۔

رشنی کی جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ صوفے پر لیٹی تھی اور اس کا نچلا دھڑ گیلا سا لگ رہا تھا۔ اس نے سیدھا ہونے کے لیے صوفے کی پٹی کو پکڑا اور اپنے جسم کو اوپر کھینچا تو ایک سرخ دھار صوفے پر کھنچ گئی۔ اس نے فوراً اپنے ٹراؤزر کو چھوا، تو اسے لگا کہ وہ خون سے تر بتر تھا۔ اس نے ایک خوفناک آواز میں کندن کو پکارا۔

اندر باتھ روم کی لائٹ جل رہی تھی اور دروازے کے بیچ لگے دھندلے شیشے میں ایک سایہ روشنی میں حرکت کرتا نظر آیا۔ رشنی نے سکون کا سانس لیا۔ کندن شاید نہا رہا تھا۔ اس کے سارے جسم میں نقاہت آچکی تھی۔ وہ اٹھی اور اسی طرح باتھ روم کی طرف چل پڑی۔ جونہی وہ باتھ روم کے قریب پہنچی تو اندر لائٹ آف ہو گئی۔

ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے کہ ایک ہاتھ نے اسے جھٹکے سے اندر کھینچ لیا۔ وہ چیخی لیکن اس کی آواز جیسے بہتے شاور میں کہیں گم ہو گئی۔ اسے اندھیرے میں محسوس ہوا کہ جن ہاتھوں نے اسے پکڑا ہے وہ کندن کے نہیں۔ کندن نے اسے کبھی یوں سخت ہاتھوں سے نہیں چھوا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے زور لگایا لیکن بے سود۔ گرفت از حد مضبوط تھی اور اس کے منہ پر آنے والی گرم سانسیں انجان تھیں۔ سایہ نے اس کے منہ پر انگلیاں پھیریں تو وہیں سے خون اُبل پڑا۔ رشنی شدید درد سے بلبلا اٹھی۔

پیچھے ہٹو..... وہ بلبلاتی ہوئی چیخی لیکن کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

رشنی نے اپنے سخت ناخن پوری قوت سے سائے کے بازو میں گاڑ دیئے۔ ایک قہقہہ سا اُبھرا اور گرفت ڈھیلی ہو گئی اور وہ اپنے آپ کو چھڑا کر باہر آ گئی۔ سفید فرش پر سرخ خون کے دھبے جگہ جگہ پھیل چکے تھے۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے جلدی سے آشا کو فون ملایا لیکن کئی ایک گھنٹیاں بجنے پر بھی اس طرف خاموشی ہی رہی۔ رشنی نے فوراً کندن کے آفس ملایا لیکن وہاں بھی خاموشی تھی اس نے اپنے پیچھے دیکھا تو ایک ہیولہ سا گیلے قدموں سے اس کی طرف آ رہا تھا۔

صرف اس کے قدموں کے گیلے نشان فرش پر نمایاں نظر آ رہے تھے۔ [illegible] اور خون چھا [illegible] اور گھٹن کی

طرف بھاگی۔ جونہی وہ کچن میں آئی پیچھے لاؤنج کی لائٹس آف ہو گئیں۔ اس نے جلدی سے گوشت کاٹنے والی بڑی چھری اسٹینڈ سے نکالی تو دیکھا پسٹل سنگ مرمر کے سلیب پر سامنے دھرا تھا۔ اس نے فوراً پسٹل اٹھایا اور اس کا سیفٹی کلیپ اون کر لیا۔ چھری کو اس نے ٹراؤزر میں اڑس لیا اور کچن میں رُک کر سائے کا انتظار کرنے لگی۔ سامنے کھڑکی سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ نیچے سڑک پر اِکا دُکا کار یا آٹو رکشا گزر رہی اور آسمان پر مغرب کی طرف زرد رنگ کا ادھ کٹا چاند ملگجی سی دھند میں رات کے آخری پہر میں غروب ہوا جاتا تھا۔ شاید اپنے آخری دنوں میں ہوگا۔ اس نے خوف سے ایک جھرجھری سی لی۔

اتنے میں کچن کی لائٹ آف ہو گئی۔ رشنی خوف سے چیختی ہوئی لاؤنج کی طرف دوڑی۔ سایہ اس کے پیچھے بھاگا۔ رشنی گھبراہٹ میں پہلے کرسی سے ٹکرائی پھر ڈائننگ ٹیبل کا کونا اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں آن لگا اور شدید درد سے وہ بلبلا اٹھی اور غصہ میں پلٹ کر سایے پر فائر کر دیا۔ گولی سامنے دیوار پر لگی اور اس کے ساتھ ٹنگا ہوا آئینہ دھڑام سے زمین پر گر کر کرچی کرچی ہو گیا۔ سایہ اچھل کر سیدھا رشنی کی طرف آ رہا تھا۔ رشنی نے کوریڈور سے آنے والی مدھم روشنی میں سائے پر یکے بعد دیگرے تین اور فائر کیے لیکن سایہ بدستور اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب رشنی کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ گھر سے باہر نکل آئے۔ وہ پچھلے قدموں اُٹھتی ہوئی لہولہان چہرے کے ساتھ ہاتھ میں پسٹل لیے بال بکھیرے کوریڈور میں نکل آئی اس کی آنکھیں شدت خوف سے پھیل چکی تھیں۔ موت اس کے سامنے کھڑی تھی اور وہ بے بس تھی۔ سایہ نے ایک جست لگائی اور رشنی کے سر پر پہنچ گیا۔ رشنی کو یوں لگا جیسے آندھی کی ایک لہر اس کے چاروں طرف بگولے کی طرح گھوم رہی ہو۔ اس کے ہاتھ سے پسٹل چھوٹ کر دور جا گرا۔ رشنی نے جھٹ سے چھری نکال کر ہاتھ میں لے لی۔ گو خوف سے رشنی میں رعشہ طاری ہو چکا تھا لیکن وہ نقاہت کے باوجود اپنے حواس کو ابھی تک قابو میں رکھنے میں کامیاب رہی تھی وہ کسی قیمت پر اپنے آپ کو سائے کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کوریڈور میں آ جانے پر وہ اب مسلسل چیخ بھی رہی تھی اور سائے کو للکار رہی تھی۔

سامنے والے دونوں فلیٹ خالی تھے لیکن ساتھ والے فلیٹ سے آنٹی پارکیہ ادھ کھلے دروازے سے جھانک رہی تھیں۔ جو شاید فائر کی آواز سے جاگ گئی ہوں گی۔ رشنی کو یوں دیکھ کر زور سے چیخیں اور واپس اندر بھاگ گئیں۔ سایہ اب کوریڈور کی مدھم زرد روشنی میں رشنی کے گلے کو دبا رہا تھا کہ اتنے میں کسی مضبوط ہاتھوں نے رشنی کو پیچھے سے تھام لیا۔

اگلے دن صبح ہسپتال کے کمرہ میں رشنی خواب آور دوائیوں کے زیر اثر سو رہی تھی۔ اس کے شفاف نحیف اور سپید چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ سفید کوٹ میں ملبوس پاس کھڑا ماہر نفسیات اپنے ہاتھ میں ایک رپورٹ لیے کندن کو دکھا رہا تھا آشا اور اس کے شوہر بھی وہیں تھے۔ آنٹی پارکیہ سب کو اپنی بہادری کی داستان سنا رہی تھیں۔ جنہوں نے ایمرجنسی پولیس کو فون کیا تھا لیکن اسی اثناء میں کندن بھی پہنچ گیا تھا جس نے رشنی کو پیچھے سے تھام لیا تھا۔ بقول آنٹی پارکیہ رشنی کسی انجان خوف کے تحت خود ہی کسی سے لڑ رہی تھی اور بلا دھڑک فائر کر رہی تھی۔ جب کہ گھر میں نہ کوئی خون تھا نہ اس کے دھبے۔ باتھ روم خشک تھا۔ لاؤنج کی ترتیب درست تھی ماسوائے کہ دیوار پر ٹنگا آئینہ گولی لگنے سے ٹوٹا ہوا نیچے گرا پڑا تھا۔ کندن سوئی ہوئی رشنی کے منہ پر پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔ ”سوری میری جان رشو..... آئی لو یو..... تم اب اکیلے گھر سے باہر جا سکتی ہو۔“

ہندوستان میں مسلم ورثہ

عارف محمود اُپل

مقدس درگاہوں کے نقوش معدوم ہونے کے قریب
بھارتی انتہا پسندوں اور حکومت کی لاپرواہی کی وجہ سے ماضی کا مقدس سرمایہ خاک میں ملنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

ہندوستان پر مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سالوں تک حکومت کی اس دوران انہوں نے کہیں پر قلعے تعمیر کروائے تو کہیں پر سرائے خانے ، کہیں پر مسجدیں بنوائیں تو کہیں پر آبادیاں، ہندوستان کو انہوں نے ہمیشہ اپنا گھر سمجھا۔ یہ مسلم حکمران ہندوستان کے باہر سے [illegible] تھے لیکن ایک بار

یہاں پر سکونت اختیار کرنے کے بعد انہوں نے خود کو ہندوستانی کہلانا ہی زیادہ پسند کیا۔ پورے ہندوستان میں بکھری ہوئی ان کی قبریں، اس بات کی گواہ ہیں کہ وہ واقعی محب وطن تھے، ان مسلم بادشاہوں کی گنگا جمنی تہذیب سے ہندوستان واقف [illegible] ہے۔ ہندوستان [illegible] ان حکمران ایک طرف عدل

جہانگیری مشہور ہے۔ وہیں دوسری طرف اکبر کی عظمت کا بھی سبھی لوہا مانتے ہیں، دارالشکوہ کی دور بینی اور علم دانی کے چرچے بھی مشہور ہیں۔ انھوں نے دنیا جہان کی دولت اپنے لئے بٹوری، مرنے کے بعد ظاہر ہے کہ وہ یہ دولت اپنے ساتھ لے کر نہیں جا سکتے تھے۔ لہٰذا ان کے ذریعے چھوڑی گئی دولت کو ہمارے ہاں کی حکومتوں نے یا تو محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا، یا پھر جہاں کہیں موقع ملا اسے یا تو خود ہی ہڑپ لیا یا اوروں کے ہاتھوں لٹوا دیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ مغلیہ خاندان کی کوئی بہو یا تو کولکتہ ریلوے اسٹیشن پر چائے بیچ کر اپنی زندگی گزار رہی ہے یا پھر اس خانوادے سے تعلق رکھنے والے افراد بھیک مانگ کر اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ کوئی ان کی خبر لینے والا نہیں۔ کیا ان مسلم حکمرانوں نے تاج محل، لال قلعہ موتی محل، دیوان عام، دیوان خاص اور نہ جانے کن کن ناموں سے عمارتوں کی تعمیر اس لئے کروائی تھی کہ ان کے وارثین در در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں گے اور انھیں سر چھپانے تک کی جگہ نہیں ملے گی۔ کیا دہلی کے لال قلعہ میں اورنگ زیب کے ذریعے سنگ مرمر کے استعمال سے بنائی گئی خوبصورت موتی مسجد کی تعمیر اس لئے ہوئی تھی کہ ایک زمانے کے بعد اس میں تالا لگا دیا جائے گا اور مسلمانوں کو اس میں نماز ادا کرنے تک کی بھی اجازت نہیں ہوگی؟ محکمہ آثار قدیمہ کی زیر نگرانی ملک کی تقریباً تمام مسجدوں کا یہی حال ہے۔ جب کہ حکومت کو بھی یہ معلوم ہے کہ مندر، مسجد، گردوارہ یا گرجا گھر کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی تعمیر کا مقصد اپنے اپنے عقیدے کے مطابق ان میں عبادت کرنا ہوتا ہے۔

ہم اگر صرف وقف کی بات کریں تو یہاں پر وقف

کی اتنی جائیدادیں موجود ہیں کہ اگر یہ جائیدادیں مسلمانوں کو واپس لوٹا دی جائیں تو صرف مسلمانوں کے لئے کئی بڑی یونیورسٹیوں کی تعمیر ہو سکتی ہے کئی ٹیکنیکل اور پروفیشنل انسٹی ٹیوٹ قائم کیے جا سکتے ہیں، کئی جدید کارخانوں کی تعمیر ہو سکتی ہے، ہزاروں اور لاکھوں مسلمان بہتر روزگار کے مواقع حاصل کر کے باعزت زندگی گزار سکتے ہیں، کیوں کہ راشٹرپتی بھون کی زمین وقف کے نام سے ہے، وزیر اعظم کی رہائش گاہ وقف کی زمین پر بنی ہوئی ہے۔

انگریزوں کو ہندوستان میں شروع میں سب سے زیادہ مسلمانوں کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ جس وقت انگریز ہندوستان آئے اس وقت ہندوستان پر مسلمانوں کی ہی بادشاہت تھی۔ لہٰذا انگریزوں نے جب ہندوستان کی باگ ڈور پوری طرح اپنے ہاتھوں میں لے لی تو انھوں نے مسلمانوں کو سبق سکھانا اور انھیں طرح طرح سے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ اس کے لئے انھوں نے بحالی اراضی قانون Land Resumption Act پاس کر کے وقف کی ان زمینوں سے ٹیکس وصولنا شروع کر دیا جن پر پہلے ٹیکس نہیں لگتا تھا۔ اس طرح صرف بنگال میں ان زمینوں سے 1.1 ملین پاؤنڈز کی وصولی ہوئی۔ جن پر پہلے ٹیکس نہیں لگتا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر زمینیں مسلم تنظیموں کے زیر استعمال تھیں۔ لیکن انگریزوں کی اس پالیسی کے نتیجے میں سینکڑوں مسلم گھرانے تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کے تعلیمی نظام پر اس کا سب سے گہرا اثر ہوا کیوں کہ انھیں انہی جائیدادوں سے عطیے ملا کرتے تھے۔

ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور یونین علاقوں میں 4.9 لاکھ سے زیادہ رجسٹرڈ وقف جائیدادیں ہیں۔ مثلاً مغربی بنگال میں سب سے زیادہ 148,200 وقف جائیدادیں ہیں۔ اس کے بعد

دوسرا نمبر اتر پردیش کا ہے، جہاں پر کل 122,839 وقف جائیدادیں ہیں۔ اس کے بعد کیرالہ، کرناٹک اور آندھرا پردیش کا نمبر آتا ہے۔

پورے ہندوستان میں وقف کی تحویل میں کل اراضی 6 لاکھ ایکڑ ہے جن کی کتابی قیمت 6,000 کروڑ روپے ہے (یہ تخمینہ نصف صدی پہلے کا ہے) لیکن ان کی بازاری قیمت کئی گنا زیادہ ہو سکتی ہے۔ (موجودہ بازاری قیمت کے حساب سے ان کی قیمت 1.2 لاکھ کروڑ روپے 12,000 بلین سالانہ ہے) مثال کے طور پر صرف دہلی میں وقف کی جتنی جائیدادیں ہیں ان کی موجودہ بازاری قیمت 6,000 کروڑ سے زیادہ ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ پورے ہندوستان میں پھیلی وقف کی کل جائیدادوں سے سالانہ آمدنی صرف 163 کروڑ روپے ہی ہو رہی ہے۔ آخر کیوں؟ یعنی وصولی کی صرف 2.7 فیصد ہی ہو پا رہی ہے۔ اب وقف جائیدادوں سے سالانہ جتنی آمدنی ہوتی ہے اس میں سے وقف بورڈ کو اپنے انتظام و انصرام کو چلانے کے لئے سات فیصد رقم دے دی جاتی ہے۔

لیکن چند کو چھوڑ کر وقف بورڈ کے زیادہ تر مقاصد کو اب تک بروئے کار نہیں لایا جا سکا ہے۔ اس کے لئے حکومت اور وقف بورڈ کے ملازمین تو ذمہ دار ہیں ہی حکومت نے بھی اپنی طرف سے مسلمانوں کو پریشان کرنے کے تمام حربے استعمال کئے ہیں۔ اب مسلمانوں کے ایک طبقے کی طرف سے یہ مانگ بڑھتی جا رہی ہے کہ یو پی ایس سی کی طرز پر ہی انڈین وقف سروسز کمیشن کی تشکیل کی جائے، تا کہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان سے ایسے تعلیم یافتہ افراد کو منتخب کیا جا سکے۔ جو ایک آئی اے ایس آفیسر کی طرح ہی وقف جائیدادوں کے انتظام و انصرام کو بہتر ڈھنگ سے انجام دے سکے اور وقف کی تمام املاک کو ناجائز قبضے سے چھڑوا سکے۔

دہلی میں واقع اولیاء کرام کی درگاہوں پر ناجائز قبضے ہو چکے ہیں۔ دہلی میں ایسے سینکڑوں اولیائے کرام کی درگاہیں ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں لوگوں کے اندر بھائی چارہ اور ہم آہنگی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی اور انہیں انسانیت کا درس دیا، دھرم، مذہب، ذات پات رنگ و نسل کی کوئی تفریق انہوں نے روا نہیں رکھی۔ ان درگاہوں کے اردگرد بہت سی ایسی زمینیں تھیں جو خالص ان درگاہوں سے وابستہ افراد کی ملکیت تھی۔ لیکن بعد میں ان تمام زمینوں پر ناجائز قبضہ کر لیا گیا۔ درگاہوں کی زمینوں پر زیادہ تر قبضہ ان ہندو مہاجرین کے ذریعے کیا گیا جو 1947 میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد پاکستان سے ہجرت کر کے دہلی پہنچے تھے۔ اس کے علاوہ ہندو مہا سبھا اور وشوا ہندو پریشد جیسی انتہا پسند ہندو تنظیموں نے بھی وقف کی زیادہ تر جائیدادوں پر اپنا ناجائز قبضہ جما رکھا ہے۔ مسلمان تو بے بس ہے کیوں کہ اس کے اندر نہ تو ملک کی ان انتہا پسند تنظیموں سے لڑنے کی طاقت ہے اور نہ ہی یہاں کی حکومت نے سچے دل سے کبھی اس کا ساتھ دیا ہے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بھلا کون ہندوستانی واقف نہیں ہے، قطب مینار کی شکل میں آج بھی ان کی یادگار دہلی کے مہرولی علاقہ میں واقع ہے۔ اسی علاقہ میں ان کی درگاہ بھی موجود ہے۔ لیکن 1947 میں ملک کے بٹوارے کے بعد اس درگاہ کا نگران کوئی نہیں رہا۔ اس درگاہ پر پاکستان سے آئے ہوئے ہندو مہاجرین نے قبضہ کر لیا، جس سے درگاہ کی بے حرمتی ہوئی اور درگاہ کے مختلف [illegible] کو نقصان پہنچا۔ 1948 میں مہاتما

گاندھی مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کی مداخلت سے اس درگاہ کو ان مہاجروں کے ناجائز قبضے سے خالی کرایا گیا۔

اسی طرح پرانا قلعہ کے نزدیک کاکا نگر کے این ڈی ایم سی پرائمری سکول کے قریب 1245 میں تعمیر کردہ بی بی فاطمہ سام صاحبہ (چشتی) کی درگاہ ہے۔ اس درگاہ کے چاروں طرف 5000 گز سے زیادہ زمین خالی پڑی ہے۔ جس پر اب سرکاری سکول کی طرف سے قبضہ کرنے کی کوشش جاری ہے۔ یہاں پر موجود این ڈی ایم سی سکول نے تو اب درگاہ کی زمین کے کچھ حصے کو تار سے گھیر کر اس میں بچوں کا جھولا بھی لگا دیا ہے اس کے علاوہ درگاہ کے شمال میں 100 گز زمین پر پھولوں کی ایک نرسری بھی چل رہی ہے۔

پرگتی میدان کے پاس پرانا قلعہ روڈ پر شیخ ابو بکر طوسی حیدری قلندر عرف مٹکا پیر کی درگاہ ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے یہاں کے سجادہ نشین نے ہمیں بتایا کہ اس درگاہ کی کل 20 بیگھہ زمین تھی جو قبرستان کے نام پر تھی۔ 1971 میں ڈی ڈی اے نے اس پر قبضہ کر لیا اور نہایت خوبصورت انداز میں پیڑ پودے لگا دیئے۔ اب یہ جگہ ایک پارک کی شکل میں موجود ہے۔ جس کو دیکھنے سے بالکل شک نہیں ہوتا کہ یہ پارک درگاہ کی زمین پر ناجائز قبضہ کر کے بنایا گیا ہے۔

دہلی کے پہاڑ گنج میں 1376 میں تعمیر کردہ درگاہ قدم شریف اور درگاہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت (سہروردی) موجود ہے۔ اس کے بارے میں کتابوں میں ذکر ملتا ہے کہ اس درگاہ میں ایک پتھر نصب ہے جس پر پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے قدم مبارک کے نشان ہیں۔ اس قدم مبارک کے پتھر کو شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت، فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت میں اپنے سر پر رکھ کر یہاں لائے تھے۔

لیکن اس درگاہ پر 1947 کی تقسیم کے بعد پاکستان سے آنے والے ہندو مہاجرین نے قبضہ کر لیا اور اس درگاہ کے وسیع و عریض احاطہ میں اپنے متعدد مکانات تعمیر کر لئے۔ اب اس کے اندر بنی عمارتوں کا کوئی پتہ نہیں اس کے اوپر بھی گھروں کی تعمیر کر لی گئی ہے۔ صرف قدم شریف کی خاص عمارت ابھی محفوظ ہے جسے 1951 میں عدالت نے درگاہ کے سجادہ نشین پیر جی سلیم الدین کو واپس دلوادیا تھا۔ جو گردوارہ کی شکل میں استعمال ہو رہی تھی اور یہاں سے قدم شریف کا پتھر اکھاڑ کر پھینک دیا گیا تھا۔

کیلو کھری میں واقع درگاہ سید محمود بہار کی بھی یہی کہانی ہے۔ اس درگاہ کا ایک بہت بڑا قبرستان ہے جس پر 16 نومبر 1978 کو دہلی نگر نگم نے اسے قبرستان کی شکل میں استعمال کرنے پر پابندی لگا دی تھی۔ اس کے بعد اس درگاہ کے منتظم فتح الدین نے اس کے خلاف کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر 1990 میں عدالت میں عرضی دائر کی اور اس کے بعد فتح الدین نے صلح کرتے ہوئے ان لوگوں کے نام 1000 گز زمین کر دی اس کے بعد 1992 میں دال چند نام کے ایک شخص نے عرضی دائر کر کے 250 گز زمین پر دعویٰ کیا۔ دہلی پردیش کانگریس کمیٹی کے اقلیتی امور کے محکمہ کے چیئرمین عبدالسمیع سلمانی نے ہائی کورٹ میں عرضی دائر کر کے نوٹس جاری کروایا کہ قبرستان کی زمین پر ناجائز تعمیر کے ذریعے کثیر منزلہ عمارت کھڑی کی جا رہی ہے۔ لہٰذا اس غیر قانونی تعمیر پر روک لگائی جائے اور یہ زمین مسلم سماج کو سونپی جائے۔ لیکن اس پر اب تک کوئی تسلی بخش فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔

شیخ علاؤ الدین چشتی 1541-1467 کی درگاہ ... شیخ سرائے ... گری میں مکان نمبر

220 کے قریب واقع ہے۔ پہلے درگاہ کا ایک بہت بڑا احاطہ ہوا کرتا تھا لیکن اب شیخ علاؤالدین کے مقبرے اور اس سے ملے کسی نامعلوم صوفی بزرگ کے مقبرے کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں بچا ہے۔ وسیع وعریض چار دیواری والے احاطہ میں واقع دیگر عمارتیں اور بے شمار پختہ قبریں سب کی سب برباد کر دی گئیں۔ اس پر مکان بنا لئے گئے ہیں۔ شیخ علاؤ الدین کی درگاہ کے اندر دکان چل رہی ہے اور اس سے متصل ان کے خاندان کے مشہور بزرگ شیخ فخر کے مقبرہ کے گنبد کے نیچے ایک قبر موجود تھی لیکن اب اس میں بڑھئی کا کام چل رہا ہے۔ یہاں عقیدت مند آتے ہیں۔ لیکن انہیں درگاہ کے اندر داخل نہیں ہونے دیا جاتا انہیں ڈانٹ اور ڈرا کر بھگا دیا جاتا ہے۔ حالت نہایت خستہ ہے اس میں بڑھئی کا کام ہو رہا ہے۔ لکڑی اور اس کا ملبہ پڑا ہے۔

کناٹ پلیس سے ایک کلومیٹر آگے پنچ کوئیاں روڈ پر بلائنڈ سکول کے پاس سید حسن رسول نما کی درگاہ واقع ہے۔ جس کی تعمیر 1691 میں اورنگ زیب کے دور میں ہوئی تھی۔ اندر سے یہ درگاہ نہایت صاف ستھری ہے۔ لیکن اس کا باہری حصہ جو چاروں طرف سے برآمدے سے گھرا ہوا ہے۔ اس میں 20 سے بھی زیادہ مسلم خاندانوں کے لوگ رہ رہے ہیں۔ اس درگاہ کے احاطہ کو ایک قبرستان کی شکل میں قائم کیا گیا تھا جہاں متعدد صوفی بزرگوں کی قبریں موجود ہیں ان کی قبریں اور درگاہیں آج بھی خستہ حالت میں موجود ہیں وہاں موجود چھوٹی چھوٹی درگاہوں کو لوگ رہائش کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ بے شمار پختہ قبریں بکھری پڑی ہیں۔ اس کے بہت بڑے رقبہ [illegible] ڈی ڈی اے کا قبضہ ہے جسے پارک بنا دیا گیا [illegible] ایک اسکول [illegible]

نے اس میں دفتر اور گیراج کھول رکھے ہیں۔

قرول باغ کے مشہور ہنومان مندر کے پیچھے بھولی بھٹیاری، لنک روڈ پر حضرت چشتی کی درگاہ ہے جسے 1694 میں بنایا گیا تھا اس درگاہ کی نگرانی ایک کمیٹی کرتی ہے۔ جس کے متولی رئیس الدین ہیں۔ ان کے مطابق اس درگاہ کی زمین ساڑھے چار بیگھہ ہے جس پر ڈی ڈی اے قبضہ کر رکھا ہے۔ اس سے مقدمہ جیتنے کے بعد بھی ڈی ڈی اے زمین کو خالی نہیں کر رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک لاکھ روپے کے درخت ہم نے لگائے ہیں اتنا پیسہ دیں تب زمین پر قبضہ دیں گے لیکن اتنے پیسے سوسائٹی کے پاس نہیں ہیں جو دے سکے۔

صفدر جنگ کے مقبرہ کے قریب مشرق کی طرف جو باغ روڈ ہے اور اس کے مشرق میں کربلا روڈ ہے۔ کربلا جہاں ختم ہوتا ہے وہیں پر درگاہ شاہ مرداں ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں درگاہ شاہ مرداں کی ایک خاص اہمیت تھی وجہ یہ کہ اس جگہ پر مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کے قدم مبارک کا نقش ایک سنگ مرمر کے حوض میں رکھا گیا ہے۔ دوسری طرف اسی جگہ پر پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی محبوب صاحبزادی بی بی فاطمہؓ کا پیالہ، جو پتھر کا ہے ایک برج میں رکھ کر محفوظ کیا گیا ہے۔ جو بی بی فاطمہؓ کی چکی کے نام سے مشہور ہے۔ مغلیہ دور کے آخر میں اس جگہ کی ایک خاص اہمیت تھی یہاں پر بادشاہوں اور امیروں نے درگاہ شاہ مرداں کی عقیدت میں متعدد تعمیراتی کام کروائے۔ اس کے قریب بھی تعمیراتی کام نہ تو محفوظ ہیں اور نہ ہی باقی بچے ہیں۔ 1947 کی تقسیم کے بعد یہاں آئے ہوئے مہاجرین نے [illegible] قبضہ کر کے اس کی [illegible] اور اس میں اپنا گھر بنا لیا۔

کیپٹن (ر) لیاقت علی ملک

عورت کی محبت میں بہت دم ہے یہ زندگی دے نہ دے زندگی لینے کی اہلیت ضرور رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کی محبت سے زندگی کسی نصیب والے کو ہی مل سکتی ہے۔ یہ حکمرانوں سے تخت و تاج چھین کر ان کو بیچ چوراہے اپنی ہی سلطنت میں بھیک مانگنے پر مجبور کردیتی ہے۔ اور ایک محلک کے لئے پورے لشکر ذبح کروا دیتی ہے۔

صنف نازک کے کردار کے مختلف رنگ بیان کرتی ایک اچھوتی تحریر

malik.pap33@gmail.com
http://www.facebook.com/liaqatmalick?fref=ts

کیپٹن (ر) لیاقت علی ملک نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد نومبر 1995ء میں افواج پاکستان میں کمیشن حاصل کیا۔ پاکستان آرمی کے دس سالہ دور میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ اپنی پیشہ ورانہ تربیت میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا۔ نومبر 2005ء میں پولیس سروس کا حصہ بنے اور پریذیڈنٹ پولیس میڈل (PPM) اور وزیراعلیٰ پنجاب سے ''بہترین پولیس آفیسر'' کا ایوارڈ ان کے کارہائے نمایاں ہیں۔ اپنی عسکری اور پولیس سروس کے دوران بھی انہوں نے علم و ادب سے اپنا تعلق اور واسطہ بالکل اسی طرح استوار رکھا جس طرح سپاہی اپنی بندوق سے رکھتا ہے۔ دو کتابوں کی تصنیف کے علاوہ ان کے مضامین مختلف اخبارات، رسائل اور جرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں اور روزمرہ کے معاشرتی مسائل، معاشی ناہمواریوں، بنت بدلتی ہوئی اخلاقی اقدار اور منفی رویوں پر طنز کے نشتر چلانا ان کے انداز تحریر کی انفرادیت اور خاصا ہے۔

(مدیر)

ٹیڑھی پسلی کی خوبصورت تخلیق اندر سے کتنی پیچیدہ اور ٹیڑھی ہوگی، یہ شاید آدم اول سے آدم آخر تک معلوم نہ ہو سکے۔۔۔ اپنی ذہانت سے حکمرانی کی، وہاں تن سے من مانی بھی کی۔ تخت و تاج چھوڑ کر بن باس لینے پر مجبور کیا اور چہرے کی ۔۔۔ کو غلام اور شہزادوں

کو دار پر جھولنے سے لیکر، نرم ہاتھوں محبت کرنے والے کو زہر آب پلا کر ابدی نیند سلا دیا۔ اس صنف کی محبت شاید کسی کسی کو راس آئی ہو، کیونکہ ان کی زلف گرہ گیر کچھ کے لئے پھانسی کا پھندہ، کچھ کے لئے ان کی آنکھوں کے جام زہر ہلاہل، کچھ کے لئے ہونٹوں کا رس صحرائی سانپ کی کاٹ، کچھ کے لئے ان کی باتیں بغاوت کا پیش خیمہ اور آغوش میں استراحت قلعہ پر قبضہ کی نوید بن جاتا ہے۔ آنسو عورت کا سب سے خطرناک ہتھیار ہے۔ اور اس کے آنسو کسی بھی سلطنت اور مملکت خداداد کو تخت و تاراج کرا سکتے ہیں۔ اور رو کر کہی ہوئی بات، ملاقات اور وعدہ، کبھی سچ اور وفا نہیں ہوتا۔ عورت کے آنسوؤں پر کبھی اعتبار اور مرد کے آنسوؤں کو بے کار نہیں سمجھنا چاہیے۔

عورت کی محبت میں بہت دم ہے، یہ زندگی دے نہ دے زندگی لینے کی اہلیت ضرور رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کی محبت سے زندگی کسی نصیب والے کو ہی مل سکتی ہے۔ یہ حکمرانوں سے تخت و تاج چھین کر ان کو بیچ چوراہے اپنی ہی سلطنت میں بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور ایک جھلک کے لئے پورے لشکر ذبح کروا دیتی ہے۔ مگر لوگ اپنی زندگی ہارنے کے بعد بھی اس کو جیتنے میں ناکام رہتے ہیں۔

طبیعت کا تلون عورت کی فطرت کا خاصا ہے اور یہ اکثر رسوائی کا سبب بنتا ہے۔ اور جو کوئی اس میں ثابت قدم ہو وہ اولیائی کے درجے پر فائز ہو جاتی ہے۔ پارسائی، وفاداری اور تابعداری اس کی استقامت کے ساتھ بالواسطہ منسلک ہے۔ ہاتھوں میں میکوں کے باوجود نہ اللہ کو چھوڑتی ہے اور نہ خاوند کو، رات رات [illegible] چکی پیسنے والی، عفت کی حفاظت کے لئے زندہ [illegible] ہونے والی، بچے [illegible] کے [illegible] اپنے آپ [illegible]

والی، عمر بھر تندور میں بتانے والی، بصرہ میں جائے نماز پر زندگی بسر کرنے والی، رات بھر پانی لے کر سرہانے کھڑی رہنے والی، سہاگ کی پہلی رات بیوہ ہو کر پوری عمر اس کے نام پر بتانے والی، سوسائٹی کے راجہ گِدھوں سے دامن بچا کر کینسر زدہ خاوند کی دوائی اور بچوں کے رزق کے لئے مزدوری کرنے والی، شراب کے نشے میں ذحت پرائی عورت کے ساتھ رات گزار کر گھر آنے والے مدہوش خاوند کے جوتے اتارنے والی، خاوند کی مار، سسر کی بدنگاہی، دیور کے تھپڑ اور ساس کی طعنہ زنی پر اُف تک نہ کرنے والی، شادی کے دس روز کے بعد پردیس جانے والے خاوند کے انتظار میں مسلسل پانچ سال تک روزانہ مہندی اور مانگ سجانے والی اور اپنی عزت و عفت کی حفاظت کرنے والی، یقیناً اولیائی کے درجے پر فائز ہوتی ہے۔

دوسری طرف ان کی ایک محبت سو افسانے کی بجائے، سو محبت اور بے شمار افسانے زبان زد عام ہوتے ہیں۔ گلی میں رقعہ تھمانے سے لیکر، رانگ نمبر پر کال، ایس ایم ایس، وائبر، سکائپ اور فیس بک ریکوسٹ، سب کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے، ہر ملنے والے شخص سے بے تکلف ہو جانا خاصا ہے۔ سادگی اتنی ہے کہ بیک وقت دس بارہ عشاق پر طبع آزمائی ہوتی ہے۔ اور ہر موبائل دینے والا، کال ملانے والا، کھانا کھلانے والا، بیلنس ڈلوانے والا اور گاڑی میں گھمانے والا یہی سمجھ رہا ہوتا ہے کہ یہ میری محبت کی اسیر ہے۔ اور انتہائی ذہین، عاقل اور زمانہ ساز مرد بلاتفریق عمر اس فطری طور پر ناقص العقل اور کمزور عورت کے سامنے ایسے بے وقوف بنتا ہے کہ جب اس کو ہوش آتی ہے تو اس کا جسم داغدار، ردا [illegible] اور [illegible] داغدار ہوتی ہے اور وہ بیچ بازار [illegible] مجبور ہو جاتا ہے۔

رات کو پورے خاندان کو نیند کی گولیاں پلا کر سلانے والی، جب اپنے دو دوستوں کو ایک ہی وقت دے بیٹھتی ہے تو گلی میں کون زخمی ہوا اور کھڑکی کا پردہ کیوں نیچے گرا، یہ کس کو معلوم۔ ابس صاحب خانہ صبح چائے کی پیالی پی کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ رات نیند بہت اچھی آئی تھی۔ بچی دیوار پھلانگ کر آنے والے، جنگلوں میں ملاقات کرنے والے، کیمرے بند کر کے دروازے کے راستہ آنے والے، ٹیوٹر سے کتاب عشق پڑھنے والے، کالج سے پرائی گاڑی کی زینت بننے والے اور اپنی گاڑی میں دوست کے گھر رات گزارنے والے، سب اس ہوس کا جام پاک محبت کا نام لے کر صبح شام پی رہے ہیں۔ اس میں نہ عمر کی قید ہے اور نہ شادی کی۔ سالہا سال تک آپ کی محبت کے گن گانے والی، آپ کے بغیر زندہ نہ رہنے کی قسمیں کھانے والی، رات رات بھر آپ سے باتیں کرنے والی، پہلی رات اپنے خاوند کو پارسائی اور پہلی محبت کی قسمیں کھا کر یقین دلا رہی ہوتی ہے۔ اور اگر اچانک کسی ہوٹل، ریسٹورنٹ یا بازار میں سرراہ ملاقات ہوجائے، تو کبھی مکمل نا شناسائی یا کچھ کچھ مانوسیت کا اظہار اور دو بچوں کو یہ کہہ کر تعارف کرواتی ہیں کہ یہ آپ کے ماموں ہیں!

عورت کی خوبی یہ ہے کہ کام پہلے کرتی ہے اور سوچتی بعد میں ہے۔ یہ بیک وقت طوائف اور پارسا ہوتی ہیں۔ اس لئے امیر زادی، کسی ڈرائیور یا خانساماں کے عشق میں مبتلا ہوجاتی ہے، چار بچوں کی ماں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے، کسی فقیر کی دہلیز پر جا بیٹھتی ہے۔ رات بھر کسی سے بات کرنے والی اور پوری زندگی نماز اور تہجد ادا کرنے والی، جانے کب کس ہمسائے کے ڈرائیور کے ساتھ رات [illegible] میں والدین کی عزت کو چار چاند لگا [illegible] نام پر رسوا ہوا [illegible]

کتنی میٹھی باتیں..

☆ مشین بار بار خراب ہوجائے تو اس کا مال بدل دیں

☆ آپ کی صحت کا راز سگریٹ نوشی ہے جو آپ نہیں کرتے

☆ نوادرات ایک نسل خریدتی ہے دوسری فروخت کرتی ہے تیسری پھر خرید لیتی ہے

☆ اگر تصویر دیوار پر لگی ہو تو مصوری کا نمونہ اور اگر اس کے گرد گھوما جا سکے تو مجسمہ

☆ تمام لوگ بیوقوف نہیں ہوتے کچھ غیر شادی شدہ بھی ہوتے ہیں

☆ سالوں، بھتیجوں اور بیوقوفوں سے بحث نہیں کرنی چاہیے

☆ احترام مانگا یا چھینا نہیں جاتا احترام کروایا جاتا ہے اور عزت حاصل کی جاتی ہے۔

(امتیاز شیخ / لاہور)

کے انجانے ان دیکھے راستے کی طرف چل نکلتی ہے۔ یہ سکے کی مانند ہوتی ہیں۔ جس کے دو چہرے، حیثیت کی طرح کم قیمت اور کسی کی بھی جیب میں تھوڑا سا وقت گزارنے کے بعد پھر نئی جگہ اور جیب کی تلاش میں کسی نئی سمت چل نکلتی ہیں۔

بیٹی کی معصومیت، بہن کی اُلفت، بیوی کی محبت اور ماں کی شفقت اپنی جگہ، مگر وہ کونسی چیز ہے جو راتوں کو اس کو بے قرار رکھتی ہے۔ وہ کونسا آسیب ہے جو اس کو آرام سے رہنے نہیں دیتا۔ وہ کونسی چبھن ہے جو اس کو بے قرار رکھتی ہے۔ وہ کونسا دکھ ہے جو اس کو مضطرب رکھتا ہے اور وہ کونسا درد ہے جو اس کو راتوں کو جگاتا ہے۔ وہ کونسا زخم ہے جو راتوں کو اسے آنسو بھرنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ کونسی پیاس ہے جس سے اس [illegible] روح الجھ جاتی ہے۔ وہ کون سی لگن

ہے جو اس کی حیاء کو ختم کر دیتی ہے۔ اور وہ کونسی چیز ہے جو اس کو اتنی شدت سے اپنی اور کھینچتی ہے کہ ماں کی عزت، باپ کی پگڑی، بھائی کا نام کچھ بھی اس کے قدموں کو رات کی سیاہی میں دہلیز پار کرنے سے روک نہیں پاتا! اس بات کو، اس دُکھ کو، اس احساس کو اور پھانس کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔ اور زندگی ختم ہو جائے گی مگر انسانیت کی عزت و آبرو کا یہ مسئلہ حل طلب ہی رہے گا۔ دل ٹوٹے یا جاں روٹھے، جانے والی حیاء اور اٹھنے والے قدم واپس نہیں لوٹتے!

فطری طور پر ٹیڑھی ہونے کی وجہ سے کوئی بھی اس پر اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتا۔ کیونکہ پہلے سے ٹیڑھی ہونے کی وجہ سے مزید جھکے گی نہیں بلکہ ٹوٹ جائے گی۔ اس لئے اگر کوئی مرد یہ سمجھے کہ وہ اپنی طاقت قوت اور زور بازو یا فہم و فراست، ہیرے اور جواہرات اور مال و زر کے زور پر اس کو تابعداری، جی حضوری اور محبت میں مجبور کر دے گا تو یہ صرف خام خیالی اور دیوانگی ہی ہو سکتی ہے۔ یہ صرف اس صنف کی مہربانی ہے کہ وہ آپ کی عزت اور شہرت کو سنبھال کر اور گھر کی دہلیز تک محدود رکھے۔ ورنہ اس کی معصومیت، دل آویزی اور فطری ٹیڑھ کی بدولت اس کے فسانے پورے جہاں میں زبان زد عام ہوتے ہیں اس کے اپنے مرد کے علاوہ! یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی ایک شخص سے پوری پوری رات بات کرنے والی اور رو رو کر محبت کا یقین دلانے والی، منتیں ماننے والی مزاروں پر جا کر نوافل پڑھنے والی، رو رو کر ملاقاتوں کی بھیک مانگنے والی اور اپنا گھر بار چھوڑ کر محبت کے نام پر زندگی گزارنے والی، اچانک ایک صبح یہ کہہ دے کہ مجھے تم سے نفرت ہے، اب مجھے کوئی اور پسند ہے اب میں اس سے محبت کرتی ہوں اور [illegible] اس کی محبت [illegible] چند سالہ [illegible] والی [illegible]

جا کر کس معصومیت بھری ڈھٹائی سے کہتی ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے! صرف تم سے محبت ہے۔۔۔ا تیرے علاوہ میری زندگی میں بھلا کوئی کیسے آ سکتا تھا۔ میری آنکھیں تو ایک عرصہ سے صرف تیری متلاشی تھیں۔ میری روح صرف تیرے ملاپ کی منتظر تھی، میرے جسم کو صرف تیری پیاس تھی۔ میری سانسوں میں صرف تیری باس تھی۔ میرے ہونٹ صرف تیرے لئے چٹنے کے منتظر تھے، میرے لب صرف تیرے لئے وا ہونے تھے۔ میری زبان صرف تیرا نام چپنے کے لئے بنی تھی۔ میرے گیسو صرف تیرے کندھوں پر بکھرنے کے لئے دراز ہو رہے تھے۔ میری پلکیں صرف تیرے لئے جھپکتی تھیں۔ میرے دل کی دھڑکن تیری امانت تھی۔ میری کمر کا بل تیرا تکیہ اور جسم تیرے لمس کا پیاسا تھا۔ میں نے دن کے اُجالے میں، رات کی تاریکی میں، بستر کی سلوٹوں اور اپنی کروٹوں اور ہر ہر سوچ میں تمہیں سوچا اور کھوجا تھا۔ اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر ٹپ ٹپ آنسوؤں کی برسات میں کہے، کہ تم میرے ہو۔۔۔ صدیوں سے میرے ہو۔۔۔!

یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ ایسی شاطر، دروغ گو اور عیار معصومیت کیسے ممکن ہے۔ مگر مرد ہمیشہ سے جاہل اور جلد باز اس ناقص العقل مخلوق کو ایک بار پھر تم ترگھتے ہوئے فاتحانہ انداز میں ایک نیا قلعہ فتح کرنے کے زعم میں ایک فاتحانہ، زیر لب مسکراہٹ بکھیر کر اس کو گلے لگاتا ہے اور وہ اس کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکا کر یہ سوچ رہی ہوتی ہے کہ اب کے شادی ہو گی۔۔۔ اس سے ملاقات کیسے ہو گی۔

دغا اور دھوکہ عورت کی فطرت اور خوش فہمی اور اظہار مرد کی ضرورت [illegible] مگر [illegible] ہوو کا ایک دوسرے [illegible] ہے!

حضرت سلطان باھوؒ

اور پھر جیسے وقت تھم گیا ہو۔ ہر شے ساکت ہوگئی ہو اور بچے نے لمحوں میں خود کو آنحضورﷺ کی بارگاہ میں پایا۔ جہاں صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ اور عثمان غنیؓ بھی موجود تھے۔ رسول اللہﷺ نے بچے سے پہلے خود بیت لی پھر اُسے حضرت علیؓ کے سپرد کردیا اور پھر اُس معصوم کی دنیا ہی بدل گئی۔

سلطان العارفین کی زندگی کے ایمان افروز حالات زندگی!

گیارھویں صدی ہجری کا زمانہ تھا۔ سلطنت ہندوستان کی مسند پر مغلیہ فرماں روا شاہجہاں جلوہ افروز تھا۔ ملتان، سلطنت دلی کا ہی ایک حصہ تھا۔ ملتان کے ناظم اور [illegible] کے راجہ کے درمیان [illegible] کے ریگستان کے مسئلے پر اختلافات پیدا ہوگئے اور یہ اختلافات اتنی شدت سے اُبھر کر سامنے آئے کہ علاقے کی فضا پر جنگ کے بادل منڈلاتے صاف نظر آرہے تھے۔ بظاہر دونوں حکومتوں کے مابین صلح

جوئی کے لیے قاصدوں اور ایلچیوں کی آمدورفت جاری تھی مگر وقت کا ہر لمحہ ایک خونریز جنگ کی سمت پیش رفت ظاہر کر رہا تھا۔

مروٹ کا راجہ وڈانہ اپنے دربار میں بیٹھا، ساتھیوں کے صلاح مشورے میں مشغول تھا کہ ایک شخص اچانک تیز تیز قدم اُٹھاتا دربار میں داخل ہوا اور راجہ کی سمت بڑھنے لگا۔ پیشتر اس کے کہ درباری اور خود راجہ، نووارد کے عزائم سے باخبر ہوتے۔ اس نے بیکا ایک تلوار بلند کی اور دوسرے ہی لمحے راجہ کا سرتن سے جدا ہو کر زمین پر آن پڑا۔ نووارد شخص نے پھرتی سے ایک ہاتھ میں راجہ کا سر تھاما اور دوسرے ہاتھ سے تلوار کے جوہر دکھاتا راستے میں آنے والی مزاحمتوں کو دُور کرتا پھرتی سے دربار سے باہر نکل آیا، جہاں اس کا گھوڑا اپنے سوار کا منتظر تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ گھوڑے کی پشت پر سوار تھا اور گھوڑا برق رفتاری سے سرپٹ محل کی مخالف سمت دوڑنے لگا۔

ملتان کی فوج جو کہ مروٹ کی جانب پیش قدمی کر رہی تھی، اُس نے جب ایک تیز رفتار گھڑ سوار کو ہاتھ میں انسانی سر تھامے اپنی طرف تیزی سے بڑھتے دیکھا تو ٹھٹھک کر وہیں رُک گئی۔ سوار نے نزدیک پہنچ کر راجہ کا کٹا سر ملتان کے ناظم کے قدموں میں ڈال دیا جو لشکر کے ہمراہ ہی تھا۔ ناظم سمیت پورے لشکر پر راجہ کا کٹا سر دیکھ کر حیرت طاری ہو گئی اور وہ انگشت بدنداں ہو کر کبھی وڈانہ کا سر دیکھتے اور کبھی اپنے سامنے کھڑے اس نوجوان سوار کو دیکھتے، معاً ملتانی لشکر سکتے کی اس عارضی کیفیت سے نکلا اور فتح کے پُرزور نعروں سے اپنی مسرت کا اظہار کرنے لگے۔

وہ نوجوان جس نے راجہ وڈانہ کا سر کاٹ کر غیر معمولی شہرت حاصل کی لشکر کے لیے اجنبی نہ تھا۔ وہ ایک کہنہ مشق، آزمودہ کار اور جری سپہ سالار بایزید محمد تھا۔ جو دلی سرکار کی فوج سے مفرور ہو کر روپوش تھا۔ جس نے سلطنت دلی کی منصب داری ٹھکرا کر خدا سے لو لگائی تھی لیکن اپنے اس غیر معمولی کارنامہ سے ایک بار پھر منظر عام پر آ گیا تھا۔ شاہی دربار سے جہاں اس کے لیے تحسین آفرین کا پیغام آیا۔ وہیں اُس کے لیے حکم بھی تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے شاہی لشکر کو فیض یاب کرے مگر وہ نوجوان بایزید محمد عشق حقیقی میں اتنا ڈوب چکا تھا کہ اس نے شاہی دربار میں یہ عریضہ بھیجا کہ "میں نے اپنی آئندہ زندگی صرف اور صرف خدا کی راہ میں وقف کر دی ہے چنانچہ میں اب ہر ذمہ داری اور ہر خدمت سے سبک دوش ہونا چاہتا ہوں"۔

چاروناچار اُس کی یہ درخواست منظور کر لی گئی مگر ہند کے حاکم شاہجہاں کے اصرار پر اپنی معاشی کفالت کے لیے اسے شورکوٹ کے نزدیک ایک جاگیر قبول کرنا ہی پڑی۔ جو بایزید نے وہاں کی ایک خانقاہ اور مدرسے کے اخراجات کے لیے وقف کر دی۔

گھر والوں کو جب بایزید کی طویل گمنامی کے بعد اتہ پتہ معلوم ہوا تو وہ اُسے واپس لانے کے خواہش مند ہوئے مگر بایزید محمد کی زوجہ بی بی راستی نے جو ایک پرہیزگار اور دنیاوی آلائشوں سے پاک خاتون تھیں اُن پر واضح کیا کہ "اب وہ کبھی نہ آئیں گے"۔

ہم خدا کی رضا سے اس فانی دنیا کو ترک کر چکے ہیں۔ میرے پاس اللہ کی ایک مقدس امانت پرورش پا رہی ہے۔ جو مادرزاد ولی ہوگا اور جس کا ظہور چناب کے علاقہ میں ہوگا۔ سو تم انہیں واپس لانے کا خیال ترک کر دو بلکہ مجھے بھی اُن کے پاس پہنچا دو"۔

چنانچہ جلد ہی بی بی راستی اپنے شوہر بایزید محمد کے پاس شورکوٹ پہنچ گئیں اور شورکوٹ کی [illegible] اللہ ہو اللہ [illegible] سے [illegible] ... [illegible] وطن [illegible] ہی دن

رات اللہ ھو کا ورد کرتے۔ پھر ایک دن اُن کے اللہ ھو کے ورد میں ایک نوزائیدہ بچے کی معصوم کلکاریوں کی گونج بھی ہم آہنگ ہوگئی اور اللہ کی امانت ظاہری حالت میں بی بی راستی کی آغوش میں ہمکنے لگی۔

وہ معصوم بچہ جس کی آنکھوں میں ستاروں کی چمک تھی اور پیشانی چاند کی طرح روشن اس کے فطری اور پیدائشی جوہر شیر خواری میں ہی چمکنے لگے۔ ماں عبادت یا تلاوت میں مشغول ہوتی تو اس یقین کے ساتھ کہ بچہ اس کی مصروفیات میں حارج نہیں ہوگا اور اس معصوم سی جان کا یہ عالم تھا کہ رمضان کے دنوں میں دُودھ پینے سے اجتناب برتنے لگا۔ اُس کی شخصیت میں ایسی عجیب سی مقناطیسی کشش تھی کہ جس پر نظر ڈالتا اُس میں ایک حیرت انگیز تغیر رونما ہوجاتا اور پھر خود بخود بنا کسی تبلیغ و ترغیب کے کلمہ شہادت پڑھ کر وہ حلقہ اسلام میں آجاتا۔ ایک عجیب و غریب صورتحال تھی جس سے غیر مسلم بے حد خائف تھے۔ چنانچہ انہوں نے باہمی صلاح مشورے کے بعد بچے کے باپ بازید محمد سے درخواست کی کہ جب بھی آپ کا بچہ اکیلا یا آپ کے ہمراہ باہر نکلے۔ براہ مہربانی منادی کرادیا کریں تاکہ ہمارے ہم مذہب بھائی اس سے خود کو اس بچے کی نظروں سے دُور رکھ سکیں۔ بازید محمد نے مسکرا کر خندہ پیشانی سے انہیں اُن کے مطالبے کا اثبات میں جواب دیا اور پھر فضا وہ عجیب منظر دیکھتی کہ جب بھی اُس بچے کے باہر نکلنے کا اعلان ہوتا غیر مسلم خود کو اپنی پناہ گاہوں میں چھپالیتے کہ کہیں حق کا یہ ناقابل تردید نور اُن کے باطل نظریے پر اثر انداز نہ ہو۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ بچہ شعور کی منزلیں طے کرتا، جذب و مستی میں غرق پروان چڑھتا رہا۔ ایک دن وہ [illegible] یادِ [illegible] ڈوبا شورکوٹ [illegible] میں گھوم رہا تھا کہ اچانک اُس پر بے خودی سی چھا گئی۔ ایک بے نام سی پُر سکون کیفیت میں اُس نے ایک نورانی چہرہ دیکھا۔ جس نے اپنائیت سے اُسے پکڑ کر قریب بٹھایا اور پھر بڑے دلنشیں انداز میں اُسے آگاہ کیا کہ میں علیؓ ابن طالب ہوں۔ بچہ کم عمر تو تھا لیکن کم علم نہیں۔ اُس نے جو علیؓ کو یوں سامنے دیکھا تو قریب تھا کہ وہ وفور مسرت سے خود کو اُن پر نثار کر دیتا۔ حضرت علیؓ نے اُس پر توجہ مرکوز کر کے اُس میں حوصلہ پیدا کیا اور فرمایا "فرزند! آج تم رسول ﷺ کے دربار میں طلب کیے گئے ہو"۔

اور پھر جیسے وقت تھم گیا ہو۔ ہر شئے ساکت ہوگئی ہو اور بچے نے لمحوں میں خود کو حضور ﷺ کی بارگاہ میں پایا۔ جہاں صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ اور عثمان غنیؓ بھی موجود تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے بچے سے پہلے خود بیعت لی پھر اُسے حضرت علیؓ کے سپرد کردیا اور پھر اُس معصوم کی دنیا ہی بدل گئی۔ جوانی کی منزل میں قدم رکھا تو سلطان العارفین شیخ سلطان باھو کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضور ﷺ سے شرفِ ملاقات کے سبب سلطان باھو اب ہر وقت' ہر لمحہ حق کے مشاہدوں سے مشرف اور ذات وحدہ لاشریک کے جاہ و جلال میں مست رہتے۔ اولیاء کے مقبروں پر حاضری دیتے۔ زندہ مشائخ کے پاس جاتے، خدا کی وحدانیت کا پرچار کرتے دن رات دل میں اللہ کی محبت کی جوت جگائے اللہ ھو اللہ ھو کرتے رہتے۔

سلطان باھو نے کسی قسم کا کتابی علم تو حاصل نہیں کیا تھا لیکن اُن کے سینے میں روحانی علم کا ایک سمندر موجزن تھا۔ فقر' تصوف' معرفت پر آپ کے ملفوظات کا ذخیرہ ایک بیش [illegible] قیمت [illegible] اثاثہ ہے۔ شریعت، [illegible] معرفت، [illegible] حقیقت [illegible] جیسے مشکل اور نازک موضوعات

پر لاتعداد تصانیف اُن سے منسوب ہیں۔ اپنی ایک کتاب میں فرماتے ہیں "لوگو! میں نے جو کچھ دیکھا، ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا جو سر میں ہوتی ہیں اور اس ظاہری جسم سے دیکھا اور مشرف ہوا"۔

شیخ سلطانؒ نے علوم کے حصول کے لیے کوچہ گردی اور صحرانوردی کا سلسلہ اختیار کیے رکھا۔ آپؒ تجسس کی مسافت کے راستوں کو طے کرتے مختلف درویشوں اور فقیروں سے ملے، لیکن کوئی بھی آپؒ کی کسوٹی پر پورا نہ اُترا۔ علم کے سفر میں، آپؒ نے ہندوستان سے عراق تک کا طویل سفر طے کرنے کے لیے رختِ سفر باندھا اور بغداد جا پہنچے۔ شاہ حبیب اللہ کی خانقاہ میں داخل ہوئے تو دیکھا خانقاہ درویشوں، زائرین اور خدام سے بھری ہے اور لوگ جوق در جوق ایک جانب ہلکی آنچ پر رکھی پانی سے بھری دیگ میں ہاتھ ڈالتے جاتے ہیں اور مُرادیں پاتے جاتے ہیں۔ آپؒ نے خاموشی سے یہ سب منظر دیکھا اور چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گئے۔ دفعتہً شاہ حبیب اللہ کی نظر اُن پر پڑی تو انہوں نے سلطان باہوؒ سے کہا "تیری ظاہری حالت سے تو دکھائی دیتا ہے تو طویل مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے پھر اب خاموش اور علیحدہ کیوں بیٹھا ہے اُٹھ...... تو بھی دیگ میں ہاتھ ڈال کر اپنی مراد پا"۔

سلطان باہوؒ نے خاموشی سے اُن کی بات سُنی اور ادب سے بولے "مجھے کشف و کرامت کے یہ کھلونے متاثر نہیں کرتے اور نہ میری مراد ایسی ہے جو اس طرح بر آئے۔ میں وہ مقام پانا چاہتا ہوں جہاں ذاتِ حق کے سوا کوئی نہ ہو، حق باہو، باہو"۔

شاہ حبیب اللہ نے چونک کر اُن پر نظر ڈالی اور کہا "درویش! بے شک تیری آواز بلند تر ہے لیکن کیا تو جانتا ہے کہ بلند آرزو کی تکمیل کے مراحل کتنے کٹھن ہیں"۔

"بے شک" سلطان باہوؒ نے عزم سے کہا "میں نے یہ طویل مسافت بے سبب طے نہیں کی آپ حکم دیجیے"۔

شاہ حبیبؒ کچھ دیر تک آپؒ کے چہرے پر نظریں جمائے آپؒ کو دیکھتے رہے پھر بولے "اچھا فی الحال پانی بھر" یہ کہہ کر انہوں نے ایک خادم کو بلایا۔ جس نے ایک مشکیزہ لا کر آپؒ کے حوالے کر دیا۔ سلطان باہوؒ نے وہ مشکیزہ اٹھایا اُسے پانی سے بھرا اور لے جا کر حوض میں انڈیلا۔ حوض ایک ہی مشکیزہ سے لبالب پانی سے بھر گیا۔ شاہ حبیب سمیت حاضرین نے حیرت سے اُسے دیکھا چنانچہ اگلے لمحے شاہ حبیبؒ حضرت باہوؒ سے مخاطب ہوئے "آزمائش کے لیے خود کو آمادہ پاتا ہے؟" آپؒ نے فوراً آمادگی ظاہر کی۔ شاہ حبیبؒ نے پوچھا "تیرے پاس کوئی دنیاوی مال و اسباب بھی ہے کیا؟"

آپؒ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شاہ حبیبؒ برجستہ بولے "درویش اور دنیاوی مال کا آپس میں کیا تعلق؟ ایک میان میں دو تلواریں کیسے رکھی جا سکتی ہیں؟ ارے تو ایک دل میں دو محبتیں جمع کرنا چاہتا ہے"۔

یہ سُن کر سلطان باہو تقریباً بھاگتے ہوئے خانقاہ سے نکلے اور بغداد سے نکل کر ہندوستان کی طرف گامزن ہوئے۔ گھر جا کر انہوں نے تمام مال و زر اکٹھا کیا اور باہر پھینک دیا۔ حتیٰ کہ پنگھوڑے میں لیٹے اپنے شیر خوار بچے کی انگلی سے سونے کی انگوٹھی بھی اُتار کر باہر اُچھال دی۔ اگلی صبح پھر وہ طویل مسافت طے کر کے بغداد پہنچے اور سیدھے خانقاہ میں گئے۔ درویش شاہ حبیبؒ نے انہیں دیکھتے ہی ہاتھ کر اُن کا استقبال کیا اور بولے "بہت خوب، تم نے دنیاوی

خون کی کمی اور عام کمزوری کے لئے ایک عمدہ ٹانک

اچھی صحت کے لیے معدنی اجزاء نہایت ضروری ہوتے ہیں۔ اور بدن کو ان کی روزانہ ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے اہم معدنی اجزاء کی طرح فولاد (آئرن) ایک ناگزیر ضرورت کا حامل عنصر ہے۔ جس پر صالح خون اور توانا بدن کا دارومدار ہے۔ فولاد کا معدنی جزو خون بناتا اور صاف کرتا ہے۔ اس کی روزانہ ضرورت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرد کو روزانہ 28 ملی گرام عورت کو 30 ملی گرام حاملہ عورت کو 38 ملی گرام اور بچے کو 26 سے 40 ملی گرام تک فولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

خون کے سرخ ذرات مخصوص پروٹین اور فولاد سے بنتے ہیں۔ اور سائنسی تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ بدن کی پرورش اور انسانی زندگی کے لیے فولاد ایک اہم ضرورت ہے۔ جس کا روزانہ خوراک میں شامل کیا جانا ضروری ہے۔

فولاد بیماریوں کے خلاف مزاحمت کرتا اور توانائی کی نشوونما کرتا ہے۔ لہٰذا فولاد کا روزانہ حصول ہی صحت کا ضامن ہے انسانی صحت اور زندگی کی ان ضرورتوں کے پیش نظر **مرحبا** لیبارٹریز نے نباتاتی اجزاء پر مشتمل شربت فولاد بنایا ہے جو بدن میں فولاد کی کمی کو پورا کرنے کے علاوہ اُن تمام اعضاء کو صحت مند اور فعال بناتا ہے جو فولاد کے معدنی اجزاء کو ذخیرہ کرتے اور انہیں جزو بدن بناتے ہیں۔

جسم میں فولاد کی کمی کی وجوہات اور علامات

فولاد کا بدن سے اخراج بھی جاری رہتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً انفیکشن' ادویات اور کیمیکلز کا زیادہ استعمال' خون کے زیادہ بہنے' اندرونی اعضاء کے متاثر ہونے' اسقاط حمل' حیض میں زیادہ خون آنے' بار بار حمل ٹھہرنے' زیادہ عرصہ تک بچے کو دودھ پلانے' گرمیوں میں بے تحاشا پسینہ بہنے سے فولاد کی کمی ہو جاتی ہے۔ فولاد کی کمی کے باعث تھوڑی سی محنت مشقت پر سانس پھول جانا' چہرے کا رنگ زرد ہونا' جنسی کمزوری غالب آ جانا' چڑچڑے پن کا شکار ہو جانا' ڈیپریشن کا عود آنا' بیماریوں کے خلاف مزاحمت میں کمی ہو جانا' نڈھال اور بے سکون رہنا ایسی علامات پائی جاتی ہیں۔

مرحبا شربت فولاد کی خصوصیات

- جگر معدہ اور اعصابی نظام کو درست کرتا ہے۔
- چہرے کی چھائیاں اور زردی کو ختم کر کے چہرے پر شادابی لاتا ہے۔
- جسم میں توانائی اور چستی بڑھاتا ہے۔
- بھوک بڑھاتا اور ہاضمہ کا عمل تیز کرتا ہے۔
- جوڑوں کے درد رفع کرتا ہے اور دل کی دھڑکن اعتدال پر لاتا ہے۔
- وضع حمل کے دوران خواتین کو جسمانی کمزوریوں سے بچاتا ہے۔

مرحبا لیبارٹریز
142 ... انڈسٹریل اسٹیٹ کوٹ لکھپت لاہور، پاکستان
E-mail: info@marhaba.com.pk ... 511 8679-5156068

مال سے تو نجات حاصل کر لی مگر ابھی اپنی عورتوں سے آزادی حاصل نہیں کر پائے دونوں میں سے کس کا حق ادا کرنے کا ارادہ ہے؟ بیویوں کا حق ادا کرو گے یا خدا کا؟"

یہ سُننا تھا کہ سلطان باہو بنا کچھ کہے، آرام کیے بغیر ایک بار پھر اپنے طویل سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ منزلیں سر کرتے وہ گھر پہنچے تو ماں نے انھیں دیکھتے ہی پہلے اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ ایک پرہیز گار نیک خاتون تھیں۔ اچھی طرح جانتی تھیں کہ بیٹا آج کس نیت سے گھر داخل ہوا ہے۔ پھر بھی انجان بنتے ہوئے بولیں "کیوں سلطان.....اب کیسے آنا ہوا؟"

آپؒ نے نرمی سے سر جھکا کر مقصد بیان کیا۔ آپؒ کی والدہ بی بی راستی نے انھیں قریب بٹھایا اور آہستگی سے مخاطب ہوئیں۔ تمہاری بیویوں کے جو حقوق تم پر ہیں۔ آج سے تم اُن سے آزاد ہو اور تمہارے جو حقوق بیویوں کے ذمے ہیں وہ بدستور قائم رہیں گے۔ اگر تم حقیقی معرفت کے حصول میں کامیاب ہو گئے تو بہتر ہے لیکن محض بیویوں کے حقوق پورے کرنے کی خاطر گھر آئو تو اُس کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا اب طلاق کا خیال بھی دل میں نہ لانا"۔

ماں کی یہ قابلِ قبول تجویز سُن کر آپؒ بہت پُرسکون اور مطمئن انداز میں دوبارہ بغداد کی طرف روانہ ہوئے اور سیدھے خانقاہ پہنچے۔ جہاں اس مرتبہ شاہ حبیبؒ نے آپ کا انتہائی پُرتپاک استقبال کیا اور کامل نظر سے اُن کی طرف توجہ کی۔ سلطان باہوؒ آپؒ کی اس توجہ سے قلبی واردات سے دوچار ہوئے۔ کچھ دیر بعد شیخ حبیبؒ نے دریافت کیا "سلطان! مطمئن ہے؟ کچھ مشاہدہ کیا؟"

آپؒ نے ادب سے سر جھکا کر کہا "شیخ جو کچھ مجھ پر منکشف ہوا اُن سے [illegible] میں تھا

آشنا ہو گیا تھا۔ میری تمنا اس سے زیادہ کی ہے"۔

شیخ حبیبؒ نے جواب تو نہ دیا البتہ بیٹھے بیٹھے اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ آپؒ بھی خوب سمجھتے تھے کہ یہ عمل مقصدِ امتحان ہی ہے چنانچہ آپؒ بھی جھٹ سے اُن کے تعاقب میں جا پہنچے اور ایک کھیت میں شیخ حبیبؒ کو ضعیف کاشتکار کی شکل میں محنت مشقت کرتے پایا۔ آپؒ نے نزدیک جا کر فرمایا "بابا! یہ ضعیفی اور یہ مشقت؟ آپؒ آرام کریں میں کام کرتا ہوں؟ سلطان باہو کو دیکھ کر شاہ حبیبؒ اپنے اصل روپ میں آئے اور ہنس کر انھیں ساتھ لیا اور آگے بڑھے مگر چند قدم چلنے کے بعد پھر غائب ہو گئے۔ آپؒ نے بھی ان کا تعاقب نہ چھوڑا اور اب کی مرتبہ انھیں ایک آبادی میں ایک بوڑھے برہمن پنڈت کی شکل میں لوگوں کو ماتھے پر تلک لگاتا پایا۔ شاہ باہو مسکرا کر نوجوان کے بھیس میں اُن کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور کہنے لگے۔

"بابا! میرا ماتھا تو خالی ہے کیا میرے یہ بھاگ نہیں کہ میرے ماتھے پر آپ تلک لگائیں"۔

دوسرے ہی لمحے شیخ حبیبؒ اپنی اصل صورت میں سلطان باہوؒ کے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے سلطان باہوؒ کا ہاتھ تھاما اور آگے بڑھ گئے لیکن تیسری مرتبہ پھر وہی حرکت کی اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ سلطان باہوؒ کہاں پیچھا چھوڑنے والوں میں سے تھے۔ آپؒ بھی خراماں خراماں اُن کے پیچھے لپکے اور ایک مسجد میں انھیں جا ڈھونڈا جہاں شیخ حبیبؒ امام مسجد کے روپ میں بچوں کو قرآنی تعلیم دے رہے تھے۔ چنانچہ سلطان باہوؒ بھی جھٹ بچے کے روپ میں قاعدہ پکڑے اُن کے سامنے جا بیٹھے اور ایک حرف پر انگلی رکھتے ہوئے معصومیت سے پوچھنے لگے "بابا! یہ کیا ہے"؟ [illegible] بار شیخ حبیبؒ کی

آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آپؒ کے چہرے پر جو پہلے مسکراہٹ مچلتی تھی وہ اس مرتبہ غائب تھی۔ انہوں نے آب دیدہ ہو کر سلطان باہوؒ کو سینے سے لگا لیا اور کہنے لگے "بس باہو...... بہت ہو چکا" لیکن سلطان باہو نے اپنی حالت نہ بدلی، آپؒ بدستور اسی حرف پر اٹکی جمائے پوچھنے لگے "بابا بتاؤ...... یہ کیا ہے؟"

شیخ حبیبؒ بیچارگی سے بولے "سلطان میں تجھے کیا بتاؤں تو میرے بس کا نہیں ہے" پھر انہوں نے سلطان باہوؒ کو اپنے شیخ عبدالرحمان قادریؒ کی طرف جانے کی ہدایت کی جو دلی میں فروکش تھے۔

سلطان باہوؒ نے اسی وقت رختِ سفر باندھا۔ بغداد کو خدا حافظ کہا اور ہندوستان ...... کی طرف چل پڑے۔ ابھی دلی سے دور ہی تھے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آپؒ کے پاس آیا اور آگے بڑھ کر سلطان کے پاؤں عزت سے چھونے کے بعد احتراماً اُن سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر خانقاہ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "حضرت اُدھر چلنا ہے"۔

یہ خادم شیخ عبدالرحمان قادریؒ کا بھیجا ہوا تھا جنہوں نے مراقبہ میں سلطان باہوؒ کو اپنی طرف آتا دیکھ لیا تھا چنانچہ انہوں نے ایک خادم کو آپؒ کی رہنمائی کے لیے روانہ کر دیا جیسے ہی خادم کی معیت میں سلطان باہوؒ، شیخ عبدالرحمانؒ کے روبرو پہنچے تو شیخ بنا کچھ کہے انہیں حجرے میں لے گئے اور ایک بھرپور نگاہ مرکوز کی۔ اُن کی نگاہ میں ایک عجیب سی تاثیر تھی اور اس سے سلطان کو وہ سب کچھ حاصل ہو گیا جس کی چاہ میں وہ برسوں سے خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ جس نعمت کے لیے وہ دردر سرگرداں تھے۔ وہ سب کچھ ایک لمحے میں اُن پر منکشف ہو گیا۔ اسرار و رموز کا سمندر اُن کی آنکھوں میں اُتر گیا۔ شیخ کی اس ایک نگاہ نے سلطان باہوؒ کو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک بنا دیا۔

فیض رسائی کی اس غیر معمولی استعداد کے حصول کے بعد سلطان باہوؒ چلتے چلتے جامع مسجد کے سامنے جا پہنچے۔ جمعہ کا روز تھا۔ مسلمانانِ ہند جامع مسجد میں خشوع و خضوع کے ساتھ عبادت میں مشغول تھے۔ آپ بھی اُن کے ساتھ نماز میں شریک ہو گئے۔ جیسے ہی نماز ختم ہوئی سلطانؒ نے پورے مجمع

"سچ بولنا بھی جرم ہے"

ہم نے وہ تقریر کیا کی۔ مصیبت ہی مول لے لی۔ دنیا میں سچ بولنا بھی جرم ہے۔ ذرا سی تنقید ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوتی۔ احتجاج ہو رہے ہیں۔ جلوس نکل رہے ہیں۔ پوسٹر لگ رہے ہیں۔ آج تو اہلِ ہند کی گستاخی حد سے بڑھ گئی۔ گزشتہ چند راتیں عزیزی محمد شاہ کی دعوتوں میں جاگ کر گزارنا پڑیں۔ چنانچہ طبیعت کچھ گراں ہو گئی۔

شاہی حکیم معائنہ کرنے آئے۔ اتنے میں نہ جانے کس احمق نے شہر میں یہ افواہ اُڑا دی کہ ہم اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے اس خبر کو نہ صرف سچ مان لیا بلکہ اسی سلسلے میں جامع مسجد کے پاس فقراء کو جلیبیاں تقسیم کی گئیں۔ اس کی شہادت یوں ہوئی کہ شہباز خان الو شناس کو جو اس وقت جامع مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا۔ فقیر سمجھ کر کچھ جلیبیاں دی گئیں۔ جنہیں وہ بارگاہِ دولت میں لے کر حاضر ہوا۔ ہم نے ان کو چکھا اور نہایت لذیذ پا کر اسے دوبارہ جامع مسجد کی طرف بھیجا۔

("پسِ تحریر" ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کے مضمون سے اقتباس)

(مرسلہ: ندیم گلاب۔ لاہور)

کی طرف ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ لوگوں پر نگاہ ڈالنی تھی کہ جامع مسجد یاحق! یاحق! کے نعروں سے گونج اٹھی۔ ہر شخص وجد کے عالم میں یاحق! یاحق! کی صدائیں لگا رہا تھا لیکن اس پورے مجمعے میں صرف تین اشخاص بادشاہ، قاضی اور کوتوال شہر وجد کی اس کیفیت سے محروم تھے۔ جیسے ہی سلطان نے توجہ منقطع کی اور مجمع اپنی حالت میں آیا تو وہ تینوں سلطان باہوؒ کے پاس آئے اور پوچھنے لگے۔

"بابا! ہمیں کیوں اس نعمت سے محروم رکھا؟"

سلطان باہو نے جواب دیا "باغ میں گل اور صحرا میں خاروار پودے اُگتے ہیں تو اس میں بارش کو دوش نہیں دیا جاتا۔ میں نے سب پر یکساں توجہ دی۔ تم سخت دل ہو تم پر اثر نہیں ہوا تو میرا کیا قصور؟"

انہوں نے عاجزی سے درخواست کی کہ ہمیں اس لذت سے محروم نہ رکھیں چنانچہ آپؒ نے ان کی استدعا قبول کی اور اُن پر نظر کرم ڈالی۔

یہاں سے فارغ ہوکر سلطان باہو بازاروں میں جا نکلے اور خلقت پر توجہ صرف کی۔ نتیجتاً شہر میں ایک ہنگامہ سا بچ گیا۔ کسی نے دوڑ کر شیخ عبدالرحمانؒ کو آگاہ کیا کہ ایک ولی بازار میں لوگوں کو وجد و جلال میں مبتلا کرتا پھر رہا ہے۔

انہیں اس کا اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ولی کون ہوسکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے سلطان باہوؒ کو بلا کر رنجیدہ اور ملول سے لہجے میں کہا "باہو! یہ کیا؟ ہماری دی نعمت کو اس طرح عام کرتا پھر رہا ہے"۔

سلطان باہوؒ نے احترام سے سر جھکائے کہا "شیخ! کوئی عورت بازار سے توا بھی خریدے تو ٹھونک بجا کر دیکھ لیتی ہے، کوئی لڑکا کمان خریدے تو کھینچ کر چک ضرور دیکھتا ہے۔ پھر میں کس طرح آپؒ سے حاصل کی [illegible] نہ آزماتا۔"

شیخ عبدالرحمانؒ سلطان کی یہ دلیل سن کر مسکرا پڑے اور کہنے لگے "باہو! میں تجھے منع نہیں کرتا مگر اس کا خیال رکھا کر کہ ہر شخص اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اب تُو وطن واپس جا اور رشد و ہدایت کا کام سنبھال"۔

ایک طویل عرصہ کے بعد شیخ سلطان باہوؒ واپس لوٹے اور تبلیغ و تلقین کا سلسلہ شروع کردیا۔ خانقاہ درویشوں سے بھری رہتی۔ لنگر خانے کا انتظام بی بی راستی نے سنبھال لیا۔ راہوں سے بھٹکے بدنصیب افراد آتے اور آنکھوں میں مشعلیں روشن کر کے خانقاہ سے لوٹتے۔

سلطان باہوؒ نے آبائی جاگیر سے ایک تنکا تک کبھی نہ لیا۔ ضروریات زندگی کی خاطر بیلوں کی جوڑی خرید کر کاشتکاری شروع کردی مگر فصل کاٹنے سے پہلے ہی اُسے دوسروں کے لیے چھوڑ دیا۔ روکھی سوکھی کھا کر اور موٹا لباس پہن کر گزارہ کرتے۔

ایک دن شورکوٹ کے آس پاس کا رہائشی قلاش رئیس آپؒ کی خدمت میں مالی امداد کی خاطر حاضر ہوا۔ لیکن اُس نے جب آپؒ کو یوں محنت مزدوری کرتے پایا تو مایوس ہوکر واپس پلٹا کہ یہ شخص بھلا اس کی کیا مدد کر پائے گا۔ ابھی وہ مڑا ہی تھا کہ اچانک پشت سے نام لیکر کسی نے پکارا۔ وہ شخص حیرت زدہ ہوکر پلٹا تو حضرت سلطان باہوؒ اشارے سے بلا رہے تھے۔ دل میں اُمید کی کرن چمکی تو اُن کے پاس تیزی سے لپکا۔ آپؒ نے فرمایا "کیوں رے اتنی مصیبت سہنے کے بعد ملاقات کیے بنا ہی پلٹ رہا تھا" اُس بیچارے نے جو یہ اپنائیت بھرا لہجہ سنا تو دکھڑا سنانے لگا۔ سلطان باہوؒ نے اُسی وقت زمین سے ایک ڈھیلا اُٹھا کر دوبارہ زمین پر جو مارا تو زمین پر مٹی کے ڈھیلے سونے کے بن گئے۔ وہ [illegible] حیرت و استعجاب [illegible] کر [illegible] گیا۔ آپؒ نے فرمایا

"لے جتنا ضرورت ہے لے جا" وہ شخص فوراً اپنے ساتھیوں کو بلا لایا اور گھوڑوں پر سونا لاد کر وہاں سے رخصت ہوا۔

سلطان باہوؒ کو دنیاوی دولت سے کس قدر نفرت تھی۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعے سے ہوتا ہے۔ ایک دن آپؒ ریت پر لیٹے سر اپنے ایک مرید کے زانوں پر رکھے سو رہے تھے۔ ریت پر سونے سے اُن کا لباس اور جسم خاک آلود ہو گیا۔ مرید نے جو مرشد کو اس حال میں دیکھا تو دل ہی دل میں تاسف کا اظہار کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ کاش میرے پاس زر و جواہر ہوتے تو آج اپنے پیر کو یوں زمین پر نہ سُلاتا۔

سلطان باہوؒ نے اس کے زانوں سے سر اُٹھا کر پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟" مرید نے جو محسوس کیا تھا اور پھر جو سوچا تھا سب آپ کو کہہ سنایا۔ آپؒ نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور کہا "ذرا آنکھیں بند کر" مرید نے حکم کی تعمیل کی تو کیا دیکھتا ہے ایک باغ بے مثل ہے۔ ہر سو مہکتی فضا ہے اور ایک حسین و جمیل لڑکی جواہرات میں لدی پھندی اُس سے کہہ رہی ہے۔ "مجھ سے نکاح کر لو" مرید نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "دور ہو کمبخت، کیوں مجھے مرشد کی نظروں سے گرانا چاہتی ہے" اور پھر اُس کی آنکھیں خود بخود کھل گئیں اور پلکیں شرم سے جھک گئیں۔ آپؒ نے مسکراتے ہوئے اُس سے پوچھا کہ "کیا دیکھ رہا تھا؟" مرید نے سب حال کہہ سنایا۔ آپؒ نے پوری بات سننے کے بعد کہا "تو کیسا ہے رے، ابھی تو دولت کو طمع کر رہا تھا۔ وہ دنیا ہی تو تھی، تو نے اُسے ہی ٹھکرا دیا" مرید نے سر جھکائے کہا۔ مرشد خادم زر و جواہر کا نہیں، فقر کا خواہش مند ہے" آپؒ نے اس کے حق میں دعا کی۔

سلطان باہوؒ نے 1102 ہجری میں وفات پائی۔ آپؒ کے مزار پر جذب و کشش کا عالم ہے۔ ہر سو خوشبو کے جھونکے چلتے ہیں اور تاریک راہوں کے بھٹکے مسافر آپؒ کے مزار پر ہدایت کی راہ پانے ہزاروں کی تعداد میں روزانہ آتے ہیں۔ باہوؒ کسی کو بھی محروم نہیں لوٹاتے۔ سبھی آنکھوں میں مشعلیں روشن کر کے ہی واپس پلٹتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آپؒ کے فیوض کا چشمہ آپؒ کے وصال کے بعد بھی لوگوں کی پیاس بجھاتا رہا۔ لوگ فیض یاب ہوتے رہے۔ مثلاً ڈیرہ اسماعیل خان کے حاکم ہوت بلوچ کا واقعہ اس کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ کم عقل شخص ایک خوبصورت لڑکے پر فریفتہ ہو گیا اور اُس کے ساتھ شادی کا ارادہ کر بیٹھا۔ لوگوں کے لعن طعن سے بچنے کی خاطر اس نے مولویوں سے فتویٰ لینے کی ٹھانی۔ قرعہ فال نور محمد سوچی کے نام پڑا جو سلطان باہوؒ کے سلسلے سے تھے۔ اُس نے مولانا نور کو بلایا اور قتل کی دھمکی دے کر اپنے حق میں فتویٰ دینے کے لیے کہا لیکن وہ انتہائی بے خوفی سے کہنے لگے "ہوش میں آ بدبخت شخص۔ مرد کے لیے لڑکی سے بیاہ حلال ہے تُو لڑکے سے شادی رچانے چلا ہے، کیوں خود پر ظلم کرتا ہے۔ حرام کام سے باز آ"۔

ہوت بلوچ کو اس جواب کی اُمید نہ تھی وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا اور آپ کو گرفتار کرا کے جیل میں ڈال دیا۔ ساتھ ہی جتا دیا کہ سورج کی روشنی تبھی دیکھ سکو گے جب میرے حق میں فتویٰ دینے کے لیے خود کو آمادہ پاؤ۔ مولانا نور محمد نے اُسے تو کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ قید خانے پہنچ کر جہاں اللہ سے مدد مانگی وہاں پنجابی میں ایک نظم فریادی لہجے میں لکھ کر سلطان باہوؒ کی روح سے رجوع کیا اور اس کی فریاد رائیگاں نہ گئی۔ ہوت بلوچ شاہی فوجیوں کے ہاتھوں معزول ہو کر قید خانے میں ہی چل بسا اور [illegible] آزاد کر دیے گئے۔

پہلی تصویر

محمد سلیم اختر

گھر پہنچ کر میں نے کہا "ماں! میں نے تصویر بنائی ہے"۔ ماں نے کہا "کہاں ہے؟ لاؤ مجھے دکھاؤ"۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ تو بالکل خالی تھی۔ گھر پہنچنے اور دوسروں کو دکھانے کے جوش میں...... میں نے اسے کہیں راستے میں گرا دیا تھا۔ میرا رنگ اُڑ گیا۔

زندگی میں آپ نے کئی بار تصویر بنوائی ہوگی مگر کیا آپ کو سب سے پہلی تصویر یاد ہے؟

اُن دنوں میری عمر آٹھ سال ہوگی۔ میرا یہ معمول تھا کہ روزانہ جب میں سڑک پار کرتا تو ایک نظر فٹ پاتھ پر بیٹھے فوٹو گرافر پر ضرور ڈالتا۔ پھر میری نظر دیوار کے ساتھ رکھے اس کے کیمرے پر پڑتی۔ وہ خود [illegible] بیٹھا [illegible] کسی خیال [illegible] کسی سوچ میں گم۔ اس کے پاس بکس کیمرہ تھا جس کی تین ٹانگیں تھیں۔ بکس کے ایک طرف سوراخ تھا جس کے آگے شیشہ لگا ہوا تھا۔ وہ سوراخ ہمیشہ سیاہ رنگ کے گتے سے ڈھکا ہوتا۔ سوراخ کے دوسری طرف چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ بکس کے دوسری جانب سیاہ

کپڑا لٹکا ہوتا۔ کبھی کبھار میں دیکھتا کہ بوڑھا فوٹوگرافر کسی گاہک کی تصویر اُتارنے میں مصروف ہے۔ تصویر اُتروانے والا شخص دیوار کے ساتھ رکھے بنچ پر بیٹھتا جبکہ اس کی پشت پر سیاہ رنگ کا پردہ لٹکا ہوتا۔ بوڑھا فوٹوگرافر بکس کی کھڑکی میں سے اسے دیکھتا۔ سوراخ سے سیاہ گتے کا ڈھکن اُتارتا اور گاہک سے مخاطب ہو کر کہتا۔

"ٹھوڑی کو اوپر اُٹھایئے......ذرا سا نیچے......نہ نہ......ذرا اوپر......میرے ہاتھ کی طرف دیکھیے......ٹھیک اب بس یہیں رہیے"۔

میں یہ سب بڑی حیرت سے دیکھتا اور پھر خود سے سوال کرتا۔

"اس صندوق کے اندر کیا ہے؟" میں جس قدر بھی سوچتا مجھے اس سوال کا جواب نہ مل پاتا۔ پھر چند لمحوں بعد فوٹوگرافر صندوق میں سے ایک گیلا کاغذ نکالتا اور میں دیکھتا کہ اس پر گاہک کی شبیہہ بنی ہے تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

ایک روز میں فوٹوگرافر کے پاس گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم میری تصویر بنا دو گے؟"

وہ ہنسا اور بولا "کیوں نہیں؟"

میں نے پوچھا "کتنے پیسے ہوں گے؟"

"صرف پورٹریٹ چاہیے یا پوری تصویر؟"

"پوری تصویر" میں نے جواب دیا۔

"صرف ایک کاپی لو گے"

"ہاں صرف ایک کاپی"

"تو دس روپے ہوں گے"۔

میں نے اسی روز سے پیسے جمع کرنے شروع کر دیے۔ میں چاہتا تھا جلد از جلد دس روپے جمع کر لوں۔ رقم جمع ہو گئی۔ میں نے پیسے جیب میں ڈالے اور بوڑھے فوٹوگرافر کی طرف چل دیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولا "تو تم آ گئے؟"۔

میں نے رقم اس کی ہتھیلی پر رکھی اور کہا "پورے دس روپے ہیں گن لو"۔

اس نے رقم گنے بغیر جیب میں ڈالی اور مجھ سے کہا۔

"یہاں آؤ اور اس جگہ کھڑے ہو جاؤ"۔

میں سیاہ پردے کے آگے کھڑا ہو گیا۔ اس نے شیشے والے سوراخ سے ڈھکن اُتارا اور اپرچر میں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں سوراخ کی طرف دیکھتا رہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور میں بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کیے ہوئے تھا۔ میں نے خود سے کہا۔

"میری تصویر بن رہی ہے میری تصویر"

میں نے بوڑھے فوٹوگرافر کو کہتے سنا "بائیں جانب دیکھو......نہ نہ......ذرا سا دائیں جانب......ذرا اور......بس"۔

میں نے سوچا "کیسے بنے گی میری تصویر؟"

بوڑھے فوٹوگرافر نے کہا..........دونوں ٹانگیں ایک دوسرے کے ساتھ ملاؤ"۔

میری ہنسی چھوٹ گئی۔

فوٹوگرافر نے ڈپٹ کر کہا "مسکراؤ مت!"

میں نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا اور سوراخ کی طرف دیکھنا شروع کر دیا لیکن میرے لیے ہنسی پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔ اب اس نے نیا حکم سنایا "مسکراؤ مت"۔

ہنسی روکنے کی غرض سے میں نے لبوں کو اور سختی سے بھینچ لیا۔ فوٹوگرافر نے سوراخ سے ڈھکن اُتارا۔ اب شیشے سے ڈھکی کھڑکی نظر آنے لگی۔ اس نے سوراخ کو پھر سے ڈھانپ دیا اور کہا "بس"۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب مجھے تصویر دیکھنے کا اشتیاق تھا۔

آخر اس نے تصویر کاغذ پر کھینچی اور میرے حوالے کر دی۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے کاغذ کھولا اور بے اختیار میری ہنسی چھوٹ گئی۔ یہ میں

تھا۔ یہ میں ہی تو تھا۔ میرا کوٹ ٹوپی اور ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے جوتے۔ اپنے مقابل خود میں ہی تو کھڑا تھا۔ میری ٹوپی ذرا اوپر کو اٹھ گئی تھی اور میرا ماتھا اور بال نظر آرہے تھے۔ میں بالکل سیدھا کھڑا تھا کسی مجسمے کی طرح۔ میرے ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے جڑے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ میں بمشکل ہنسی پر قابو پائے ہوئے ہوں۔ میری آنکھوں میں حیرت بسی تھی۔ میرا کوٹ بہت لمبا تھا اور میرے جوتوں کے سرے بہت مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ اس کے باوجود مجھے اپنی تصویر بہت اچھی لگی۔

میں نے تصویر جیب میں رکھی اور ماں کو دکھانے کے لیے گھر کی طرف بھاگا۔ گھر پہنچ کر میں نے کہا "ماں! میں نے تصویر بنائی ہے"۔

ماں نے کہا "کہاں ہے؟ لاؤ مجھے دکھاؤ"۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ تو بالکل خالی تھی۔ گھر پہنچنے اور دوسروں کو دکھانے کے جوش میں ..... میں نے اسے کہیں راستے میں گرا دیا تھا۔ میرا رنگ اڑ گیا۔

ماں نے میرے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر پوچھا "کیا بات ہے؟"۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر میں گلی کی طرف بھاگا۔ میں نے تصویر کو گلی میں اور پھر سڑک پر تلاش کیا لیکن وہ مجھے نہ ملی۔ گھر لوٹ کر میں نے رونا شروع کر دیا۔ چچا نے میرے پاس آکر مجھے تسلی دینا شروع کی۔

"بس اب چپ ہو جاؤ چلو میں تمہیں نئی تصویر بنا دیتا ہوں"۔

ماں نے مجھے دھلے ہوئے کپڑے پہنائے اور بالوں میں کنگھی کی۔ چچا نے میرا بازو تھاما اور ہم تصویر بنانے چل ..... مجھے اس بار چچا فوٹو گرافر کے پاس نہ لے کر گئے۔ اس کے بجائے انہوں نے کہا "میں تمہیں فوٹو سٹوڈیو لیے چلتا ہوں"۔

وہ بہت خوبصورت سٹوڈیو تھا۔ وہاں میری تصویر اتاری گئی۔ پھر میں نے اپنی تصویر دیکھی۔ یقیناً یہ میں ہی تھا مگر اس سے میرے من کی بے کلی نہ گئی۔ اس میں کچھ بھی خاص بات نہ تھی۔ مجھے اپنی کھوئی ہوئی تصویر اور بھی شدت سے یاد آنے لگی۔

برسوں بعد میں نے ایک تصویر کھنچوائی۔ پھر ایک اور ..... پھر اور ..... اس طرح کتنی ہی تصویریں ..... لیکن مجھے ان میں سے کسی تصویر میں بھی وہ خوبصورتی نظر نہ آئی جو اس پہلی تصویر میں تھی۔

میں جب سکول کے آخری درجے میں تھا تو ایک روز میں نے ایک رسالے میں چھپی ایک تصویر دیکھی تو میں چونک اٹھا ..... وہ میری تصویر تھی۔ وہی تصویر جو برسوں قبل مجھ سے کھو گئی تھی ..... ایک چھوٹا سا بچہ ..... بہت لمبا کوٹ پہنے کسی فوجی کی طرح ایستادہ تھا۔ اس کی ٹوپی ذرا کو اوپر اٹھ گئی تھی اور اس میں اس کا ماتھا اور بال نظر آرہے تھے۔ اس کے جوتوں کے سرے بہت ہی مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ چہرے پر امڈتی ہنسی کو روکنے کی خاطر اس نے اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ رکھا تھا۔ اس کی چندھیائی ہوئی آنکھوں میں بے پناہ اشتیاق تھا ..... میں ماضی کے خوشگوار ایام اور یادوں میں پلٹ گیا ..... پھر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ تصویر کا کیپشن تھا۔

"اس ہفتے کی خوبصورت ترین اور شاہکار تصویر" اس سے بھی نیچے لکھا تھا ..... "مسرور دیہاتی لڑکا"۔

بے اختیار میرے ذہن میں سوال اٹھا۔ "کیا وہ بوڑھا فوٹو گرافر آج بھی زندہ ہوگا؟"۔

مجھے وہ بہت یاد آنے لگا تھا۔

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنھیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

پنیر کباب

اجزاء:

کوٹیج چیز	1 پیکٹ
بریڈ سلائس	6 عدد
بریڈ کرمبز	1 پیکٹ
میدہ	[illegible] کھانے کا چمچہ
چکن اسٹاک کیوب	[illegible] عدد
باریک کٹے بادام	15 عدد
کٹی کالی مرچ	1 چائے کا چمچہ
باریک کٹا لہسن	4 جوے
ادرک	½ کھانے کا چمچہ
باریک کٹی ہری پیاز	2 عدد
باریک کٹی ہری مرچ	4 عدد
باریک کٹا ہرا دھنیا	1 گٹھی
پھینٹے ہوئے انڈے	2 عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ڈیپ فرائنگ کے لے

ترکیب: پہلے 1 پیکٹ کوٹیج چیز کو کدو کش کرلیں۔ اب 6 عدد بریڈ سلائسز کے کنارے کاٹ کر بلینڈر میں ڈالیں اور باریک بریڈ کرمز بنالیں۔ پھر [illegible] چیز اور بریڈ [illegible] ملا [illegible] اس میں 1 کھانے کا

چمچہ میدہ' 1 عدد چکن سٹارک کیوب' 15 عدد باریک کٹے بادام' 1 چائے کا چمچہ کٹی کالی مرچ' 4 جوے باریک کٹا لہسن' 1/2 کھانے کا چمچہ ادرک' 2 عدد باریک کٹی ہری پیاز' 4 عدد باریک کٹی ہری مرچ' 1 گٹھی باریک کٹا ہرا دھنیا اور حسب ذائقہ نمک شامل کر دیں۔ اب اسے سیٹ ہونے کے لیے ایک طرف رکھ دیں۔

پھر اس کے چھوٹے گول کباب بنائیں اور 2 عدد پھینٹے ہوئے انڈوں میں ڈپ کر کے تیل میں ڈیپ کریں یا ہلکی آنچ پر شیلو فرائی کر لیں، یہاں تک کہ وہ گولڈن براؤن ہو جائیں۔ اس کے بعد انہیں کچن پیپر پر رکھ دیں تاکہ تیل جذب ہو جائے پھر ان پر 1 چٹکی لیمن چھڑکیں اور ٹومیٹو کیچپ کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

چیری کوکونٹ کیک

اجزاء:

مکھن	8 اونس
چینی	1-½ کپ
کٹی گلیز ڈ چیریز	½ کپ
انڈے	4 عدد
میدہ	3-½ کپ
بیکنگ پاؤڈر	1 کھانے کا چمچہ
اورنج جوس	½ کپ
پسا کھوپرا	½ کپ
لمبائی میں کٹا کھوپرا	4 کھانے کے چمچے

ترکیب: ایک پیالے میں 8 اونس مکھن اور 1-1/2 کپ چینی ڈال کر پھینٹ لیں، یہاں تک کہ وہ لائٹ اور فلفی ہو جائے۔ اب اس میں ایک ایک کر کے 4 عدد انڈوں کی زردی ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اب 1/2 کپ پسا کھوپرا اور 3-1/2 کپ میدہ اور 1 کھانے کا چمچہ بیکنگ پاؤڈر کو چھان لیں۔ پھر ایک ایک کر کے انہیں مکسچر میں 1/2 کپ اورنج جوس، 1/2 کپ چیریز اور تھوڑے سے میدے کے ساتھ شامل کر دیں۔ اب اسے کیک مکسچر میں ڈال کر مکس کریں۔ پھر 4 عدد انڈوں کی سفیدی کو اتنا پھینٹیں کہ وہ اچھی طرح مکس ہو جائے۔ اب اسے بیٹر میں فولڈ کر کے اچھی طرح مکس کر لیں۔ پھر ایک چیذٹ ٹین کو گریس کر کے اس میں مکسچر ڈال دیں۔ اب اس پر 4 کھانے کے چمچے لمبائی میں کٹا کھوپرا چھڑکیں اور ایک گھنٹے کے لیے 180c پر بیک کر لیں۔

کرسپی لیمن چکن ڈرم اسٹک

اجزاء:

چائنیز ڈرم اسٹکس	10 عدد
لیموں	3 عدد
انڈے کی سفیدی	3 عدد
کارن فلور	1/2 پیالی
چینی	1 چائے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
ادرک لہسن کا پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
[illegible]	1 کھانے کا چمچہ

سویا سوس	2 کھانے کا چمچ
سفید سرکہ	2 کھانے کا چمچ
تیل	حسب ضرورت
بریڈ کرمبز	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب: پہلے 10 عدد ڈرم اسٹکس دھولیں اور ان میں 2 کھانے کے چمچ سویا سوس، 2 کھانے کے چمچ سفید سرکہ، 1 کھانے کا چمچ ادرک لہسن کا پیسٹ اور حسب ذائقہ نمک ملا کر ایک دیگچی میں ڈالیں اور ہلکی آنچ پہ ان کا پانی خشک کرلیں۔

اب ایک پیالے میں 3 عدد انڈے کی سفیدی، 1/2 پیالی کارن فلور، 1 کھانے کا چمچ چکن کیوب والا میدہ، 1 چائے کا چمچ چینی، 3 عدد لیموں کا رس، 1 چائے کا چمچ بیکنگ پاؤڈر اور تھوڑا سا نمک ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔

پھر ایک ایک ڈرم اسٹک کو تیار کیے ہوئے آمیزے میں ڈبو کر حسب ضرورت بریڈ کرمبز لگا دیں۔ اس کے بعد ایک کڑاہی میں حسب ضرورت تیل گرم کر کے تیار ڈرم اسٹکس کو ڈیپ فرائی کر کے گولڈن براؤن کرلیں۔ آخر میں انہیں نکال کر ٹشو پر رکھیں، تاکہ تیل جذب ہو جائے پھر انہیں چلی سوس کے ساتھ سرو کریں۔

پائن ایپل اپ سائیڈ ڈاؤن پڈنگ

اجزاء:

انڈے کی زردی	3 عدد
چینی	3 اونس
پھینٹی ہوئی فریش کریم	8 اونس
جلیٹن پاؤڈر	3 چائے کے چمچ
پانی	1/4 کپ
دودھ	1 کپ
زردے کا رنگ	چند قطرے
پائن ایپل ایسنس	1/2 چائے کا چمچ
پائن ایپل سلائس	چند عدد
چیریز	6-8 عدد

ترکیب: پہلے 3 چائے کے چمچ جلیٹن

پاؤڈر کو 1/4 کپ پانی میں حل کرلیں۔ اب ایک ڈش میں 3 عدد انڈے کی زردی کو 3 اونس چینی اور 1 کپ دودھ کے ساتھ مکس کریں اور ہلکی آنچ پر پکائیں۔ ساتھ ہی اس میں چمچ ہلاتے رہیں۔ اس میں ابال نہ آنے پائے ورنہ یہ چولہے سے اتارلیں۔ اب اس

میں 1/2 چائے کا چمچ پائن ایپل ایسنس، چند قطرے زردے کا رنگ اور حل کی ہوئی جیلیٹن ڈال کر مکس کریں اور اسے ٹھنڈا کرلیں۔ پھر اسے 8 اونس پھینٹی ہوئی فریش کریم کے ساتھ فولڈ کرلیں۔ اب گلاس پائی ڈش کو گریس کریں۔ پھر چند پائن ایپل سلائسز کی شکل میں ہیں اور سائیڈ پر سجا دیں۔ اس کے بعد اوپر 8-6 چیریز سے کور کرلیں۔ اب مکسچر کو پائن ایپل سلائسز سے کور کرلیں۔ آخر میں اسے 2 گھنٹے کے لیے سیٹ ہونے رکھ دیں پھر اسے سرو کرنے سے پہلے پلٹ دیں۔

ویجی ٹیبل لزانیا

اجزاء:

کٹی گاجر	2 عدد
کٹے آلو	2 عدد
مٹر	1 کپ
باریک کٹے فرنچ بینز	1/2 کپ
باریک کٹی پیاز	2 عدد
باریک کٹے ٹماٹر	4 عدد
چکن کیوبز	1 عدد
اُبلے لزانیا نوڈلز	8 عدد
تیل	1/4 کپ
پسی لال مرچ	1 چائے کا چمچ
ہلدی	1/4 چائے کا چمچ
لہسن	1 چائے کا چمچ
نمک	1 چائے کا چمچ
شملہ مرچ سلائس	1 عدد
اوریگانو لیوز	1 چائے کا چمچ
کیچپ	1/4 کپ
کدوکش چیز	1/2 کپ

بگھار کے لیے:

ثابت لال مرچ	6 عدد
سفید زیرہ	1 چائے کا چمچ
رائی	1/2 چائے کا چمچ
کڑی پتے	20 عدد

چیز سوس کے اجزاء:

مکھن	2 اونس
میدہ	2 اونس
دودھ	2 کپ
پانی	1 کپ
نمک	3/4 چائے کا چمچ
کالی مرچ	1/2 چائے کا چمچ
مسٹرڈ	1/2 چائے کا چمچ
کدوکش چیڈر چیز	4 کھانے کے چمچ

ترکیب: اسمبل کرنے کے لیے ایک ڈش میں 8 اسٹرپس ابلے لزانیا نوڈلز، آدھی سبزیاں، آدھی شملہ مرچ سلائس، 1/4 کپ کیچپ، 1/2 چائے کا چمچ اوریگانو لیوز اور 1/2 کپ میں سے آدھی کدوکش چیڈر چیز پھیلا دیں۔ اب دوسری لیئر دے کر سوس، آدھی کدوکش چیڈر چیز، کیچپ اور 1 کھانے کا چمچ مکھن کے ساتھ 180c پر 20 منٹ کے لیے بیک کرلیں۔

غزل

محبت کے بدلے سزا دے گیا
عجب دوستی کا صلہ دے گیا
وفا میں نے مانگی جفا دے گیا
وہ جاتے ہوئے غم نیا دے گیا
تڑپنا سسکنا ہی اب رہ گیا
بچھڑتے ہوئے وہ دعا دے گیا
نجانے کنارے کہاں کھو گئے
سفینہ کہاں ناخدا دے گیا
اندھیروں کا ہے رقص چاروں طرف
چراغوں میں کیسی ہوا دے گیا
در میکدہ اور دانا ہیں ہم
وہ جینے کی کیسی ادا دے گیا

(قدیر رانا/راولپنڈی)

کچھ خواہشیں

کچھ خواہشیں بھی
کتنی ضدی اور منہ زور ہوتی ہیں
کہ کبھی قبر میں انہیں
جتنا گہرا بھی دفن کردو
ذرا سی لاپروا کر
کبھی نہ کبھی کسی صورت
ناگ پھنی کے پودوں کی
مانند خواہشوں کے صحرا میں
سر نکال ہی لیتی ہیں
نہ دیگر زاروں کی تپش
انہیں جھلساتی ہے
نہ ہی زنداں تنہائی جھلنے دیتے

خوف آتا ہے
نہ دریا کی بپھری ہوئی موجیں
ان کے اداروں کا خون کرتی ہیں
کچھ خواہشیں بھی کتنی..........!

(ڈاکٹر درخشاں انجم/کراچی)

غزل

وفا کو درد لکھنا درد کو آرام جاں لکھنا
ہمیں آ ہی گیا آخر محبت کی زباں لکھنا
زمین کوچہ جاناں کی قیمت کوئی کیا جانے
اگر لکھنا پڑے تو اس زمیں کو آسماں لکھنا
قلم تو وقف ہے ذکر بہاراں کے لیے ہمدم
میرا مسلک ہے ویرانہ کو رشک گلستاں لکھنا
اگر قربت کا اک لمحہ میسر آ نہیں سکتا
تو پھر لازم ہے ساری زندگی کو رائیگاں لکھنا
امتیاز لکھنے کی عادت ہو گئی ہے تم کو دنیا میں
بجائے اپنے غم کے تم حدیث دیگراں لکھنا

(ایس۔امتیاز احمد/کراچی)

غزل

دلوں کی دھڑکنوں کی سالوں کی باتیں
کریں آؤ خوابوں خیالوں کی باتیں
گلابوں کے موسم میں تتلی کے قصے
اندھیری راتوں میں اُجالوں کی باتیں
ارے چھوڑ دلبر یہ موقع نہیں ہے
مہکتی شبوں میں سوالوں کی باتیں
چلو جنوری کی ٹھٹھرتی رُتوں میں
کریں ان سلگتے وصالوں کی باتیں
[illegible] آ [illegible] نہیں [illegible] محبت

فقط آج ان خستہ حالوں کی باتیں
(یاسمین کنول/پسرور)

غزل

کھوج جیون کی تو سب ہی نے لگائی ہے
پر حقیقت کسی نے نہ اس کی پائی ہے
ہر شئے جو ہم کو دیتی اُس کی گواہی ہے
کرتی وہ رب کی بیاں شانِ خدائی ہے
کر جو نیکی کی وہ دریا میں بہائی ہے
اس عمل میں ہی تری انساں بھلائی ہے
سخت حالات میں چپ رہنا دانائی ہے
گردشِ وقت نے ہی یہ بات بتائی ہے
جانچنا خود میں برائی تو اچھائی ہے
ڈھونڈنا نیکی اوروں میں ہی دانائی ہے
چھپا اپنی ہی وفا کا خود تماشائی ہے
پر یہ تکبیر منکر سے بے وفائی ہے
جان لیوا سی عین یہ شام جدائی ہے
ایسے میں تم ہوا دستِ مسیحائی ہے
(عصمت اقبال عین)

غزل

سارا ماحول جگمگایا ہے
کیسے یہ ضوفشاں اُجالے ہیں
وہ خفا ہو کے بھی نہیں برہم
اس کے انداز ہی نرالے ہیں
دل میں اس کے ہزار شکوے ہیں
مصلحتاً زبان پہ تالے ہیں
وقت فرقت میں بھی مگر اس کی
آنکھ پرنم نہ لب پہ نالے ہیں
یہی درد جگر و درد دل
کل میری جان لینے والے ہیں
(زاہد یوسفی/لاہور)

غزل

بلبلوں کو خار زاروں سے الجھایا گیا ہے
ہواؤں کو چراغوں سے لڑایا گیا ہے
روشنی کے بہانے انگاروں پہ جلایا گیا ہے
خوشی کے بدلے دُکھ دے کر رُلایا گیا ہے
میرے دل کو نہیں تھا سقراط سے واسطہ
خود نہیں پیا اسے زہر پلایا گیا ہے
وہ خوش فہمیاں تو صرف جستجو سے جڑی تھیں
عبث مجھ کو شہر تمنا میں کیوں لایا گیا ہے
جہاں گائے تھے عبدلؔ بمدح آدم کے ترانے
آج وہیں مدحیٔ انساں کو اُچھالا گیا ہے
(عبدالباسط عبدلؔ)

غزل

مانا کہ زندگی میں ہمیں کچھ ملا بھی ہے
اس زندگی کو ہم نے بہت کچھ دیا بھی ہے
محسوس ہو رہا ہے کہ تنہا نہیں ہوں میں
شاید کہیں قریب کوئی دوسرا بھی ہے
قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستیں
اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے
یہ حسن اتفاق ہے یا حسن اہتمام
ہے جس جگہ فرات وہیں کربلا بھی ہے
ہم پھر بھی اپنے چہرے نہ دیکھیں تو کیا علاج
آنکھیں بھی ہیں چراغ بھی ہے آئینہ بھی ہے
اقبال شکر کیجیو کہ تم دیدہ ور نہیں
دیدہ وروں کو آج کوئی پوچھتا بھی ہے
(اقبال عظیم)

غزل

سر چھپا کے میرے دامن میں خزاؤں نے کہا
ہمیں ستانے دے گلشن میں بہار آئی ہے
جب بہار آئی تو صحرا کی طرف چل نکلا

صحن گل چھوڑ گیا دل میرا پاگل نکلا
جب اسے ڈھونڈنے نکلے تو نشاں تک نہ ملا
دل میں موجود رہا آنکھ سے اوجھل نکلا
اک ملاقات تھی جو دل کو سدا یاد رہی
ہم جسے عمر سمجھتے تھے وہ اک پل نکلا
وہ جو افسانہ غم سن کر ہنسا کرتے تھے
اتنا روئے کہ بس آنکھ کا کاجل نکلا
ہم سکوں ڈھونڈنے نکلے تھے پریشان رہے
شہر تو شہر ہے جنگل بھی نہ جنگل نکلا
کوئی ایوب پریشان ہے تاریکی میں
چاند افلاک پہ دل سینے میں بے کل نکلا
(ایوب روحانی)

غزل

دل وہی عہد ملاقات پرانا چاہے
اور زمانہ کہ پلٹ کر ہی نہ آنے چاہے
وہ تو ہر حال میں دوری ہی بڑھانا چاہے
اب کسی حد پہ ٹھہر جائے زمانہ چاہے
وہ عجب شخص ہے انداز عجب ہیں اس کے
کھنچ بھی جائے مراسم بھی بڑھانا چاہے
اس کے پندار کا کیا پوچھنا جو مست غرور
کم نگاہی کا بھی احسان جتانا چاہے
دیکھ کر اس کو زمانے کی طرف کیا دیکھیں
جو وہ چاہے وہی بے درد زمانہ چاہے
ہم وہ دل لائیں کہاں سے پلٹ کر جائیں
وہ یہاں شوق سے آئے اگر آنا چاہے
کبھی بے بات شکایت کبھی بے وجہ سکوت
وہ تو بس ترک محبت کا بہانہ چاہے
(اقبال صفی پوری)

غزل

کچھ اجنبی سے لوگ تھے کچھ اجنبی سے ہم
دنیا میں ہو نہ پائے تماشا کسی سے ہم

دیتے نہیں بجھائی جو دنیا کے خد و خال
آئے ہیں تیرگی میں مگر روشنی سے ہم
یاں تو ہر اک قدم پہ خلل ہے حواس کا
اے خضر باز آئے تری رہبری سے ہم
دیتے ہیں لوگ آج اسے شاعری کا نام
پڑھتے تھے لوح دل سے کچھ آشفتگی سے ہم
رہتی ہے انجم ایک زمانے سے گفتگو
کرتے ہیں یوں کلام بظاہر کسی سے ہم
(انجم روحانی)

غزل

غنچہ شوق لگا ہے کھلنے
پھر تجھے یاد کیا ہے دل نے
داستاں ہے لب عالم پہ
ہم تو چپ چاپ گئے تھے ملنے
میں نے چھپ کر تیری باتیں کی تھیں
جانے کب جان لیا محفل نے
انجمن انجمن آرائش ہے
آج ہر چاک لگا ہے سلنے
غنچہ شوق لگا ہے کھلنے
پھر تجھے یاد کیا ہے دل نے
(ایمان عرفانی)

غزل

محبت کی قیمت ادا کیا کریں گے
جو ہیں بے وفا وہ وفا کیا کریں گے
ضیاء دے سکے جو نہ اک جھونپڑے کو
جلا کے ہم ایسا دیا کیا کریں گے
جو نہ کر سکے خیر خواہی خود اپنی
کسی دوسرے کا بھلا کیا کریں گے
کھائے ہیں پھولوں کی الفت میں دھوکے
تو کانٹوں سے پھر [illegible] کریں گے

غنیمت ہے کہ موت آجائے صادق
کہ ہم جی کے ان کے سوا کیا کریں گے
(ایس ایم صادق)

غزل

تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی
یارب بجھے گی آگ یہ کیونکر لگی ہوئی
لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی
جائیں گے کس امید پہ ہم اس کے کوچہ میں
کافی ہے ہم کو پہلے ہی ٹھوکر لگی ہوئی
الفت کا جب مزہ ہو کہ دونوں ہوں بیقرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی
آصف ذرا سمجھ کے یہاں رکھیے مقام
منزل کہے روز دوسری سر پر لگی ہوئی
(آصف)

غزل

کیا بتائیں حال دل ان کی شناسائی کے بعد
حبس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے پروائی کے بعد
ایک مدت پر خیال ان کا کہاں سے آگیا
کتنی اچھی انجمن لگتی ہے تنہائی کے بعد
جب نظر آیا نہ ساحل ان کے چشم ناز میں
کیا دکھائی دے گا وہ دریا کی گہرائی کے بعد
در بدر کی ٹھوکریں کھائیں محبت میں تو کیا
ہو گئے ہم محترم کچھ اور رسوائی کے بعد
ہم کہاں ہوں گے نہ جانے اس تماشا گاہ میں
کس تماشائی سے پہلے کس تماشائی کے بعد
ان کے بارے میں فقط اتنا ہمیں معلوم ہے
اب وہ رہتے ہیں ہمارے دل کی انگنائی کے بعد
خوب ہے افسر [illegible] کی
کیا ہمارا نالۂ دل ان کی شہنائی کے بعد
(افسر ماہ پوری)

غزل

ہے عشق مسلسل تو رسوائی مسلسل
ہوتی نہیں اس کی پذیرائی مسلسل
ابدیت ازل سے ثبات چاہتی ہے
ہو ہی گئی نا پھر جدائی مسلسل
رسم وفا سے فرار چاہتا ہوں
تمنا ہے مل جائے رہائی مسلسل
مری پلکوں پہ سجے قوس قزح کے رنگ
حقیقت میں ہیں تری رسوائی مسلسل
ابھی یادوں سے لگا لیا ہے دل
بھی ہیں مری ساتھی تنہائی مسلسل
عجب ہی رشتہ سا جڑ گیا ہے
مری آہیں تری نارسائی مسلسل
لوگ کیا سمجھیں قضاو قدر کے معاملے
کر رہے ہیں یہ جگ ہنسائی مسلسل
صورت مجاز میں ہی بھٹکتا آ جا
دامن پھاڑتی ہے میری پارسائی مسلسل
(اویس غوری)

غزل

ہر ایک چہرے پہ دل کو گمان اس کا تھا
بسا نہ کوئی یہ خالی مکان اس کا تھا
میں اس طلسم سے باہر کہاں تلک جاتا
فضا کھلی تھی مگر آسمان اس کا تھا
پھر اس کے بعد کوئی بات بھی ضروری نہ تھی
میرے خلاف سہی وہ بیان اس کا تھا
ادا شناس فقیروں میں مصلحت کیسی
وہ جو بھی کہتا گیا ہم زبان اس کا تھا
تمام دکھ میری آنکھوں [illegible] لیکن
جو [illegible] سے ملا نشان اس کا تھا

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش
شرعی احکام
شائع ہو گیا ہے
عبادات سے معاملات تک اور معاشرت سے لیکر سیاسیات تک
تبلیغی نصاب قرآنی آیات اور صحیح احادیث کی روشنی میں
★ اسلامی ضابطہ حیات جس کی روشنی میں آپ اپنے شب و روز گزار سکتے ہیں۔
★ آخرت کا توشہ، دلوں کی بیماریوں کے لیے شفاء۔
★ نیکیوں کی طرف رہنمائی اور گناہوں سے بچنے کے طریقے۔
★ ایسے سنہری حروف جنہیں پڑھ کر آپ اپنے اخلاق و کردار کی کوتاہیوں کو دور کر سکتے ہیں۔
قیمت: 160 روپے
سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور فون 7245412

محبتوں کی کہانی میں کون شامل تھا
مجھے تو بارہا خود پر گمان اس کا تھا
ہوا نے اب کے جلائے چراغ رستے میں
کہ میری راہ میں عادل مکان اس کا تھا
(تاجدار عادل)

اس ماہ کا شاعر

سیارہ ڈائجسٹ پڑھنے والے تمام دوستوں کو میرا سلام، میرا نام ڈاکٹر شبیر احمد لون ہے۔ میں نے شاعری کی ابتداء 1999ء میں کی اور میری عمر 41 سال ہے میرے پسندیدہ شاعروں میں اقبال، غالب، فیض احمد فیض ہیں۔ میری پسندیدہ کتاب ویلی آف نیلم ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ ایک ادبی جریدہ ہے۔ شاعری میرا شوق ہے تازہ غزل حاضر خدمت ہے۔ امید ہے قارئین پسند فرمائیں گے۔

غزل

روشن رہے ظلمت میں چراغوں کی طرح ہم
جلتے رہے محفل میں پتنگوں کی طرح ہم
اک روز بھی ہم اپنے نشیمن میں نہ ٹھہرے
اڑتے رہے پیڑوں سے پرندوں کی طرح ہم
اس پار ہے اک صحرا تو اُس پار ہے دریا
بچھڑے ہیں سمندر کے کناروں کی طرح ہم
اے ابر بہاراں یہ غضب کیسا کیا ہے
شاخوں سے جدا ہوگئے پتوں کی طرح ہم
ہم گردش دوراں کو بدل دیں گے لہو سے
سر دار پہ رکھ دیں گے دلیروں کی طرح ہم
شامل رہی سانسوں میں تری یاد کی خوشبو
پت جھڑ میں بھی کھلتے رہے پھولوں کی طرح ہم
اے وادی کشمیر تو برسا دے وہ برف آب
جلتے ہیں پہاڑوں پہ چناروں کی طرح ہم
شاکر وہ ہمیں پاس ہی کے کیا دیر سے آکر
اڑ جائیں گے تصویر کے رنگوں کی طرح ہم
(ڈاکٹر شاکر کاشمیری)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی تصویر منسلک کریں

نام: .... تعلیمی قابلیت: ....
عمر: .... پسندیدہ شاعر: ....
پسندیدہ غزل/نظم: ....
مشاغل: .... تاریخ پیدائش/برج: ....
شادی شدہ/غیر شادی شدہ: .... پتہ: ....
ای میل: ....

داغ داغ مسیحا

صغیرہ بانو شیریں

عید آئی، روحینہ کے اصرار پر خور نے کپڑے بھی بدلے، زیور پہنے، مگر شوکت میاں ذور ذور سے دیکھتے رہے، قریب آ کر عیدی دینی تو در کنار اسے دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ خور کے سینے پر رکھی دُکھوں کی سل میں اور اضافہ ہوگیا۔

ایک عورت کی کتھا، والدین کی ذرا سی بھول نے اُس کی زندگی داغ دار کر دی تھی

بڑے دالان میں فرشی دری بچھی ہوئی تھی۔ چاروں طرف ریشمی گاؤ تکیے پڑے تھے۔ جو عورت آتی وہ ایک گاؤ تکیہ اٹھا کر اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی۔ دودھ اور مصری کے شربت میں پستے کی ہوائیاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ ایک ماما آگے بڑھتی اور جھٹ سے شربت کا بلوری گلاس سلیقہ سے پیش کر دیتی۔ مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ سب بیبیوں نے دوپٹہ سے سر ڈھانک لیے۔ اتنے میں ایک خاتون جو 25 برس کی ہوگی۔ پٹاپٹی کا غرارہ پہنے سرخ ٹیشو کا دوپٹہ اوڑھے کمرے میں آئیں۔ کندن کا زیور ان کے ملیح و صبیح

چہرے پر پوری آب و تاب سے سج رہا تھا۔

سب عورتیں کھڑی ہو گئیں اور وہ بیچ میں آ کر بیٹھ گئیں۔ ماماؤں نے سرخ ٹول کے ڈھکے ہوئے پوشوں سے خوان لا کر رکھنے شروع کیے اور ایک بزرگ خاتون آگے بڑھیں اور بسم اللہ کہہ کر بیٹھ گئیں یہ ان کی ساس تھیں۔

بہو کا نام روحینہ تھا۔

وہ کچھ دیر بیٹھی پڑھتی رہیں پھر بہو کا ہاتھ اٹھا کر خوان کی طرف دیکھا۔ روحینہ نے بسم اللہ کہہ کر اندر ہاتھ ڈالا اور آہستہ سے ایک بیٹی نکال لی۔ سارے ہال میں شور مچ گیا۔

بیٹی مبارک..... بیٹی مبارک!

روحینہ کی ساس نے سات سہاگنوں سے گود بھرائی اور ایک ماما چھوٹی سی کشتی لیے آگے بڑھی اور روحینہ نے مسکراتے ہوئے خوان کے نیچے سے چھری نکال لی۔ سامنے ہی نواب میاں کھڑے تھے۔ کسرتی خوبصورت جسم پر کمخواب کی شیروانی سج رہی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر بیگم کو دیکھا اور بولے۔

"بیگم اب کے اللہ قسم بیٹی ہوئی تو ہم آپ کو ست لڑی ہار اپنے ہاتھ سے پہنائیں گے"۔

روحینہ جواب میں مسکرا دیں۔ وہ پہلے بھی دو پھول جیسے بچوں کی ماں تھیں، مگر چہرے مہرے سے اب تک لڑکی معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی بڑی کٹار جیسی آنکھیں، ستواں ناک، رنگ ایسا کہ میدہ و شہاب کو شرمائے۔ ہونٹ یاقوت کی طرح ترشے ہوئے تھے۔ پوری محفل میں چاند کی طرح چمک رہی تھیں۔

تیسرے بچے کی آمد آمد تھی۔ ساتواں مہینہ لگ چکا تھا۔ اس دن گود بھرائی کی رسم تھی۔ جس میں سارے کنبے کی عورتیں جمع تھیں۔ روحینہ کے سامنے باری باری پھل، خشک میوے رکھے گئے اور وہ مسکرا کر رسم پوری کرتی رہیں۔

سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے جدا ہونا ان کو ناپسند تھا۔ اس رسم کو بھی کھڑے دیکھتے رہے۔ مغرب کے وقت روحینہ اٹھیں۔ اب ان کو اپنے میکے جانا تھا اور اس کے بعد پھر گھر آ کر آرام کرنا تھا۔

پہلے عورتیں کہتی تھیں ساتویں مہینہ بچہ پیٹ میں پاؤں پھیرتا ہے اس لیے عورت کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ میکے جانا بھی اسی رسم کی ایک کڑی تھی۔ اس رسم کو پاؤں پھیرنا کہتے تھے۔ سب کو پتہ لگ جاتا۔ ان کا مہینہ لگ گیا ہے اور خیر سے ہونے والی زچہ پاؤں پھیر آئی ہے۔

نواب میاں کے ساتھ گاڑی میں روحینہ بیٹھی، چہرے سے تھکی ماندی لگ رہی تھی۔ نواب میاں نے آہستہ سے چھیڑا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ بہت تھک گئی ہیں۔ آخر بیٹی کی تیاری ہے کوئی مذاق نہیں" روحینہ دھیرے سے مسکرا دی۔

نواب میاں آہستہ سے جھک کر بولے۔

"میرے دوست کہتے تھے کہ ایک دو بچے ہو جائیں تو عورت کی جوانی ڈھلنے لگتی ہے مگر بیگم اللہ قسم تم تو اسی طرح تر و تازہ ہو، تمہارے عارض پہلے سے بھی زیادہ دہکتے ہیں۔ گود بھرائی کی رسم کے وقت میں سوچ رہا تھا آج سے پانچ سال پہلے بھی تم ایسی ہی لگتی تھیں ٹیشو کے دوپٹہ میں چھپا اور کرن کے ہالے میں تمہارا چہرہ شمع کی طرح روشن تھا۔ ہم بہت ہی خوش نصیب ہیں کہ ہم کو تمہارے جیسی ماہ وش ملی ہے۔ خدا کرے ایک بیٹی ہو تو تمہاری طرح سندر ہو"۔

روحینہ دھیرے سے بولی: "آپ کی طرح نہیں؟ آپ کیا کم ہیں"۔

نواب میاں کھل کھلا کر ہنس دیے "نہیں میرے جیسی نہیں بس تمہارے جیسی ہونی چاہیے۔ میں تمہارا بچپن دیکھنا چاہتا ہوں"۔

اسی مل چل میں [illegible] نواب میاں روحینہ [illegible] بچے [illegible] آ گیا اور روحینہ کا میکہ۔

آ گیا جہاں اور بھی زیادہ ہجوم تھا۔ روحینہ دو چار دن کے بعد پاؤں پھیر کے واپس آ گئیں اور حویلی میں نواب میاں کی بانہوں کے حصار میں آنے والے دلوں کا حساب کرنے لگیں۔

خدا خدا کر کے نواں ماہ ختم ہوا اور خدا نے ایک چاند سی بیٹی نواب میاں کو عطا کی۔ نواب میاں بہت خوش تھے۔ حویلی کے دروازے پر نوبت رکھی گئی۔ مراثنیں مبارک بادیاں گا رہی تھیں اور روحینہ کا ہاتھ لگوا لگوا کے صدقے کے تھال باہر بھیجے جا رہے تھے۔

بچی کا رنگ ماں باپ کی طرح تھا۔ نین نقش سبک تھے۔ گڑیا سی معلوم ہوتی تھی نواب میاں نے جب بچی کو گود میں لیا تو دیکھتے ہی بولے:۔

"ماشاء اللہ نور ہے، بس بیگم اس کا نام نور بانو رکھ دو"۔

ساتویں روز عقیقہ ہوا، پورے شہر سے مہمان آئے، شادی کا سماں لگتا تھا، روحینہ چھٹی نہا چکی تھیں اور سرخ کمخواب کے غرارے میں آج پھر دلہن لگ رہی تھی۔ زچہ خانہ کی کمزوری سے چہرے پر اور بھی نکھار آ گیا تھا۔

شہر سے سول سرجن اور ان کی بیگم بھی جو لیڈی ڈاکٹر تھیں آ گئیں۔ بچی کو دیکھا روپے دیے اور کہنے لگیں "بیگم صاحبہ! آج کل موسم خراب ہے بچی کو چیچک کا ٹیکہ ضرور لگوا لیں۔ دو چار دن کی تکلیف ہے پھر بچی محفوظ ہو جائے گی"۔

نواب میاں مسکراتے ہوئے بولے:۔

"ہمارے حکیم صاحب کہتے ہیں بچی کی ناف میں سچے موتی پیدائش کے وقت باندھ کر گرہ دی جائے تو پھر یہ کمبخت بیماری نہیں ہوتی۔ ہماری بچی تو بہت نازک ہے۔ اصل میں بیگم صاحبہ پر گئی ہے۔ ویسی ہی نخریلی نظر آتی ہیں صاحبزادی۔ لیڈی ڈاکٹر نے ایک بار پھر کوشش کی اور ٹیکے کے فوائد گنانے لگیں۔ نواب صاحب نے پھر ان [illegible] کر [illegible] بات ٹال دی۔

روحینہ ایک سسکی بھر کے بولیں:۔

"توبہ توبہ! بڑی تکلیف ہوتی ہے چاقو گرم کر کے دوا لگاتے ہیں کم بخت بازو پر گہرے سیاہ داغ پڑتے ہیں۔ میری بچی ایسی اذیت نہیں برداشت کر سکتی تمام عمر کے لیے بازو پر داغ پڑ جاتے ہیں"۔

لیڈی ڈاکٹر اپنا فرض پورا کر چکی تھی خاموش ہو گئی۔

☆..............☆..............☆

یہ آج سے کئی دہائیاں پہلے کا ذکر ہے جو بوڑھی انا آہستہ آہستہ دم لے لے کر سنا رہی تھیں۔ میں بڑے غور سے ایک ایک بات سن رہی تھی۔ انا کے چہرے پر زمانے کے حوادث نے بے پناہ سلوٹیں ڈال دی تھیں۔ مگر روحینہ کا نام لیتے ہی ان کا چہرہ چمک اٹھتا تھا اور میں ان کے چہرہ کی عمارت میں دفن ہوئے وقت کو کھنگال کر ان کو نئے روپ میں دیکھتی تھی۔

☆..............☆..............☆

دبے پاؤں گزرتے لمحے دیکھتے ہی دیکھتے دلوں کا روپ سادھ رہے تھے پھر یہ دن بھی چپکے چپکے بیتے اور سالوں میں تبدیل ہو گئے۔

نور بانو اب چھ برس کی ہو چکی تھی۔ بڑی دھوم دھام سے بسم اللہ ہوئی اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نواب میاں نئے زمانے کے تھے بڑی خوشی سے کہتے میں اپنی نور کو خوب تعلیم دلاؤں گا اور اسے ایک مثالی خاتون بناؤں گا۔ نور انتہائی ذہین تھی اردو عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی ایک میم صاحبہ پڑھانے آتی تھیں اور وہ ہر مضمون کو بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔

ایسے میں ہندو مسلم فسادات ہوئے' پاکستان بنا۔ نواب صاحب نے رخت سفر باندھا اور سارے گھر کو لے کر لاہور آ گئے۔ ایک بڑی سی کوٹھی مل گئی۔ ہندوستان میں وہ جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے کارندے چھوڑ آئے تھے۔

[illegible] اتفاق [illegible] ایک دن نور کو بخار چڑھا۔

ڈاکٹر کو بلایا گیا پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی مگر مقدر میں جو لکھا تھا وہ اٹل تھا۔ تیسرے روز جسم پر دانے نکل آئے چیچک جیسے موذی مرض نے حملہ کر دیا تھا۔

روحینہ سارے کام بھول چکی تھی۔ قرآن پاک کے لیے سرہانے بیٹھی دعا کرتی تھی اور نواب صاحب روز ایک بکرا صدقہ دے رہے تھے۔ خیرات دی جا رہی تھی۔ مرض کا حملہ کم ہوا اور دانے سوکھنے لگے تو نواب صاحب نے دیکھا بچی کے خوبصورت رخساروں میں گڑھے پڑ رہے ہیں۔ شکر ہے کہ آنکھوں پر کوئی اثر نہ تھا ورنہ اس مرض میں آنکھ خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

حور بانو نے غسل صحت کیا تو باوجود ضبط کے روحینہ اپنے آنسو نہ روک سکیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ حور بانو کا چہرہ بگڑ چکا تھا۔ چیچک کے گہرے گہرے سیاہ داغ چہرے پر پڑے تھے۔ نواب صاحب نے پلاسٹک سرجری کے لیے لندن خط لکھے اور بچی کو لے جانے کا پروگرام بنانے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ پلاسٹک سرجری سے بچی کا کھویا ہوا حُسن واپس آ جائے گا۔

حور بانو نے محسوس تو بہت کیا مگر اب وہ سکول میں داخل ہو چکی تھی اور انتہائی محنت سے پڑھ رہی تھی۔ دوسرے بچپن تھا، بدصورتی کا احساس نہ ہوا۔ ابھی نواب صاحب باہر جانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ان کو دل کا دورہ پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے روحینہ کا سہاگ اُجڑ گیا۔

روحینہ نواب صاحب کی لاش کے سرہانے بیٹھی تھی۔ لرزتے ہاتھوں سے ان کی بلائیں لے رہی تھی۔ نواب صاحب کے چہرے پر تقدس کا نور جھلک رہا تھا۔ سفید کفن میں لپٹے، بیلی چمبیلی کی کلیوں کے ہالے میں ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں موندے جیسے اطمینان سے سو رہے تھے۔ روحینہ کبھی ان کے ہاتھوں کو دیکھتی کبھی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیتی، کیسا گبھرو بانکا جوان لیٹا تھا۔

انہیں اپنے شوہر کا والہانہ پیار یاد آ رہا تھا مگر آج ان کا چاہنے والا ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں آج کے بعد وہ پھر انہیں دیکھ نہ سکیں گی آنکھیں پھاڑے ایک ایک لمحہ کو ٹھہرائے وہ نواب میاں کی صورت دل پر نقش کر رہی تھیں۔

پائنتی بیٹھی حور بانو رو رہی تھی مگر آج اس کو دلاسا دینے والا کوئی نہ تھا۔ چاہنے والا باپ روٹھ چکا تھا جو کبھی اس کی آنکھ میں آنسو بھی دیکھنے کا متحمل نہ ہوتا تھا آج آنسوؤں کی یہ بوچھاڑ بھی اسے جگا نہ سکی تھی۔

آہ و فغاں کے شور میں نواب میاں کا جنازہ اُٹھا۔ روحینہ کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ مگر بچوں کی خاطر زندہ رہنے پر مجبور تھیں۔ نواب میاں تو ان کے دل میں بسے تھے۔ چلتے پھرتے انجانے میں وہ نواب صاحب سے باتیں کرتی رہتیں اور رات کو تو ان کو ایسا محسوس ہوتا کہ نواب میاں ان کے پاس لیٹے ہیں۔ جلدی سے وہ آنکھیں کھولتیں تو نواب میاں کی قد آدم تصویر مسکرا رہی ہوتی۔ وہ پھر اپنی آنکھوں کو موند لیتیں اور انجانے راستوں میں نواب میاں کا ہاتھ پکڑ کے چل دیتیں۔ اسی آنکھ مچولی میں تمام شب بیت جاتی۔

گزرتے لمحوں کا خمار لیے اٹھتیں اور زندگی کے کاموں میں مصروف ہو جاتیں۔ دن تو کسی نہ کسی طرح ٹکڑے کر کے بیت ہی جاتا۔ ہاں رات نواب میاں کی ہوتی جو وہ ان کی معیت میں خیالوں کے سہارے گزارتیں۔

حور اب میٹرک کر چکی تھی۔ ایف اے میں داخلہ لیا تھا۔ اس کا ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا پڑھائی کی وجہ سے اس نے بیرون ملک جانے کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی وہ اب سنجیدہ تھی۔ علم کے نور نے اسے جلا بخشی تھی۔ وہ سیرت کے سہارے زندہ رہنا چاہتی تھی اور اس کا کوئی مقصد نہیں تھا۔

[illegible] دیر [illegible] ہے [illegible] اب نمایاں

کامیابی حاصل کر چکی تھی۔ اب وہ ڈاکٹر تھی۔ وہ انسانیت کی محسن بننا چاہتی تھی دشمن نہیں۔

اس کے ارادے بلند تھے۔ پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ ماں نے نواب میاں کی یاد میں ایک چھوٹا سا ہسپتال بنا دیا تھا۔ اب وہ اسی ہسپتال میں کام کرتی تھی۔ شام کو تھکی ہاری آتی تو اپنے گھر میں بنایا ہوا کلینک کھول لیتی۔ قرب و جوار سے عورتیں اور بچے آ جاتے اور وہ سب کو غور سے دیکھتی، علاج کرتی۔ خدا نے اس کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ ہر مریض نور کو دعائیں دیتا جاتا تھا۔

روحینہ کو اب بس ایک ہی دھن تھی کسی طرح نور کی شادی کر دیں۔ انہوں نے اور بچوں کے رشتے ڈھونڈ لیے تھے اور اب نور کے لیے پریشان تھیں۔ انہوں نے کئی عورتوں سے کہہ رکھا تھا وہ بیٹے اور بیٹی کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتی تھیں۔

کتنے ہی رشتے آئے مگر جب عورتیں آتیں تو نور اپنے آپ کو مجبور تصور کرتی۔ اسے قصائی جیسی آنکھوں سے دیکھا اور ٹٹولا جاتا تھا۔ نور کا جسم متناسب اور دل کش تھا رنگ گورا تھا مگر چیچک کے نشانات پورے جسم پر چھائے ہوئے تھے جس کی وجہ سے خوبصورتی ماند پڑ چکی تھی۔

عورتیں آتیں طرح طرح کی بولیاں بولتیں اور چلی جاتیں۔ اس کی قیمت لگ رہی تھی مگر کوئی خریدار نہیں تھا۔ ایسے میں بھائی کا رشتہ ایک اچھی طرح طے پا گیا اور دھوم دھام سے بھائی کی شادی ہو گئی۔

بھابی بہت خوبصورت تھی، دلہناپے کے روپ نے چار چاند لگا دیے تھے۔ نور دیکھتی کہ بھابی کے چہرے پر بھائی کو دیکھتے ہی قوس و قزح کے رنگ گڈمڈ ہو جاتے۔ بھائی کا والہانہ انداز اور بیخودی کا اظہار بھابی کو مسرور کر دیتا۔ نور دل میں سوچتی عورت کا یہ کیسا روپ ہے جو دلہناپے میں اور بھی زیادہ دمک اٹھتا ہے۔ [illegible] جسم کو کہیں

نمایاں کر دیتی ہے۔ اب اس کے دل میں بھی طرح طرح کے خیالات آتے۔

نور سوچتی شاید یہ رشتہ خدا تعالیٰ نے محبت کے لیے بنایا ہے مگر جب اپنے چہرے پر نظر ڈالتی تو دل مسوس کر رہ جاتی۔ اس کے ساتھ کیسا بھیانک مذاق تقدیر نے کیا۔ نور کا جسم انتہائی دلکش اور متناسب تھا رنگ بے انتہا صاف مگر چہرہ..... بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں بھی اپنی ساری رعنائی سمیت چیچک کے داغوں کا مداوا نہ تھیں۔

نور کو بہترین تراش کے لباس پہننے کا بڑا شوق تھا۔ بھائی بھابی کو نئی دنیا میں مگن دیکھ کر اس کا بھی دل چاہتا کوئی اس کے لباس کی تعریف کرے مگر سوائے ماں کے شاید اس دنیا میں کوئی چاہنے والا نہ تھا۔ جب ماں نور کی تعریف کرتی تو نور کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ وہ سوچتی ماں نے مجھے جنم دیا ہے۔ اس لیے تعریف کر کے میرا دل رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ورنہ اتنے لوگوں سے دن بھر میں سابقہ پڑتا ہے کوئی بھی تو ایک لفظ نہیں کہتا۔

وہ دل میں سوچتی کاش میں پیدا نہ ہوتی۔ آہستہ آہستہ اب اس میں احساس کمتری پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ ایسے میں شاید ماں کی دعا قبول ہوئی۔ نواب میاں کے ایک عزیز دوست ہندوستان سے آئے، ان کو نواب میاں سے بہت پیار تھا۔ انہوں نے جب نور کو دیکھا کہ وہ ڈاکٹر بن چکی ہے اور بڑے اچھے طریقے سے کلینک چلا رہی ہے تو ایک دم ہی سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھی۔ ان کا بڑا بیٹا ساتھ تھا، میٹرک تک پڑھ کے اس نے گویا تعلیم پوری کر لی تھی۔ ویسے بھی طبیعت کا درشت تھا۔

گھر میں اور سارے رشتہ داروں کو اس کی عادت کا علم تھا یہی وجہ تھی باوجود کوشش کے کہیں شادی نہیں ہوئی تھی۔ نواب میاں کے دوست نے ایک ہفتہ کی سوچ بچار کے بعد بیٹے سے [illegible] مشورہ کر کے [illegible] سے نور کے رشتے کے لیے بات کی۔

"وہ خود تو ہندوستان چلے جائیں گے بیٹا یہیں رہے گا"۔

روحینہ کے لیے یہ رشتہ پہلا پتھر بن گیا یا نور تو ایسی بیری کا درخت تھی جس کے سائے میں لوگ جوق در جوق آتے اور چلے جاتے، ٹھہرنے کی خواہش کسی نے نہ کی تھی۔ روحینہ نے تو فوراً اندر جا کر نواب صاحب کی دراز کھولی اور اس میں سے سرخ یاقوت کی انگوٹھی لا کر شوکت میاں کے ہاتھ میں پہنا دی۔ مٹھائی آئی اور بات پکی ہو گئی۔ روحینہ بیگم نے ہسپتال کے پاس والی کوٹھی کو ساز و سامان سے سجانا شروع کیا اور وہ کوٹھی نور کے جہیز میں دے دی۔ شوکت میاں دھوم دھام کے قائل نہ تھے۔ لہٰذا سادگی سے رسم ادا کی گئی۔ نور دلہن بنی اپنے ہی باپ کے گھر میں آ گئی۔ شوکت میاں کو انھوں نے دیکھا لمبے تڑنگے جوان تھے۔ چہرے پر دبدبہ تھا۔ انھوں نے ایک نظر نور پر ڈالی اور بڑے اطمینان سے پاؤں پسار کر بیٹھ گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کس طرح نور کو پوری طرح اپنے قابو میں کریں۔ نور تو ان کے لیے ایک چیک تھی جسے وہ ہر وقت کیش کرا سکتے تھے۔

نور کے سارے خواب دھرے رہ گئے۔ سہاگ رات گزری مگر عجیب سی کسک اور دُکھ کے ساتھ، شوکت میاں نجانے کیسے آدمی تھے۔ صبح اٹھ کر نور نے سوچا میری صورت نہ سہی میں اپنی خدمت سے شوکت میاں کو اپنا لوں گی۔

وہ طرح طرح کے لذیذ کھانے پکاتی۔ شوکت میاں کے تعیش کرتے کا ذوق ان کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتی مگر شوکت میاں تو چکنی مچھلی کی طرح ہاتھ میں ہی نہیں آتے تھے۔ کتنے ہی ماہ گزر گئے۔ شوکت میاں بیکار کوٹھی میں گھومتے رہتے۔ باہر جانا ہوتا تو وہ بڑے اطمینان سے نور کا پرس کھولتے اور روپے نکال لیتے۔

ایسے میں پہلی عید آئی۔ روحینہ نے نور کے ... داماد کے کپڑے بھیجے۔ نو... دفعہ ... منہ سے ک...

"میری خواہش تھی کہ پہلی عید کا جوڑا آپ کی کمائی کا پہنتی، خواہ وہ معمولی کپڑے کا ہوتا"۔

شوکت میاں نے تیزی سے کہا:۔

"کاش تم اس قابل ہوتیں، میں تو ابا میاں کے کہنے پر تم جیسی چڑیل کے چکر میں پھنس گیا۔ ہاں تم کہو تو آدھ سیر قیمہ لا دیتا ہوں تمہارے چہرے کے کم از کم گڑھے تو بھر جائیں گے"۔

نور یہ سن کر رو پڑی مگر شوکت میاں تو ایک چٹان کی مانند تھے۔ لاکھ سر پٹخو، ٹکراؤ اور پھر واپس لوٹ کر رونا مقدر بن چکا تھا۔ عید آئی، روحینہ کے اصرار پر نور نے کپڑے بھی بدلے، زیور پہنے، مگر شوکت میاں دُور دُور سے دیکھتے رہے، قریب آ کر عیدی دینی تو در کنار اسے دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ نور کے سینے پر رکھی دُکھوں کی سل میں اور اضافہ ہو گیا۔ رات ہوئی تو انھوں نے بڈھے نوکر کو باہر بھیجا کہ شوکت میاں کو بلا لائے۔ شوکت نے کہلایا، کپڑے بدل کر سو جاؤ مجھے ان کپڑوں میں تم انتہائی بُری معلوم ہو رہی ہو۔ قیمتی کپڑے کا بھی مذاق اڑایا ہے۔

نور سُن کر رو پڑی، کپڑے اُتار پھینکے اور گھر کے سادے کپڑے پہن لیے تب شوکت میاں اندر آئے۔

نور کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، روتے ہوئے بولی:۔

"آپ کو مجھ سے اتنی نفرت ہے تو مجھے طلاق دے دیں"۔

"طلاق کیسے دے سکتا ہوں، ابا میاں کی دوستی کا سوال ہے"۔

"پھر آپ مجھے خرچہ دیں"۔

"کیسا خرچہ؟ تمام دن یاروں میں گزرتی ہو ان سے پوری نہیں پڑتی" شوکت میاں دھاڑے۔

نور کانپ اٹھی:۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہاں میرے ساتھ لیڈی ڈاکٹر ہوتی ہے ... کیس ... تے ہیں، مردوں سے میرا کیا تعلق ... آپ مجھ پر خواہ مخواہ الزام

لگا رہے ہیں......"۔

"میں تم جیسی عورتوں کو خوب جانتا ہوں ، اوپر سے پارسائی کا ڈھونگ رچا رکھا ہے اور اندر ہی اندر جو دل میں آتا ہے وہ کرتی ہیں"۔

"میں ایسی ہوتی تو آپ کی پسند کا مرکز بن گئی ہوتی؟ جب شوہر ہی پیار نہ کرے، تو بیوی کہاں جائے؟ میں سارے کام چھوڑ دیتی ہوں گھر میں رہوں گی ،آپ مجھے خرچہ دیں میں دال روٹی میں خوش رہوں گی"۔

شوکت میاں نے کہا:۔

"گھر میں بیٹھو گی، تو کھاؤ گی کہاں سے؟ ماں نے کوٹھی دیدی ہے تو دماغ ٹھکانے نہیں، صورت ہوتی تو نامعلوم کہاں جاتیں، کان کھول کر سن لو، تم کام کرو گی کام، اور میں تمہارے پیسے سے موج کروں گا ، جو دل میں آئے گی وہ تمنا پوری کروں گا"۔

حور خاموش ہو کر لیٹ گئی۔ اس نے سوچ لیا کہ یہ شخص ہر طریقے سے تنگ کرے گا۔ اس دن سے حور نے قیمتی کپڑے تہہ کر کے بڑے بکس میں رکھ دیئے اور سادے کپڑوں میں پھرنے لگی، ملنے جلنے والوں نے ٹوکا تو بات ٹال گئی۔

ایسے میں اسے محسوس ہوا کہ اس کی صحت گرتی جارہی ہے اور وہ ماں بننے والی ہے۔ روحینہ نے چیک اپ کرایا تو معلوم ہوا کہ بچہ انتہائی کمزور ہے۔ بچہ کی پیدائش تک حور کو بستر پر لیٹنا ہوگا اور غذا دوا باقاعدگی سے کھانی پڑے گی۔

روحینہ حور کو اپنے گھر لے آئیں۔ دنیا جہاں کے پکوان بناتیں، پھلوں کا ڈھیر منگاتیں مگر حور کے سینے میں جو غم کی بھٹی جل رہی تھی وہ اسے آہستہ آہستہ جلا رہی تھی۔ شوکت میاں دنیا دکھاوے کو روز آتے مگر منہ پھیر کر بیٹھ جاتے ، ساس سے بات چیت کر کے چلے جاتے۔ روحینہ مزاج شناس تھی، حور سے پوچھتیں مگر وہ خاموش رہتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ماں اس کی وجہ سے پریشان ہو۔

خدا خدا کر کے ولادت کا وقت آیا مگر ڈاکٹر انتہائی کوشش کے باوجود بچے کو نہ بچا سکے، حور خاموش تھی، نامعلوم اور کتنے ستم تھے جو ابھی اسے سہنے تھے۔ ہسپتال سے سیدھی اپنے گھر آئی۔ جہاں شوکت میاں تمام تر طعن و تشنیع سمیت اس کا استقبال کرنے کو موجود تھے۔

خدا نے دوبارہ ماں بننے کا موقع دیا مگر افسوس کہ بچہ بچ نہ سکا۔ حور دل برداشتہ ہو گئی۔ ویسے بھی شوکت میاں نے اسے کسی قابل نہ چھوڑا تھا۔ دونوں ایک کمرے میں ایک بستر پر سوتے مگر جو خلیج حائل تھی حور جانتی تھی۔

شوکت جونک کی طرح اس کی جان سے چمٹ چکا تھا۔ ساری کمائی ہتھیا کر تمام دن باہر پھرتا۔ کاروبار کے بہانے بے شمار روپے لے کر دوستوں میں اڑا چکا تھا۔ تمام دن کی آوارہ گردی کے بعد رات گئے گھر آتا، کھانا کھاتا اور دو چار جلی کٹی سنا کر سونا اس کا معمول تھا۔

گھر کی قیمتی چیزیں دوستوں کو تحفے میں دے چکا تھا۔ اچھے سے اچھا لباس پہنتا اور بڑے ٹھاٹھ سے زندگی گزار رہا تھا۔

حور نے چاہا کہ پلاسٹک سرجری کے لیے باہر چلی جائے اس نے پاسپورٹ بنوایا۔ ڈاکٹروں سے رابطہ قائم کیا۔ جب جانے کا موقع آیا، تو شوکت نے پاسپورٹ ہاتھ میں لے کر دھاڑتے ہوئے کہا۔

"اب سالی کو باہر کے مردوں کا چسکا پڑا ہے میں تجھے ضرور جانے دوں گا، کیا تو سمجھتی ہے کہ چہرے کے داغ بھروا کر تو حسین بن جائے گی؟ میں تجھے کبھی پلاسٹک سرجری نہیں کرانے دوں گا"۔

"اچھا پھر مجھے حج کرنے دو، کم از کم میرے دل کو تو سکون ہوگا۔" حور نے لجاجت سے کہا۔

"آہاہا! تو سوچ ہے کہ کھا کر بلی حج کو چلی ، تم نے مجھے بے وقوف سمجھا ہے؟ یہ لے اپنا پاسپورٹ اور حج کر لے؟ یہ کہہ کر شوکت نے پاسپورٹ کے ٹکڑے کر کے اچھال دیئے۔

نور روتے ہوئے بستر پر گر پڑی۔ یہ کیسا ظالم شخص تھا جو اسے کسی طرح چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ اس نے کبھی کسی کو تکلیف نہ دی تھی۔ پھر کس گناہ کی پاداش میں اسے سزا مل رہی تھی!! اگلے دن صبح ہی ٹیلیفون کا بل آیا۔ نور نے دیکھا کئی ہزار کا بل تھا۔ اس نے پوچھا۔

"میں ہر ماہ فون کا بل آپ کو دیتی ہوں، یہ بل کیسے آ گیا؟"

شوکت نے مسکرا کر کہا:۔

"میں جو فون کرتا ہوں اس کا بل ہے؟"

نور خاموش رہی اگلے دن اس نے فون کٹوا دیا بل دینا اس کی استطاعت سے باہر تھا۔

شوکت بہتیرا چیخا چلایا مگر نور تو مٹی کے بُت کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ اب اس نے دل کے سکون کے لیے عبادت کی راہ سوچی تھی۔ رات کو گھنٹوں بیٹھ کر وہ تلاوت کرتی اور پھر اس کے معنی پڑھتی، اس کے دل کو اب سکون آ گیا تھا۔ خدا کی راہ میں جو اس سے خیرات کی جاتی وہ دل کھول کر کرتی۔

اس کے بے قرار دل کو اب قرار آ گیا تھا۔ نادار مریضوں کا علاج مفت کرتی اور ان کی دُعائیں لیتی۔ اس کا دل چاہتا جو کچھ بھی ہے وہ سب خدا کی راہ میں دے دے۔ اب اس نے شوکت کو روپے دینے بند کر دیے تھے۔ شوکت نے مار پیٹ بھی کی مگر نور کا دل سخت ہو چکا تھا۔

ایسے میں ہی ایک دن اس کا پیر غسل خانے میں پھسل گیا۔ ٹانگ میں سخت چوٹ آئی وہ بستر پر پڑی تھی اور شوکت الماریوں میں چیزیں تلاش کر رہا تھا بجائے اس کے کہ ڈاکٹر کو بلاتا وہ اپنے لالچ میں جلا تھا۔ گھر کی بوڑھی انا نے پڑوس سے روحینہ کو فون کیا۔ وہ بے چاری فوراً گاڑی لے کر آئیں اور نور کو ہسپتال لے گئیں۔ شوکت بڑے مزے سے ٹہلتا رہا۔

نور کو چوٹ سخت لگی تھی۔ کافی دن ہسپتال میں رہی۔ شوکت ایک دن بھی نہ آیا۔ جب نور ٹھیک ہو کر گھر آئی تو بوڑھی انا نے روتے ہوئے بتایا شوکت گھر کی ساری نقدی لے کر واپس ہندوستان چلا گیا ہے۔

نور نے چین کا سانس لیا، اس کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتر چکا تھا۔ اب اس نے اپنے کلینک پر توجہ دی اور گھر میں ہی مریضوں کا علاج کرنے لگی۔ باقی وقت اس نے خدا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ دل کا سکون اسے مل چکا تھا۔ رات کے سناٹے میں اب بھی اسے خیال آتا ہے کہ خدا نے اسے کس آزمائش میں ڈالا ہے۔ کبھی کبھی شوکت کے خط آتے ہیں مگر طعنوں سے بھرے، وہ بغیر پڑھے ایک طرف رکھ دیتی ہے۔ اب اسے پھر پتہ چلا ہے۔ شوکت آنے والا ہے مگر وہ اب مطمئن ہے۔ جو کماتی ہے اس میں اپنی ضرورت کے لیے رکھ کر باقی خیرات کر دیتی ہے۔ وہ سب کی مسیحا ہے مگر اس کا پُرسان حال کوئی نہیں۔ وہ سب کو سہارا دیتی ہے اور خود خدا کی ذات کے سہارے جوانی کا جوگ کاٹ چکی ہے۔

دل کی اُمنگیں وقت کے ساتھ ساتھ دم توڑ چکی ہیں۔ اب کوئی خواہش نہیں، کوئی تمنا نہیں، سوائے اس کے کہ آخری وقت سکون سے کٹ جائے۔ بوڑھی انا اس کے ساتھ رہتی ہیں اور بیٹی کی طرح اس سے محبت کرتی ہیں مگر تقدیر کے ساتھ وہ بھی نہیں لڑ سکتیں۔

نور آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر مسکرا دیتی ہے۔ اور پھیلے ہوئے داغوں میں گم گشتہ زمانہ تلاش کرتی ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے وہ ازل سے تنہا تھی اور ابد تک تنہا رہے گی۔ یہی اس کا نوشتہ تقدیر ہے جو روزِ اوّل تحریر کر دیا گیا تھا۔ اس پر ہی صابر و شاکر ہو کر وقت گزارنا اس کا مقدر بن چکا ہے۔ کبھی کبھی وہ حیرت سے بوڑھی انا سے کہتی ہے۔

"کاش آپ لوگ میرے ٹیکہ لگوا دیتے تو آج میں اس تکلیف سے بچ جاتی اور شاید زندگی کی راہوں میں خوشی سے وقت گزارتی۔ ذرا سی بھول نے چہرے کے ساتھ ساتھ زندگی کو بھی داغ دار کر دیا ہے!"

والدین کے باہمی اختلافات اور نوجوانوں کا ردِ عمل

یاسمین کنول

اگر بچوں کو گھر میں محبت کرنے والے والدین اور خوشگوار ماحول میسر ہو تو کیوں وہ راہ فرار اختیار کریں اگر ان کی تمام جائز خواہشات کا احترام کیا جائے تو کیوں وہ خودکشی پر مجبور ہوں؟۔

بات سے بات نکلتی ہے ہم اکثر اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں لڑکی گھر سے فرار ہو کر دارالامان پہنچ گئی یا فلاں جگہ جا پہنچی۔ لڑکوں کے گھر چھوڑنے کے واقعات بھی سنتے رہتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کیوں کوئی نوجوان لڑکی یا لڑکا اپنے گھر کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بعض بزدل نوجوان خودکشی کے مرتکب بھی پائے گئے ہیں مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ وہ کیوں گھر سے فرار ہوتے ہیں؟ وہ کیوں خودکشی پر مجبور ہو جاتے ہیں؟ کچھ تو وجہ ہو گی؟ کوئی تو سبب

ہوگا؟ اتنا بڑا اقدام کوئی یسے ہی نہیں اُٹھا لیتا۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ نوجوان گھروں میں پرسکون فضا نہ ہونے، آئے روز لڑائی جھگڑا رہنے اور والدین کے باہمی کشیدہ تعلقات کی وجہ سے گھر سے فرار ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر والدین ان کے جائز مطالبات نہیں مانتے جن میں پسند کی شادی کا مطالبہ سرفہرست ہوتا ہے تو وہ خودکشی تک کرنے پر تل جاتے ہیں۔ نوجوان زیادہ جوشیلے ہوتے ہیں۔ جوانی میں جو جوش اور جذبات انسان میں پائے جاتے ہیں وہ کسی اور عمر میں نہیں ہوتے۔ جذبات میں آ کر نوجوان گھر سے فرار ہوتے ہیں اور خودکشی کر جاتے ہیں۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ہمارے متوسط گھرانوں میں بہت معمولی بات پر جھگڑا شروع ہوتا ہے اور بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔ بات چلتی کہیں سے ہے اور ختم کہیں اور جا کر ہوتی ہے۔ مثلاً شوہر صاحب دفتر سے آئے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو کھانا گرم کرنے میں دیر ہوگئی ہے تو وہ فرمانے لگتے ہیں "ہمیشہ سے تمہاری عادت ہے کبھی وقت پر کھانا نہیں ملتا۔ تم کبھی بھی میرا کوئی کام وقت پر نہیں کرتی۔ تم نے ہمیشہ مجھے نظرانداز کیا ہے۔ یہ میرا حوصلہ ہے کہ تمہیں برداشت کر رہا ہوں اور ہوتا تو کب کی دوسری لے آیا ہوتا"۔ آپ نے دیکھا کہ بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں جا پہنچی۔ اب اگر بیگم صاحبہ بھی غصے کی تیز ہیں تو معاملہ مزید بگڑ سکتا ہے اور بات مزید بڑھ سکتی ہے۔ اگر بیگم صاحبہ کہیں "ہمیشہ تو وقت پر کھانا گرم کرتی ہوں آج ہی چند منٹ کی دیر ہوئی ہے اور آج ہی آپ نے غصہ نکال لیا۔ میں نے ہمیشہ آپ کا خیال رکھا اور ہمیشہ آپ کی خدمت کو اپنا ایمان سمجھا مگر آپ نہ جانے کیوں مجھے غلط سمجھتے ہیں"۔ یہ تو ٹھیک ہے بات آگے نہیں بڑھے گی لیکن اگر بیگم صاحبہ فرمانے لگیں "اے ئے میں نے کبھی تمہیں [illegible] وقت پر کھانا نہیں دیا [illegible] خیال نہیں رکھا تو اتنے سال سے کیسے یہ گھر چل رہا ہے؟ کون تمہارا خیال رکھ رہا ہے؟ اور یہ دوسری بیوی کا دھونس کسی اور پر جمانا، مجھ پر ایسی باتوں کا اثر نہیں ہونے والا، اول تو تمہیں بیٹی ہی کوئی نہیں دے گا اگر کسی نصیبوں جلے باپ نے یہ کام کر دکھایا تو چند ہی روز میں تمہارے کرتوت دیکھ کر فرار نہ ہو جائے تو نام بدل دینا۔ یہ میں ہی ہوں جو تمہارا گھر سنبھالے بیٹھی ہوں کوئی اور ہوتی تو کب کی راہ فرار اختیار کر چکی ہوتی"۔

آپ نے دیکھا کہ بات کتنی معمولی تھی لیکن جذبات کی رو میں آ کر چھوٹی سی بات کو بھی بڑا کر دیا جاتا ہے دل کی بھڑاس نکالی جاتی ہے اور کبھی کبھی تو ایسی باتوں سے علیحدگی یا طلاق کی نوبت بھی آ جاتی ہے اور جب ایسی نوبت آ جاتی ہے تو بچوں کی حالت زار دیکھنے والی ہوتی ہے۔ بے چارے نہ ادھر کے ہوتے ہیں اور نہ اُدھر کے۔ باپ کے پاس رہیں یا ماں کے پاس ان کو کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے اگر بچے نوجوانی میں قدم رکھ رہے ہیں تو ان پر جذباتی اثر بھی ہو سکتا ہے اور وہ گھر سے فرار یا خودکشی جیسے اقدام بھی کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اسی طرح گھر میں بہن بھائیوں میں معمولی بات پر تکرار ہو جاتی ہے۔

"ثمینہ ذرا پانی تو پلانا" جنید کہتا ہے۔ ثمینہ بے چاری سہیلیوں میں گھری ہے یا ہوم ورک کر رہی ہے یا کسی اور ضروری کام میں مصروف ہے اور پانی لانے میں تاخیر کر دیتی ہے تو بھائی صاحب کا پارا آسمان سے باتیں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ "دو گھنٹے بعد اب آئی ہو پانی لے کر تمہیں دوسرے فضول کاموں سے فرصت ملے تو میری بات بھی سنو آج تک تم نے میرا کوئی کام وقت پر کیا ہے تو بتاؤ؟" اب اگر بہن سمجھدار اور فرمانبردار ہے تو "سوری بھائی دیر ہوگئی" کہہ کر بات ٹال دے گی لیکن اگر بہن بھی ترش مزاج اور [illegible] ہے تو جواب [illegible] کچھ یوں دے گی" وہ جو

تمہارے دوستوں کی خاطریں کرتی ہوں وہ بھول گئے، جو تمہارے کپڑے استری ہو جاتے ہیں کیا خود ہی ہو جاتے ہیں اور جوتے بھی فرشتے پالش کر جاتے ہوں گے۔ تم نے آج تک میرے کس کام کا احسان مانا ہے جو اب مانو گے"۔ اور معاملہ بگڑتا چلا جاتا ہے۔ بہن بھائی میں تُو تُو میں میں ہوتی ہے اور چند روز بات چیت بند رہتی ہے پھر کوئی دلچسپ اتفاق صلح کا باعث بن جاتا ہے لیکن کچھ ایسے نوجوان بھی ہوتے ہیں جو ایسی باتوں کو دل سے لگا لیتے ہیں اور جس گھر میں ایسی باتیں روز کا معمول بن جائیں وہاں سے فرار کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔

میاں، بیوی، بہن، بھائی، باپ، بیٹا اور اسی طرح دوسرے افراد کے باہمی تعلقات اگر کشیدہ ہوں تو گھر کی فضا بوجھل، ناسازگار اور ناخوشگوار دکھائی دیتی ہے۔ جس سے تمام گھرانے کی جذباتی زندگی پر بہت ناخوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم بات کو شروع تو کسی اور انداز میں کرتے ہیں مگر وہ حالات و واقعات کے تناظر میں کوئی اور صورت حال اختیار کر لیتی ہے جس کے نتائج مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی اور اکثر منفی پہلو ایسی باتوں کے زیادہ ہوا کرتے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کا سدباب کیسے کیا جائے۔ کیسے بچوں کو گھروں سے فرار ہونے سے روکا جائے؟ کیسے انہیں ایک صحت مندانہ زندگی بسر کرنے کی طرف راغب کیا جائے؟ تو اس کا آسان حل والدین کے آپس کے خوشگوار تعلقات میں مضمر ہے۔ اگر بچوں کو گھر میں محبت کرنے والے والدین اور خوشگوار ماحول میسر ہو تو کیوں وہ راہ فرار اختیار کریں اگر ان کی تمام جائز خواہشات کا احترام کیا جائے تو کیوں وہ خودکشی پر مجبور ہوں گے۔

بچے جذباتی ہوتے ہیں جذبات کی رو میں کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں لیکن والدین تو باشعور ہوتے ہیں وہ کیوں ان کی نفسیات کو نہیں سمجھتے؟ بعض والدین بچوں کے ساتھ بچے بن جاتے ہیں ان کی ضد کو پورا کرنا اپنی انا کی شکست تصور کرتے ہیں جس کے نتائج بڑے بھیانک نکلتے ہیں لہٰذا والدین کو بچوں سے ہرگز ہرگز مقابلہ نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی ان کی کسی بات کو انا کا مسئلہ بنانا چاہئے بلکہ کشادہ دل و دماغ سے ان کی بات سن کر کوئی فیصلہ صادر کرنا چاہئے۔

آج کے دور کا سب سے بڑا مسئلہ جذباتی پن ہے اور جتنی بھی سماجی و معاشرتی برائیاں ہمیں نظر آتی ہیں۔ سب کے پیچھے جذبات کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ والدین بڑی حد تک ان مسائل کو کم کر سکتے ہیں اگر وہ خود کسی مسئلے کا شکار ہیں تو علیحدہ کمرے میں اس پر گفتگو کریں اور اس کا حل تلاش کریں۔ بچوں کے سامنے اونچا اونچا بولنا اور گلے والے بھی کب کسی کو معاف کرتے ہیں کل کو طعنے دیکر آپ کے گھرانے کا جینا دوبھر کر دیں گے۔ اپنے گھر کو بچائیں۔ اپنے بچوں کے مستقبل کو داؤ پر مت لگائیں۔ خدارا انہیں خودکشی پر مجبور نہ کریں اپنی جھوٹی انا کی بھینٹ مت چڑھائیں۔ اپنے گھر کی خبر لیں۔ بچوں کے دوست بنیں ان کے مسائل حل کریں اور اپنے مسائل حل کریں اور اپنے مسائل ان پر ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر ہر گھر اس بات پر عمل کرے تو پورا معاشرہ درست ہو سکتا ہے۔ نوجوانوں میں گھر سے فرار اور خودکشی کے واقعات ختم ہو سکتے ہیں کیونکہ کوئی بھی شخص اپنی جان کو خوشی سے ضائع نہیں کرتا۔ والدین ہی اس مسئلے کو سلجھا سکتے ہیں اگر ان کو شعور آ جائے تو ہمارا مستقبل مزید روشن ہو جائے اور نوجوانوں کے جذباتی مسائل حل ہو جائیں۔

بیتے دن

سعیدہ فتح محمد

باجی کے گھر کا ماحول میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ میں اپنی نو سال کی عمر میں صرف ایک بار بھائی گل کے ساتھ انہیں ملنے آئی تھی مگر اب مجھے مستقل طور پر یہاں رہنا تھا۔ امی، ابو، بھائی گل اور منجھلی باجی سبھی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میں تنہا اجنبی ماحول میں سسک رہی تھی۔

ایک لڑکی کی بپتا جس نے اپنی کمزوری کو دوسروں کی طاقت بنا دیا

میں ابھی چھ برس کی ہی تھی کہ گردش دوراں نے میری مسکراہٹوں کو آہوں میں بدل کر مجھے مصائب والام کی راہوں پر ڈال دیا۔ میں ان انجانی پگڈنڈیوں پر حیران و پریشان چلتی رہی۔ اس امید پر کہ شاید کبھی [illegible] کی منزل [illegible] سکے۔

میرے والد ایم ای ایس کے محکمے میں ایس ڈی او کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ ہمارے عروج کا زمانہ تھا گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ روپے پیسے کی فراوانی تو تھی ہی والد صاحب [illegible] عمدہ ذوق نے گھر کو [illegible] کا [illegible] بنا یا ہوا تھا۔ ہم چار بہنیں اور

تین بھائی تھے۔ ایک بھائی بچپن ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ میں سب سے چھوٹی تھی وقت بڑے مزے سے گزر رہا تھا مگر زمانہ کہاں ایک سا رہتا ہے۔ ہمارا نشیمن بھی تغیر کی لپیٹ میں آیا اور ہماری دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔

سب سے بڑے بھائی ایم بی بی ایس کے سال اوّل میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ چند دن بیمار رہ کر چل بسے۔ امی ان کی بے وقت موت کے صدمے کی تاب نہ لا کر اپنے بیٹے سے جا ملیں۔ گردشِ دوراں نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔ امی کی وفات کے چھ ماہ بعد پاؤں پھسل جانے سے ابو کا انگوٹھا زخمی ہو گیا۔ اور زبان بند ہو گئی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ زہریلا مادہ جسم میں سرایت کر گیا ہے۔ جس کی وجہ سے قوتِ گویائی جاتی رہی ہے۔ ابو تین دن اس حال میں رہے اور پھر ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

ابو کے بعد ہر طرح کی ذمہ داری بھائی گل پر آ پڑی۔ جن کی عمر صرف 20 سال تھی۔ وہ دو بہنوں سے چھوٹے تھے۔ انہیں دنیا کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر حالات کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ باجی شادی شدہ تھیں۔ ان کے مشورے سے دونوں بہنوں کی شادیاں کر دی گئیں اور اس طرح کسی حد تک ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

اب بھائی اور میں تنہا رہ گئے۔ گھر کی ویرانی کھانے کو دوڑتی تھی۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تقدیر کی ستم ظریفی ہمارے آشیانے کے تنکوں کو اس بے دردی سے بکھیر دے گی۔ پیہم صدمات نے بھائی گل کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح بھی چھوڑ دی تھی۔ تعلیم کا سلسلہ بھی ختم کرنا پڑا اور وہ بی ایس سی کرنے سے قاصر رہ گئے۔ انہوں نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ ان سے وقت گزارنے کا ایک ذریعہ [illegible] مل گیا مگر [illegible]

اُلجھنوں اور پریشانیوں میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

بھائی کی نگاہوں کا مرکز صرف میری ذات تھی۔ دفتر سے واپس آ کر شام کو بہت کم باہر جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے ماں باپ، بہن اور بھائی سب کا پیار دیا۔ ایک دن بھائی کو اچانک بخار نے آ لیا۔ پیہم صدمات نے کمزور تو پہلے ہی کر رکھا تھا اس بیماری کا مقابلہ نہ کر سکے۔ سب بہنیں اکٹھی ہو گئیں۔ مختلف ڈاکٹروں سے مشورے کیے گئے مگر بے سود، دیئے کا تیل ختم ہو چکا تھا اور وہ صرف ٹمٹما رہا تھا۔ آخر جولائی کی ایک اُداس شام کو یہ چراغ بھی ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ میری دنیا تاریک ہو گئی۔ اس وقت میری عمر تقریباً نو برس تھی۔

بھائی گل کی وفات کے بعد مجھے اپنے آبائی گھر کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہنا پڑا کیونکہ میری کفالت باجی نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ وہ ایک قیامت خیز گھڑی تھی جب میں اپنے اس گھر سے رخصت ہو رہی تھی جہاں میرے والدین کے عروج کی داستانیں مدفون تھیں۔ جہاں کی فضاؤں میں بھائی گل کے پیار بھرے نغموں کی آوازیں ابھی تک گونج رہی تھیں جس کے در و دیوار سے مجھے پیار تھا جو میرا اپنا گھر تھا۔ میں باجی کے ہمراہ فیروز پور سے لدھیانہ چلی آئی۔

باجی کے گھر کا ماحول میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ میں اپنی نو سال کی عمر میں صرف ایک بار بھائی گل کے ساتھ انہیں ملنے آئی تھی مگر اب مجھے مستقل طور پر یہاں رہنا تھا۔ امی، ابو، بھائی گل اور منجھلی باجی سبھی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور میں تنہا اجنبی ماحول میں سسک رہی تھی۔ میرے چہرے کی مسکراہٹ ختم ہو چکی تھی۔ ہر وقت [illegible] ہنسی [illegible]۔ سکول میں بھی [illegible] نہیں لیتی تھی۔ باجی

بہت خیال رکھتی تھیں مگر تقدیر کے لگائے ہوئے زخموں کا اندمال ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

وقت کے ترکش میں کوئی ایسا تیر نہ تھا جس نے مجھے اپنا نشانہ نہ بنایا ہو۔ میرے آنسو ابھی خشک نہ ہوئے تھے کہ مجھلی باجی اس دنیا کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد چھوٹی باجی بھی چل بسیں۔ صبر کے سب بندھن تو پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے۔ ان صدمات کو برداشت کرنے کے لئے حوصلہ کہاں سے آتا؟ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ سانس کی آمد و رفت ہمیشہ کے لئے رُک جائے گی مگر وقت کی چکی میں پسنے کے لئے مجھے ابھی زندہ رہنا تھا۔

میری توجہ اب صرف ایک مرکز پر مرکوز ہو کر رہ گئی کہ مجھے تعلیم حاصل کر کے اپنے پاؤں پر جلد از جلد کھڑا ہو جانا چاہئے۔ پیہم صدمات اور حالات کی مسلسل ناسازگاری نے میرے دل میں وہ درد پیدا کر دیا جس نے مجھے دُکھی انسانوں کے زخموں پر

آٹھ روٹیوں کا قصہ

دو شخص اکٹھے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستہ میں کہیں بیٹھے کہ باہم کھانا کھائیں۔ ایک نے اپنے توشہ سے پانچ روٹیاں نکالیں اور دوسرے نے تین۔ اسی اثناء میں ایک شخص کا ان کے پاس سے گزر ہوا اور اس نے ان پر سلام کیا۔ انہوں نے اس کو بھی دستر خوان پر دعوت دی چنانچہ وہ بھی بیٹھ گیا اور شریک طعام ہوا، جب وہ کھا چکا تو اس نے اپنی جیب سے آٹھ درہم نکال کر ان لوگوں کے سامنے پیش کیے اور اپنے کھانے کا حساب چکانا چاہا۔ اب پہلے دونوں اشخاص میں ان درہموں کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا، جس کی تین روٹیاں تھیں وہ یہ کہتا تھا کہ ہم کو یہ آٹھ درہم آپس میں برابر تقسیم کرنا چاہئیں۔ دوسرا کہتا تھا کہ تمہاری تین روٹیاں تھیں اور میری پانچ لہٰذا اسی حساب سے پانچ درہم میرے تین تمہارے ہوئے۔ جب یہ معاملہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس پہنچا تو آپ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ بہتر ہے تم دونوں آپس میں صلح کر لو کیونکہ ایسی معمولی باتوں میں تم لوگوں کو نزاع کرنا زیب نہیں دیتا۔ لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فہمائش کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تب آپ کرم اللہ وجہہ نے تین روٹیوں والے سے کہا (جو شکایت لے کر آیا تھا) کہ "اگر تو واقعی فیصلہ حق چاہتا ہے تو تجھ کو صرف ایک درہم ملے گا اور باقی سات درہم تیرے ساتھی کے ہیں۔" یہ سُن کر وہ حیران ہوا۔ بولا "سبحان اللہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔" حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔ "میں بتائے دیتا ہوں، کیا تیری تین اور تیرے ساتھی کی پانچ روٹیاں نہ تھیں؟" اس نے کہا "جی ہاں۔" فرمایا "آٹھ کو تین پر ضرب دو تو چوبیس ہوئے (چوبیس حصے کرنے کا فائدہ آگے معلوم ہوگا) چونکہ تم کو یہ نہیں معلوم کہ کس نے زیادہ کھایا ہے اور کس نے کم اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ سب نے برابر کھایا ہے۔ پس تو نے بھی آٹھ ثلث کھائے اور تیرے ساتھی نے بھی آٹھ ثلث۔ اس تیسرے آدمی نے بھی آٹھ ثلث کھائے، اب تیرا سہم نو ثلث تھا کیونکہ تیری تین روٹیاں تھیں ہر ایک روٹی کے تین حصے کیے تو ۹ حاصل ہوئے (۳x۳=۹) تو نے جو آٹھ کھا لیے تھے اس کے بعد ایک حصہ تیرا باقی بچا تیرے ساتھی کی پانچ روٹیاں تھیں، ہر روٹی کے تین حصے کیے تو (۵x۳=۱۵) پندرہ ٹکڑے بنے۔ فرض مذکور کی بنا پر تیری طرح آٹھ ٹکڑے اس نے بھی کھائے سات ٹکڑے باقی بچے، یہ سات تیرے ایک ٹکڑے کے ساتھ مل کر آٹھ ہوئے، جو تیسرے شخص نے کھائے پس اس آدمی پر تیرا ایک ٹکڑا صرف ہوا اس لیے تجھ کو ایک درہم ملنا چاہیے اور تیرے ساتھی کے ۷ ٹکڑے تھے، اس لیے اس کو سات درہم ملنا چاہئیں۔" یہ سن کر اس نے کہا یا حضرت کرم اللہ وجہہ اب میں راضی ہو گیا۔" (ذخائر العقبیٰ - مرسلہ: محمد فرقان - لاہور)

مرہم رکھنے کے لئے اپنی تمام زندگی وقف کر دینے کا مشورہ دیا اور میں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنے لئے نہیں دکھی انسانیت کے لئے مجھے زندہ رہنا ہے۔ اس کے پیش نظر میں ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اپنی پڑھائی کی طرف پوری متوجہ ہوگئی۔

میں نے گورنمنٹ کالج لائل پور سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ حالات کے پیش نظر تعلیم جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا اور ٹریننگ کلاس میں داخلہ لیا۔ لیڈی میکلیگن کالج سے سی ٹی کی تربیت حاصل کی۔ اب ملازمت کا سوال سامنے آیا۔ میرا کوئی سفارش کرنے والا نہ تھا۔ خدا ہی میرا حامی و ناصر تھا۔ لاہور سے انٹرویو کی اطلاع آئی تو باجی نے مشورہ دیا کہ ایک رشتے دار خاتون جو خود اعلیٰ منصب پر فائز رہ چکی تھیں اور جن کا محکمہ تعلیم میں بڑا اثر تھا۔ ان سے سفارش حاصل کی جائے مگر میرے ضمیر نے اجازت نہ دی اور دل نے کہا:

"بتوں سے تجھ کو امید خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے"

لاہور پہنچ کر میں نے سفارش کروانے کا فیصلہ بدل دیا اور اپنی کشتی امید کو خدائے بزرگ و برتر کے سہارے پر چھوڑ دیا۔

انٹرویو کے لئے تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب لڑکیاں جمع تھیں۔ اتنی بڑی تعداد کے پیش نظر اپنی کامیابی کی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ بہت سی لڑکیاں ملازمت کا تجربہ بھی رکھتی تھیں۔ انٹرویو مس قریشی اور مسز صدیقی لے رہی تھیں۔ اپنی باری پر میں بھی کمرے میں حاضر ہوئی۔ چند ایک سوالات انگریزی میں پوچھے گئے پھر اردو میں۔ میرے خانگی حالات کے متعلق بھی سوالات ہوئے۔ جواب دیتے ہوئے میں نے یہ کہنے کی جسارت کی کہ میرے پاس کوئی سفارش نہیں ہے۔ میرے اس جملہ پر مس قریشی چونکیں اور قدرے توقف کے بعد بڑی ہمدردی سے جواب دیا:

"تم جیسی بچیوں کے لئے کسی سفارش کی ضرورت نہیں"۔

ان لفظوں میں میرے لئے ایک اُمید کا پیغام تھا۔ کمرے سے باہر نکلی تو میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

انٹرویو کے تقریباً ایک ماہ بعد میری تعیناتی کے احکام آگئے۔ میں بے حد مسرور تھی۔ میں اپنی ملازمت پر حاضر ہوگئی۔ یہ میری زندگی کا نیا دور تھا۔ خدائے پاک سے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے ان راہوں پر چلنا شروع کردیا جو پہلے سے میرے سامنے متعین تھیں۔ میں اپنے کام میں منہمک ہوگئی۔ بے سہارا بچوں کی زرد رنگت، اُن میں پھیکی مسکراہٹ ان کی یاس بھری نگاہیں، ان کے پژمردہ اور خاموش چہرے، ان کا بوسیدہ لباس ان کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو، ان کے دکھوں پر سے پردہ اٹھانے کے لئے کافی تھے۔

میں نے اپنا فرض پہچانتے ہوئے ان کی طرف پوری توجہ دی۔ خدائے پاک کا احسان عظیم ہے کہ میرے اس جذبے میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی۔ والدین کی شفقت سے محروم بچوں کی دلجوئی میرا مقصد حیات ہے۔ میں ان کے مرجھائے ہوئے چہرے نہیں دیکھ سکتی۔ انہیں ہنستا دیکھ کر مجھے سکون ملتا ہے۔ بی اے کا امتحان دیا تو سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوئی۔ اس سال بی ایڈ کے امتحان میں بھی کامیاب ہوچکی ہوں۔ خدائے برتر ہی محنت کا ثمر دینے والے ہیں۔ شاید کسی معصوم کی دعائیں میری کشتی اُمید کو ساحل تک پہنچا دیں۔ خدائے قدوس سے دعا ہے کہ جب تک دم میں دم ہے میں جدوجہد کرتی رہوں تاکہ میرے وطن کا کوئی بچہ بے سہارا نہ رہے۔

اسماء الحسنٰی کامیابی کا راستہ

پیر شاہ محمد قادری

اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں سے آپ کے مسائل کا حل

سعدیہ نورین۔ لاہور

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے طویل عرصے سے آپ سے رابطہ کرنا چاہ رہی تھی میں ایک بہت ہی عجیب اُلجھن میں مبتلا ہوں مجھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر بے تحاشا غصہ آتا ہے اور پھر میں انتقاماً لوگوں سے بدلہ لینے کا منصوبہ بنانے لگتی ہوں اور اس خیالی جنگ میں نوبت [illegible] کی جا[illegible] تک پہنچ جاتی ہے ایسی فضول سوچوں سے میرا ذہن، مزاج بہت خراب ہو رہا ہے میں سمجھتی ہوں کہ مجھے اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔ اس کے لئے آپ سے راہ نمائی کی درخواست ہے میں چاہتی ہوں کہ میں صحت مند سوچوں والی ایک اچھی لڑکی بن جاؤں اور خوش مزاج ہو جاؤں؟

○ [illegible] اچھی بات یہ ہے کہ آپ

اپنی اصلاح چاہتی ہیں اور جو اپنی اصلاح چاہتا ہے وہ ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔ آپ "یارافع یارشید یاشہید" ہر نماز کے بعد 120 مرتبہ پڑھ کر دعا کر لیا کریں۔ اول آخر 3 مرتبہ درود شریف نماز کی پابندی کیجئے۔

خانم پری۔ کراچی

○ محترم! ہم لوگ کوئٹہ کے رہنے والے ہیں اور بزنس کے سلسلے میں کراچی میں رہتے ہیں میرا مسئلہ یہ ہے۔ کہ ایک لڑکا مجھ میں دلچسپی لینے لگا ہے ابتداء میں میں نے کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ ہم لوگ غیر پٹھان میں رشتہ نہیں کرتے ہیں اس نے مجھے خط لکھے فون کیے۔ لیکن میں نے ہمیشہ نظر انداز کیا مگر پچھلے دنوں اس نے مجھے پیغام بھجوایا کہ اگر میں نے اس کی محبت کا جواب محبت سے نہ دیا تو وہ خودکشی کر لے گا دوسرے دن اس نے اپنے پیٹ میں گولی مار لی۔ خیر بہت لمبا قصہ ہوا۔ وہ بھی بہت خوش حال لوگ ہیں ایک دن اس کی والدہ ہمارے گھر رشتہ لے کر آئیں حسب روایت ہم نے معذرت کر لی مگر وہ بہت روئیں میری والدہ کو لڑکا پسند آیا وہ بہت خوبصورت، تعلیم یافتہ اور اعلیٰ فیملی ہے مگر ہمارے والد صاحب مانتے نہیں ہیں اب سچ پوچھیے تو مجھے بھی اس سے لگاؤ یا پھر محبت ہو گئی ہے اس مسئلے میں ہماری راہ نمائی کیجئے تاکہ ہماری زندگی میں بہار آ جائے۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ تمام والدین کو اپنے بچوں کے حق میں صحیح فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین) ہر نماز کے بعد 141 مرتبہ "یاجامع یافتاح یالطیف" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔

نویدہ افضل۔ حیدرآباد سندھ

○ محترم! میری بیٹی کے اکثر حمل ضائع ہو جاتے ہیں عموماً ایسا تیسرے ماہ کے آخری ہفتے میں ہوتا ہے صرف ایک بیٹی ہے اس کے بعد پانچ سال ہو گئے ہیں کوئی حمل ہی نہیں ٹھہرتا۔ ہمارے داماد صاحب تو بہت اچھے اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں مگر ان کی والدہ گزشتہ ایک ڈیڑھ برس سے دوسری شادی کے لئے زور دے رہی ہیں جس کی وجہ سے میری بیٹی اور ہم بہت پریشان ہیں کئی لوگوں سے پوچھا ہے انہوں نے بتایا ہے کہ کسی نے حسد اور جلن میں اولاد کی بندش کروائی ہے کہ اول تو اولاد ہو ہی نہیں اور اگر ہو تو لڑکی ہو، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آجکل بیٹی کو بیاہنا کس قدر مسئلہ ہے ابھی دو بہنوں کی شادی اور بھی کرنی ہے مہربانی فرما کر کچھ ایسا کر دیجئے یا علاج در تعویز بتا دیجئے کہ میری بیٹی کو اللہ تعالیٰ اولاد کی نعمت عطا کر دے اور ان کی ساس کا رویہ بہتر ہو جائے ہمیشہ دعا گو رہوں گی۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی، اور ہر بیٹی کا گھر سلامت رکھے (آمین) "یاوارث" بکثرت پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمائے گا۔ انشاء اللہ

ریحانہ تبسم۔ جھنڈا چیچی۔ پنجاب

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہانوں کی خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے خالہ زاد بھائی کو پسند کرتی ہوں وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی بہن ہرگز نہیں چاہتی ہے وہ اپنی نند کی بیٹی سے اپنے بھائی کی شادی کرنا چاہتی ہے اس کی نند کی بیٹی کی آنکھ بچپن میں چیچک کی وجہ سے ضائع ہو گئی تھی مگر اس کو انہوں نے کہا کہ اگر تم یہ شادی کروا دو تو تمہیں چار، چار تولے کے کڑے ملیں گے۔ یہ بات مجھے خود اس نے ایک مرتبہ ناراضگی میں بتائی تھی کہ اگر تم شادی کرنا چاہتی ہو تو مجھے 10 تولے کے کڑے دو وہ تو آٹھ تولے کے دے رہے ہیں۔ کیا کوئی بہن اتنی بھی لالچی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے ہی بھائی کا گھر برباد کر دے؟ اس مسئلے کا کوئی ایسا حل بتائیے۔ میری بات مجھے مل

جائے اور وہ بے جا مداخلت سے باز آجائیں۔

☆عزیز بیٹی! جب انسان کی آنکھوں پر حرص اور طمع کی پٹی بندھ جائے تو پھر وہ رشتوں کے احترام اور خلوص کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو لالچ سے محفوظ اور مامون رکھے۔ (آمین) "یاعزیز یاجامع یامجیب" 313 مرتبہ بعد نماز عشاء پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف نماز کی پابندی کیجئے۔

نبیلہ گل۔ حیدرآباد

○ محترم! میری تین بیٹیاں ہیں اب ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اولاد نرینہ کی نعمت سے نوازے۔ آپ کی دعا میں اللہ نے بہت تاثیر رکھی ہے۔ میرے لئے دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ یہ خوشی ہمیں عنایت فرمادے۔ اور میرے لئے علاج و تعلیم بھی بتا دیجئے میرے شوہر پروفیسر ہیں اور وہ آپ کی کتب نہایت شوق سے پڑھتے ہیں۔ آپ کی ترقی درجات کے لئے ہمیشہ دعا گو آپ کی بہن۔

☆عزیز بہن! دعاؤں کا شکریہ۔ پروفیسر صاحب کا بھی شکریہ کہ وہ میری کتب کو شوق سے دیکھتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو یقیناً اولاد نرینہ کی خوشیوں سے نوازے گا۔ (انشاء اللہ)

شاہدہ اکرام۔ کراچی

○ محترم! ہمارے خاندانی مقدمات برسوں سے چل رہے ہیں لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے سوائے اس کے ہمارے گھر زمین بک رہی ہیں اور وکیل خوشحال ہو رہے ہیں کوئی ایسا طریقہ بتائیے کہ جس سے ہماری چالیس پینتالیس سالہ پرانے مقدموں سے جان چھوٹ جائے جن میں سے اب کئی مر بھی گئے ہیں۔ ہم آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہونا چاہتے ہیں آپ کی بہن۔

☆عزیز بہن! اللہ تعالیٰ [illegible] عقل سلیم [illegible]

فرمائے۔ (آمین) بہتر تو یہ ہے کہ آپ نئی نسل کے لوگ صلح کی جانب پیش قدمی کریں اور باہمی مشورہ سے اس کو حل کرلیں۔ آپ لوگ سہ پہر 3 بجے سے 8 بجے شام تشریف لاسکتے ہیں۔ جمعے کے دن تشریف نہ لائیں۔

روبینہ کوثر۔ منڈی بہاؤالدین

○ محترم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں پنجاب یونیورسٹی کی سٹوڈنٹ ہوں باوجود نہ چاہنے کے میں ایک لڑکے سے متاثر ہو گئی اس نے مجھے بہت سہارا دیا بحیثیت ایک اچھے دوست، لیکن پتا ہی نہیں چلا کہ کب ہماری دوستی محبت میں ڈھل گئی اس نے بہت خلوص سے اپنی محبت کا اقرار کیا اس کے بعد اس نے اپنی والدہ کو منڈی بہاؤالدین رشتے کے لئے باقاعدہ بھیجا۔ وہ بہت سلجھے ہوئے لوگ ہیں لیکن بدقسمتی یہ کہ میری ماں اس شادی کے لئے قطعاً راضی نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں برادری میں کیا منہ دکھاؤں گی؟ جبکہ میرے والد بہت نرم دل اور صلح جو انسان ہیں وہ کہتے ہیں کہ بچوں کو خوش رہنے دو۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ ہمارے لئے ایسی مہربانی فرمائیں کہ میری والدہ محترمہ اپنی بے جا ضد سے باز آجائیں اور ہاں کہہ دیں آپ کی یہ بیٹی ہمیشہ کے لئے آپ کی احسان مند، آپ کے لئے دعا گو رہے گی۔

☆اچھی بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ کو، اور تمام بیٹیوں کو اپنے تمام جائز شرعی حق خوش اسلوبی سے عطا فرمائے (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 141 مرتبہ "یاسلام یاجامع یاجبار" پڑھ کر دعا کیا کریں۔ اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے (آمین)

یاسمین لیاقت۔ کینیڈا

○ محترم! اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ [illegible] بھی نیکی کا [illegible] انجام دے رہے ہیں میں

بھی اس دریائے فیض سے کچھ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ مسئلہ میری بیٹی کا ہے وہ یہاں ایک لڑکے میں "انوالو" ہوگئی ہے۔ لڑکا مسلمان ہے شکل و صورت کا بھی اچھا ہے لیکن ابھی تک اس کے کاغذات نہیں بنے ہیں جبکہ وہ لڑکا شادی شدہ بھی ہے اور یہ بات اس نے چھپائی نہیں ہے مگر میری بیٹی اس سے شادی کرنے پر بضد ہے یہاں کا ماحول تو آپ جانتے ہیں کہ والدین نوجوان بچوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتے ہیں مگر میں سمجھتی ہوں کہ میری بیٹی کا یہ فیصلہ سوائے جذباتی شدت کے کچھ نہیں ہے آپ ایک ماں کے دل کی کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں کوئی ایسی صورت نکالئے کہ یہ معاملہ بہتر ہو جائے اور وہ اس ضد سے باز آجائے۔ آپ کی ایک مجبور بہن۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کی بچی کو اور تمام بچیوں کو فکر سلیم عطا فرمائے (آمین) ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ "یاقدوس یافتاح" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ نماز کی پابندی فرمائیں۔

سارہ احسن۔ اوسلو

○ محترم! ہمارے یہاں بہت عمدہ بزنس تھا۔ ہم ٹیلی فون، انٹرنیٹ سروسز وغیرہ کے کارڈ کے ہول سیل بزنس سے منسلک ہیں کمپنیاں محض ہمارے نام پر ہی ڈسٹری بیوشن الاٹ کر دیتی ہیں۔ الحمدللہ سب بہت اچھا چل رہا تھا لیکن گزشتہ 8 ماہ سے زوال ہی زوال ایک نئی مصیبت روزانہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ برسوں کی محنت اور ساکھ داؤ پر لگی ہے یہاں ایک جرمن خاتون ٹیرو کارڈز سے حالات بتاتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ تمہارے اوپر نحوست کا سایہ پڑ رہا ہے۔ تمہارے اوپر تمہاری کسی جاننے والی نے جادو کیا ہے۔ پے در پے نقصانات اور پریشانیوں سے تو واقعی یوں لگتا ہے کہ ہم جادو جیسی نحوست کا شکار ہو چکے ہیں۔ کوئی ایسی تجویز [illegible] اور [illegible] عنایت فرمائیے کہ جس کی برکت سے یہ نحوست ٹل جائے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ آپ یہاں تشریف لے آئیں اور تمام دفتر، گھر، اور کاروباری جگہوں کا ذاتی طور پر معائنہ فرمالیں، ویزا اور ٹکٹ جب آپ فرمائیں گے ارسال کر دیئے جائیں گے بس آپ کی اجازت کا انتظار ہے۔

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ آپ کو ہر قسم کے جادو، اور حسد اور شر سے محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین) آپ ہر نماز کے بعد 141 مرتبہ "یاحفیظ یاجبار یامقتدر" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 11 مرتبہ درود شریف۔ بکثرت سورۂ بقرہ کی تلاوت کا اہتمام کیجئے۔ 41 یوم کے بعد کیفیت سے دوبارہ مطلع فرمایئے گا۔ اللہ تعالیٰ جملہ مسلمین اور مسلمات کو ہر قسم کے شر اور ضرر سے محفوظ اور مامون رکھے۔ (آمین)

سیما۔ ہانگ کانگ

○ محترم! ہم لوگ یہاں پر ایک ریسٹورنٹ چلاتے ہیں اللہ کا فضل ہے کہ بہت اچھا چل رہا ہے اب ہم ایک اور ریسٹورنٹ خرید رہے ہیں یہاں ایک ریسٹورنٹ میں آپ کی ایک بہت ہی خوبصورت لوح ہم نے آویزاں دیکھی ہے وہ صاحب پاکستانی ہیں اور پنجاب کے شہر گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں اور آپ کے مرید بھی ہیں وہ آپ کی بہت تعریفیں کرتے ہیں اور اس لوح کی برکت کی بڑی تعریف کرتے ہیں گزارش ہے کہ آپ ہمیں بھی ایسی ہی ایک لوح تیار فرمادیں چاہے اس کے لئے جتنے دن بھی لگیں اور جو ہدیہ بھی ہو۔ وہ لوح دیکھنے میں اس قدر خوبصورت ہے تو اثرات میں بھی یقیناً بہت بابرکت ہوگی نجانے کیوں ہم [illegible] میں [illegible] کا [illegible] بہت یقین بن گیا ہے [illegible] ہے [illegible] یہ درخواست قبول فرما

کر شکریے کا موقع دیں۔

☆عزیزہ بہن! اللہ تعالیٰ آپ کے تمام کاروبار میں خیروبرکت اور ترقی عطا فرمائے اور ہر حاسد کی نظر اور شر سے محفوظ اور مامون رکھے (آمین) جس لوح کا آپ تذکرہ فرمارہی ہیں اس کی تیاری میں کافی وقت لگتا ہے آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے جونہی تیار ہوئی آپ کو بھیج دی جائے گی دعاؤں اور تحفے کا شکریہ۔

نقش شب قدر

○ ماہ رمضان المبارک خیروبرکت اور انسانی ترقی اور درجات کے لئے مخصوص ہے۔ اس ماہ مبارک میں جس قدر عبادت الٰہی اور درود شریف کا معمول اختیار کیا جائے خیروبرکت، آخرت کی ترقی اور نجات کے لئے بہترین ہے۔ اس ماہ مبارک میں نماز تراویح تہجد کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔ اور زیادہ سے زیادہ درود شریف کا ورد کیا کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس مبارک ماہ میں بطور خاص عالم انسانیت کی جانب متوجہ ہوتی ہیں۔ ذیل میں ہم ایک تجربہ شدہ عمل لکھتے ہیں۔ یہ عمل شب قدر کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ گزشتہ سالوں میں جن بہن بھائیوں نے اس عمل کو پوری شرائط کے ساتھ مکمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک احمد مصطفےٰ ﷺ کے طفیل ان کی حاجات پوری کیں۔ میرا ایمان ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کا نام خلوص نیت سے لیا جائے گا۔ کاموں میں آسانی اور مشکلات سے نجات ہو گی۔ جو بہن بھائی جس مقصد کے لئے بھی کریں گے۔ آئندہ رمضان تک وہ مقصد ضرور پورا ہو گا۔ انشاء اللہ۔ یہ عمل رمضان المبارک کا چاند دیکھ کر شروع کریں۔ یہ عمل سورۃ القدر کا انتہائی جلیل القدر عمل ہے۔ جو کہ تیسویں پارے میں ہے۔

طریقہ: اول سب سے پہلے دو رکعت نماز حاجت ادا کیجئے، پہلی رکعت میں ۱۳ مرتبہ سورۃ القریش اور دوسری رکعت میں ۱۳ مرتبہ سورہ العصر پڑھیں اور اپنے مقاصد کے لئے دعا کریں۔ (یہ نماز حاجت پہلے دن پڑھیں) اس کے بعد مغرب اور عشاء کے درمیان اس سورہ مبارک کو یعنی سورۃ القدر صحت قرأت کے ساتھ 286 مرتبہ پڑھیں اور اول و آخر ۱۱ مرتبہ درود ابراہیمی کا ورد کریں۔ اور یہی عمل نماز فجر کے بعد کیجئے۔ 28 روز اس عمل کو بلا ناغہ کیجئے۔ 29 ویں روز بعد نماز عصر زعفران اور عرق گلاب کو ملا کر سیاہی بنائیں اور اس سورۃ مبارکہ کو اعراب کی صحت کے ساتھ ایک سفید کاغذ پر لکھ کر محفوظ کرلیں۔ اور مغرب کے وظیفے کے بعد دم کر کے حفاظت سے رکھ لیں۔ اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کے رحم و کرم کا نظارہ کیجئے۔ بعد عمل اس سورہ کو ہمیشہ ۱۲ مرتبہ اول و آخر ۱۱ مرتبہ درود شریف ابراہیمی کے ساتھ ورد میں رکھیں۔ انشاء اللہ جملہ مقاصد حل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسا دست غیب کھلے گا کہ دنیا دیکھے گی۔ اس عمل میں یہ خیال رہے کہ کوئی ناغہ نہ ہو۔ جگہ تبدیل نہ ہو۔ اور وقت وظیفہ خوشبو کا استعمال رہے۔ اس وظیفے کی اجازت عام ہے۔ یہ زندگی میں درپیش تمام مقاصد کے لئے پڑھا جا سکتا ہے۔ جو خواتین و حضرات اپنی مصروفیات کے باعث اس عمل کو خود نہیں کر سکتے تو وہ رابطہ کر کے اپنا نام یکم رمضان سے قبل نوٹ کروا دیں۔

پیر شاہ محمد قادری B-359، فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان
فون نمبرز: 35168036-42-92+ 35167842-
بذریعہ خط جواب کے لئے جوابی لفافہ ہمراہ ارسال کریں

تھوڑا سا آسماں

محسن علی

اُس نے دُھندلی آنکھوں کے ساتھ آریان کو دیکھنے کی کوشش کی وہ جارہا تھا۔ وہ اُس کا "حاصل" تھا۔ نہیں وہ حاصل نہیں لا حاصل تھا۔ وہ اُٹھی مگر اپنا بیگ وہیں چھوڑ گئی۔ بارش برس رہی تھی۔ وہ کالج کا گیٹ پار کر رہی تھی۔ چوکیدار اُس سے کچھ کہہ رہا تھا وہ چپ چاپ چل رہی تھی۔

ایک دوشیزہ کی کہانی جسے موت سے بہت ڈر لگتا تھا

آرٹس کونسل کے احاطہ میں جیسے ہی اس نے قدم رکھا۔ پہلی نظر ہی آریان پر پڑی۔ اُس کو لگا جیسے اُس نے کوئی اور دُعا بھی مانگی ہوتی تو وہ بھی قبول ہو جاتی۔ سادہ سے شلوار سوٹ میں اُس نے خود کو کافی احمق محسوس کیا۔ اس [illegible] سے لباس کی

شکنیں درست کیں اور اُس کی طرف بڑھ آئی۔ وہ ان کے گروپ میں نئی نئی شامل ہوئی تھی۔ اُن کے ڈپارٹمنٹ میں ہر گروپ چار چار افراد پر مشتمل تھا۔ اُ[illegible] کالج [illegible] بڑی مشکل سے داخلہ ملا تھا۔ اس [illegible] کا اپنا [illegible] "باجی [illegible] یہ جو آپ

کو داخلہ ملا ہے یہ اُن ناظموں کے طفیل ہے جو میں ہر جگہ، ہر جمعہ کے روز بانٹتی ہوں"۔

اور پارسا کو اُس کی اس بات سے رتی برابر بھی انکار نہ تھا۔

دوسری طرف اماں جی تھیں جو داخلہ ملنے پر اُسے گلے لگا کر بولی تھیں "بیٹا! میں نہ کہتی تھی خدا اپنے بندے کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔ یہ تو بندے ہیں جو دنیا کی خواہش میں اپنے رب سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں"۔ ماں کی بات پر اس کے ذہن میں صرف ایک بات اُبھری تھی۔ "خدا بندے کو نہیں چھوڑتا مگر بندے، بندے کو کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟" یہ ساری باتیں وہ وہیں کھڑے کھڑے سوچ گئی۔ پھر اِدھر اُدھر سب کو متوجہ دیکھ کر زور سے اپنے سر پر دھپ لگائی۔

آریان، احمد، مریم اکٹھے بیٹھے پارسا کا انتظار کر رہے تھے۔ آریان نے احمد کو دیکھا جو کچھ کہہ رہا تھا "یار! یہ پارسا چوہدری بھی ناں اپنی جگہ ایک وکھرا ہی نمونہ ہے۔ بہت ہی ڈل پرسنلیٹی کی مالک بڑا سا دوپٹہ لپیٹے، آنکھوں میں ڈھیروں کا جل اٹھ لیے، تیل سے چپڑے بال، بالکل ہی سائیکو کیس ہے"۔ عائشہ نے بغور اُسے دیکھا اور بولی، "اُس کی شخصیت کے لیے اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ تم نے اُس کی شخصیت کو بغور جج کیا۔ اگر وہ اپنی شخصیت میں ویسی نہیں جیسی تم دیکھنا چاہتے ہو تو وہ اُس کی نہیں تمہاری غلطی ہے احمد۔ ویسے بھی وہ بہت پرخلوص اور گریس فل ہے"۔ عائشہ نے کافی تیکھے جواب سے احمد کو نوازا تھا۔ اُس کا منہ بن گیا اور آریان یہ دیکھ کر مسکرا دیا۔ اگلے لمحے اُسے بے تحاشا حیرت نے گھیر لیا۔ کالج کے احاطے میں پارسا چوہدری مجسمہ بنی کھڑی بغور اُس کی طرف دیکھتی ساکت کھڑی تھی۔ بغیر پلکیں جھپکائے بہت سے طلباء اس کے سامنے ہاتھ ہلاتے گزر گئے مگر وہ ساکت کھڑی تھی۔

پارسا نے بیگ پر گرفت مضبوط کی اور اُن کی طرف تیزی سے بڑھ آئی۔ اسی جھونک میں پلاٹ کی طرف آتے ہوئے اُس کی نظریں پودوں کو پانی دینے کے لیے رکھے پائپ پر نہ پڑیں۔ نتیجہ سامنے تھا۔ آریان، احمد کی بات کا جواب دے رہا تھا چونک کر مڑا اُس کی نظر لنگڑا کر اپنی طرف آتی پارسا پر پڑی۔ مٹی سے لت پت ہاتھ، ماتھے پر ایک ننھا سا پھوڑا، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ کمر پر ہاتھ رکھے وہ اذیت سے دوچار تھی۔ عائشہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُسے سنبھالا کہ کہیں وہ زمین پر ڈھیر ہی نہ ہو جائے۔ "پارسا! انسان چلتے وقت اِدھر اُدھر بھی دیکھ ہی لیتا ہے کیا تم نیند میں چل رہی تھیں؟" پارسا کو غصہ آرہا تھا" مجھے کیا پتا تھا میرے خلاف کسی نے قتل کی سازش کر رکھی ہوگی" بھیگی پلکوں پر آنسوؤں کی بارش عجب نظارہ پیش کر رہی تھی۔ یہ اُن کا پہلا دن تھا۔ اسی طرح وقت کے کشکول میں دنوں، مہینوں کے سکے گرتے رہے۔ وہ چاروں گہرے دوست بن گئے۔ مگر پھر بھی ان امیر زادوں میں اسے اپنا وجود بہت ہلکا پڑتا محسوس ہوتا۔ اگر اس کے گھر والوں کی طرف سے اعتماد کی دولت مہیا نہ ہوتی تو وہ کبھی یہاں تک نہ پہنچ پاتی۔ آج کالج میں ایک سالانہ تقریب تھی۔ پارسا نے گہرے رنگ کا سرخ چوڑی دار پاجامہ زیب تن کر رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا ارد گرد اُڑتی تتلیوں کے رنگ پارسا کے ساتھ چپٹ گئے ہوں۔ وہ عائشہ کے ساتھ کتابوں کے سٹال کے پاس کھڑی تھی۔ جب عائشہ بولی "پارسا! آج میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ میں اور آریان کزن ہیں مگر پچھلے ہفتے یہ رشتہ بدل گیا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی کے

ساتھی بننے والے ہیں۔ میں بہت خوش ہوں"۔ اُس نے خوشی سے پارسا کو بھی گھما ڈالا۔ اپنی خوشی میں وہ پارسا کے پھیکے پڑتے چہرے کو نہ دیکھ پائی تھی۔ پارسا کے اردگرد کی چیزیں گھوم رہی تھیں۔ وہ ساکت کھڑی تھی آج زندگی اتنی بُری کیوں لگ رہی تھی؟؟

کیا آریان اُسے دھوکا دے رہا تھا؟

یا وہ خود ایک دن دیکھے جال، ذومعنی فقروں، شوخ نظروں کے سحر کا شکار ہوئی تھی؟

سر پہ آسمان ٹوٹنا اور زمین میں زندہ دفن ہونا کیسا لگتا تھا یہ پارسا چوہدری سے زیادہ کوئی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا۔ زندگی سدوپ کی رانی ہے یہ راز تو آج کھلا تھا۔ اُس کی پہلے نظریں عائشہ پہ پڑیں اور پھر آریان پہ..... درد کرب بن کر آنکھوں میں سمٹ آیا۔ تبھی وہ عائشہ سے آنسو چھپاتی پلٹ آئی۔ جاتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رُک گئی۔ وہ بلاشبہ آریان تھا جو اس کی طرف پشت کیے مخالف گروپ کے لڑکوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا اور اس کے الفاظ پگھلا ہوا سیسہ بن کر پارسا کے وجود کو جُھلس جُھلس کیے دے رہے تھے۔ وہ ہنسا تھا "ارے وہ پارسا! بڑی نیک پروین بنی تھی آخر پھنس ہی گئی میرے جال میں اور یار یہ مڈل کلاس گھرانے کی لڑکیاں ہوتی ہی ایسی ہیں ہر کسی پر ڈورے ڈالنے والی"۔

ایک ایک کر کے سارے تیر پارسا کے جسم کے آر پار ہو رہے تھے۔ حیرت تھی کہ وہ اب بھی زندگی سے خوش فہمی کا لباس اوڑھے کھڑی تھی۔ اس نے سنا وہ احمد کے سوال کے جواب میں کچھ کہہ رہا تھا۔ "ارے نہیں! وہ میرے لیے جان بھی دے سکتی ہے۔ میرے بغیر خودکشی کر لے گی۔ ہا۔ ہا۔ ہا"۔

موت سے بھی بہت بڑے درد ہوتے ہیں یہ پارسا کو اب اندازہ ہوا۔ آریان کے منہ سے نکلے ہوئے اگلے جملوں نے اُسے زندہ درگور کر دیا۔ "اور آج میں اور پارسا ڈیٹ پر جا رہے ہیں..... میں اُس کو اپنے سامنے جھکانا چاہتا ہوں"۔

پھر وہ اُن میں سے کسی کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ وہ ٹوٹے قدموں سے جس طرح گھر آئی تھی صرف اُسے ہی پتا تھا۔ زندگی میں بہت بار زندگی ایسے موڑ پر رُک جاتی ہے جہاں ساکت ہونا پڑتا ہے۔ سارا وجود محبت کے آکٹوپس میں جکڑا ہوا لگتا ہے مگر جب محبت میں تذلیل ہونے لگتی ہے۔ تب دھیرے دھیرے محبت کا جال کمزور پڑنے لگتا ہے اور ایک لفظ وجود کو سہارا دینے لگتا ہے اور وہ لفظ "انا" ہوتا ہے۔ پارسا کو پتا تھا کہ اب اُسے ہر حال میں اپنی "عزتِ نفس" کو بچانا ہے۔

آریان اور پارسا پلاٹ کے سبز قطع میں بیٹھے تھے۔ عائشہ اور احمد لائبریری گئے ہوئے تھے۔ آریان کو اس کی خاموشی سے اُلجھن ہوئی "کیا آج ہم آؤٹنگ پر جائیں گے؟"

"بالکل نہیں" پارسا کے لہجے میں ٹھنڈک تھی۔

"یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا؟؟" تشویش نمایاں تھی۔

"کسی کو اچانک کچھ نہیں ہوتا بلکہ کسی کے بدل جانے سے کچھ ہوتا ہے"۔

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں.....؟"

"میں تمہاری حقیقت جان چکی ہوں" پارسا کا لہجہ خوفناک تھا۔

"کونسی حقیقت.....؟" اس لمحے آریان کو اُس سے خوف آیا۔

"پتا ہے آریان! کالج کے پہلے دن میرے بابا نے مجھے کیا کہا تھا؟" پارسا نے سوال کیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو زمین میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ چپ تھا۔ پارسا نے اُسے جھنجھوڑ دیا۔

"میرے بابا نے کہا تھا بیٹا! یہ کالج ایک ست

رنگی دنیا ہے اس کا حصہ نہ بن جانا۔ میری عزت کا پاس رکھنا۔ ہم غریبوں کے پاس عزت کی دولت کے سوا اور کچھ بھی قیمتی نہیں ہے"۔ وہ رو رہی تھی۔ بے تحاشا۔ کسی باربی ڈول کی طرح۔

"اور تم آریان زیدی ......" اُس نے نفرت بھری نظریں اُس پر جمائیں" تم نے مجھ سے اُسی دولت کو چھیننا چاہا۔ تم جانتے تھے کہ میری موجودگی میں تم لیٹ ڈاؤن ہو کر رہ جاؤ گے۔ اس لیے تم نے مجھے بھٹکانا چاہا تھا۔ تمہیں میری ذہانت سے خطرہ تھا"۔ وہ چپ بیٹھا رہا ...... وہ سچ کہہ رہی تھی ......واقعی ایسا تھا ......اب وہ زمین سے مٹی اُٹھا رہی تھی ......اُس نے مٹی کو ہتھیلی پر رکھا اور ہلکی سی پھونک سے اُڑا دیا جیسے محبت کے وجود کو اُڑا رہی ہو...... پھر وہ ہنسی ......بارش برسنے لگی...... وہ دونوں بھیگنے لگے...... وہ پھر تالی مار کر ہنسی" کیا میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی؟ خودکشی کر لوں گی"۔

"نہیں کبھی نہیں ......میں زندہ رہوں گی ...... مجھے موت سے خوف آتا ہے" وہ رونے لگی تڑپ تڑپ کر...... جیسے سارا درد وجود میں سمٹ آیا ہو۔ "مجھے موت سے ڈر لگتا ہے مگر اب مجھے زندگی سے بھی بہت ڈر لگتا ہے"۔ اُس نے دُھندلی آنکھوں کے ساتھ آریان کو دیکھنے کی کوشش کی وہ جا رہا تھا۔ وہ اُس کا "حاصل" تھا۔ نہیں وہ حاصل نہیں کاذب تھا۔ وہ اُٹھی مگر اپنا بیگ وہیں چھوڑ گئی۔ بارش برس رہی تھی۔ وہ کالج کا گیٹ پار کر رہی تھی۔ چوکیدار اُس سے کچھ کہہ رہا تھا وہ چپ چاپ چل رہی تھی۔ تبھی تیز بارش کے ساتھ ساتھ اولے بھی پڑنے لگے۔ اُس کے سر میں دھماکے ہونے لگے۔ اس کے سر سے چادر اُڑ گئی۔ وہ پکڑنے کو دوڑی۔ وہ اپنے "بابا" کی عزت بچا رہی تھی۔ پاؤں ...... تو

کی قید سے آزاد ہو چکے تھے۔ پیروں میں کنکر چبھنے لگے۔ سرخ اور گاڑھا خون سڑک پر پھیلا ہوا تھا۔ بجلی کی چمکتی روشنی میں راستہ واضح نظر آ رہا تھا پھر اُس نے چادر پکڑ لی۔ وہ مسکرائی اماں کہتی تھیں" چادر عورت کی عزت ہے اسے تیز ہواؤں کے حوالے نہ کرنا"۔

اسے ٹھوکر لگی...... ناک سے سرخ رنگ کی کوئی چیز بہنے لگی۔ اُس نے ناک پر ہاتھ رکھا۔ خون ہاتھوں کی لکیروں میں جم گیا اُسے خوف آیا۔

پھر وہ گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ مریم نے دروازہ کھولا۔ اُس کو ایسی حالت میں دیکھ کر چیخ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ سو گئی گہری نیند۔ وہ بہت حساس تھی۔ پھر وہ صبح کے اُجالے کے ساتھ ہی زندگی چھوڑ گئی کیونکہ اُسے تو زندگی بُری لگتی تھی۔ مگر اس نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ صبح نماز کے وقت سجدے میں پڑے پڑے اُس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا تھا۔ لوگوں کا پتا نہیں مگر وہ خدا کو راضی کر چکی تھی کہتے ہیں ناں کہ" رب راضی تو سب راضی"۔

تھوڑا سا آسماں دے دو......!
میری خالی ہتھیلی ہے......!
میری آنکھوں میں آنسو ہیں......!
میرے آنسو میں سپنے ہیں......!
میرے سپنوں میں زندگی ہے......!
تھوڑا سا آسمان دے دو......!
کہ میرا دل سنبھل جائے......!
میرے آنسو رُک جائیں......!
وعدہ کرو...... جب بھی
موقع ملے گا......!
تھوڑا سا آسماں دو گے......!!

آخری موقعہ......!

تحریر: او سائیزی
ترجمہ: ایس۔ امتیاز احمد

اُس شخص کی کہانی جو آرٹ کا دل دادہ تھا
اور پتھر کا دل رکھتا تھا..........!!
(سمندر پار سے)

مسٹر اسمتھ درمیانے جسم کے پستہ قد آدمی تھے، وہ آنکھوں پر عینک لگاتے اور مانگ پیشانی کے درمیان سے نکالتے تھے۔ اُن کے کافی بال سفید ہو گئے تھے۔ دوسروں کو یہ بتا کے انہیں بہت مسرت ہوتی تھی کہ "دنیا میں قسمت نام کی کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔ زندگی ایک مربوط لائحہ عمل کے تحت چلتی ہے، اس میں اتفاقات کی کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ اس لیے جب اُن کے سامنے اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا مسئلہ آیا تو انہیں

ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کام کے کئی مناسب اور معقول طریقے موجود ہیں جن پر اُن سے پہلے بہت سے مظلوم شوہر کامیابی سے عمل کر چکے ہیں۔ سوال صرف اُن طریقوں سے واقفیت حاصل کرنے کا تھا اور انہیں واقفیت حاصل کرنے کا طریقہ بھی معلوم تھا۔

انہوں نے ایک پرانی کتاب خریدی جو خطرناک اموات کے موضوع پر تھی۔ یہ کتاب منتخب کرنے کی اس کے سوا کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس کی ظاہری حالت دوسری کتابوں سے قدرے بہتر تھی۔ کتاب کے مطالعے سے انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ یہ دنیا دیوانے اور جنونی قاتلوں سے بھری پڑی ہے۔ ایسے ایسے فرشتہ صورت انسان اندر سے درندے ہوتے ہیں جن کی پاک بازی اور بے داغ کردار کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں۔ خوش قسمتی سے اس کتاب میں جگہ جگہ نقشے بھی تھے اور تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں۔ اس میں جرائم کے طریقوں اور ان کے نتائج پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی۔

بیشتر طریقے بہت ہولناک تھے جنہیں پڑھ کر ہی مسٹر اسمتھ کو جھرجھری آجاتی تھی۔ کچھ طریقے احمقانہ تھے۔ البتہ اس میں ایک واقعہ ایسا تھا جو مسٹر اسمتھ کی فطرت سے میل کھاتا تھا۔ انہیں اسی قسم کے کسی طریقے کی تلاش تھی۔ انہوں نے بار بار بہت غور سے اس واقعے کا ایک ایک لفظ پڑھا۔ واقعے میں مقتولہ کا اصل نام پوشیدہ رکھتے ہوئے اسے مسز ایکس کے نام سے یاد کیا گیا تھا۔ پوری کتاب مسز ایکس مسٹر وائی اور مسٹر زیڈ کے ناموں سے بھری ہوئی تھی۔ مسز ایکس اپنے گھر میں فرش پر بچھی ہوئی ایک اونی دری سے پھسل کر گر گئی تھی اور اس کی موت واقع ہو گئی۔ وہ اپنے شوہر کے لیے ایک گلاس میں پانی لا رہی تھی کہ اونی دری سے اس کا پیر پھسلا، وہ پھسلتی ہوئی نیچے گری اور گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے فوراً ہلاک ہو گئی۔ مرحومہ کا ایک وکیل تھا جو اس

کی جائیداد اور سرمائے کی نگہداشت کرتا تھا۔ وکیل مرحومہ کے شوہر کو پسند نہیں کرتا تھا اس لیے اپنی موکلہ کی وفات پر اس نے خاموشی سے ساری جائیداد اور دولت اس کے شوہر کے حوالے نہیں کی بلکہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پسند کیا اور مرحومہ کے شوہر پر اسے قتل کرنے کا الزام لگایا۔ عدالتی کارروائی کے دوران جب وکیل یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مرحومہ کی موت حادثاتی نہیں تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے تو مرحومہ کے شوہر کا بھی حرکت قلب بند ہونے سے اچانک انتقال ہو گیا۔

مسٹر اسمتھ کو اس واقعے میں اس لیے بھی دلچسپی محسوس ہوئی کہ مسز ایکس کے شوہر کا مقصد اپنی بیوی کی جائیداد اور دولت پر قبضہ کرنا اور اسے اپنے تصرف میں لانا تھا۔ یہی مقصد مسٹر اسمتھ کا بھی تھا۔ اس واقعے کی تفصیلات بہت اہم تھی۔ مسز ایکس کے شوہر کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کی بیوی کی موت محض ایک حادثہ تھی۔ اس کے جواب میں مرحومہ کے وکیل نے ایک ایسے ماہر کو عدالت میں پیش کیا جس نے مختلف نقشوں اور تصویروں کی مدد سے یہ ثابت کیا کہ مرحومہ کے شوہر کے لیے یہ بات بہت آسان تھی کہ وہ بیوی سے پانی کا گلاس لینے کے بہانے، اپنا ایک ہاتھ اس کی پشت پر کاندھوں کے قریب مضبوطی سے رکھتا اور دوسرا ہاتھ بیوی کی تھوڑی کے نیچے رکھ کر اچانک ایک زور کا جھٹکا دیتا اور اس طرح بیوی کی گردن توڑ دیتا۔ اس طریقے پر عمل کرنے سے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی ظاہر کرتی کہ مرحومہ کی موت اونی دری پر پھسلنے اور فرش پر گرنے سے واقع ہوئی ہے۔

کتاب میں وہ تمام نقشے اور خاکے بھی شائع کیے گئے تھے جنہیں عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ گردن توڑنے کے عمل کی مختلف زاویوں سے وضاحت کی گئی تھی۔ مسٹر اسمتھ نے پوری توجہ اور [illegible] ان خاکوں کا مطالعہ کیا اور انہیں اچھی

طرح ذہن نشین کرلیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مسٹر اسمتھ لالچی تھے اور حرص و طمع کے ہاتھوں مجبور ہو کر بیوی کی دولت ہتھیانا چاہتے تھے۔ نہیں انہیں دراصل ایک ایسے کام کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی جو ان کی نظر میں بے حد مقدس تھا۔ انہیں اپنی دکان میں پیسہ لگانا تھا۔ ان کی دکان میں نوادر اور عجیب وغریب اشیاء فروخت کی جاتی تھیں۔

یہ دکان مسٹر اسمتھ کی کائنات میں سورج کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسے انہوں نے بیس سال قبل اپنے والد کا ترکہ ملنے پر خریدا تھا۔ جن دنوں کاروبار خوب چلتا تھا، اُن دنوں بھی اس دکان سے صرف اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ وہ کفایت شعاری سے اپنے اخراجات پورے کرلیں، عام طور پر اخراجات کے لیے انہیں اپنی والدہ سے قرض لینا پڑتا تھا۔ ان کی والدہ کچھ زیادہ ہی کفایت شعار واقع ہوئی تھیں اس لیے دکان اور اس کی آمدنی ہی ان دونوں کے درمیان ہونے والے تمام جھگڑوں کا موضوع ہوتی تھی۔ ان تمام جھگڑوں میں فتح آخر دکان ہی کی ہوتی کیوں کہ مسٹر اسمتھ کو جتنی محبت اپنی دکان اور کاروبار سے تھی، اتنی ہی والدہ کو اُن سے تھی۔ والدہ کی وفات پر یہ تکون ٹوٹ گئی اور پہلی بار مسٹر اسمتھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ان کی زندگی میں والدہ کا بہت عمل دخل تھا وہ صرف ان کے اخراجات ہی پورے نہیں کرتی تھیں بلکہ ان کی تمام عادات بھی والدہ ہی کی مرہون منت تھیں۔ وہ بہت ہلکی غذا کھانے کے عادی ہو گئے تھے کیوں کہ ان کی والدہ سبزیاں اور گوشت اُبالنے کی ماہر تھیں۔ ان کا معدہ تلی ہوئی یا بھنی ہوئی چیزیں قبول کرنے کا اہل نہیں رہا تھا۔ گھر میں کوئی چیز جگہ سے ہٹی ہوئی نظر آتی تو ان کے سر میں درد ہونے لگتا تھا کیونکہ وہ ہر چیز قرینے سے ایک جگہ دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ ان کی زندگی کے معمولات بنے تلے تھے اس لیے والدہ ... نے ان کی زندگی میں ایک ... تکلیف دہ خلا پیدا کردیا۔ وہ یہ خلا پُر کرنے کی ترکیبوں پر غور کرنے لگے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اب انہیں شادی کرنی ہی پڑے گی۔

ان کی بیوی کی رنگت زرد تھی اور ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ وہ ان کی ماں سے اس قدر مشابہ تھی کہ کبھی کبھی جب وہ خالی الذہن ہوتے اور بیوی کمرے میں داخل ہوتی تو وہ بُری طرح چونک جاتے تھے۔ البتہ ایک پہلو سے ان کی بیوی والدہ سے مختلف تھی۔ وہ بے چاری دکان کا ان کی زندگی سے گہرا تعلق نہیں سمجھ سکی، نہ وہ اس معاملے میں ان کے جذبات کا اندازہ لگا سکی۔ اس اذیت ناک حقیقت کا علم مسٹر اسمتھ کو اس وقت ہوا جب انہوں نے اپنے کاروبار کے لیے اپنی بیوی سے ایک چھوٹا سا قرض مانگا۔

شادی سے پہلے ان کی بیوی نے مسٹر اسمتھ کے ساتھ شادی کے امکانات پر غور نہیں کیا تھا۔ اس حادثے کا اسے گمان تک نہیں تھا لیکن جب مسٹر اسمتھ نے اس سے شادی کی درخواست کی تو چشمے کے پیچھے چھپی ہوئی بڑی بڑی گہری آنکھوں کی وجہ سے اسے اثبات میں جواب دینا پڑا۔ وہ ان کی آنکھوں سے دھوکا کھا گئی۔ اسے نہ جانے کیوں ان آنکھوں کے پیچھے بپھرے ہوئے جذبات کے طوفان اُمڈتے محسوس ہوئے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بھیڑیا، بھیڑ کی کھال اوڑھے بیٹھا ہو اور موقع ملتے ہی اپنی اصلیت دکھانے کے لیے بیتاب ہو جائے گا لیکن شادی کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کی آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا، اس کے ذہن نے دھوکا کھایا تھا۔ مسٹر اسمتھ بھیڑ کی کھال میں بھیڑ ہی تھے۔ بھیڑیے والے جذبات انہیں چھو کر بھی نہیں گئے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے راکھ میں چنگاریاں تلاش کرنی چھوڑ دیں اور قسمت پر شاکر ہو کر سبزیاں اُبالنے میں جت گئی۔ ... جب مسٹر اسمتھ نے ... کاروبار ... قرض کا مطالبہ کیا تو اس نے

پہلی بار اپنے شوہر کی دکان کے متعلق چھان بین کی اور اسے زبردست ذہنی دھچکا لگا۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کے شوہر کی دکان سیپ کی طرح ہے۔ خوبصورت اور چمک دار لیکن اندر سے کھوکھلی۔ اس مرتبہ اس کا ردعمل پہلے سے مختلف تھا" وہ دکان ہے؟" اس نے اپنے شوہر پر برستے ہوئے کہا "اس میں کباڑ خانے کے سوا کیا دھرا ہے؟ واہیات اور فضول چیزیں جو گاہک نہیں صرف دھول مٹی اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں"۔

مسز اسمتھ یہ بات سمجھنے میں ناکام رہی کہ جو چیزیں تجارتی نقطۂ نظر سے فضول اور بیکار نظر آتی ہیں وہ اس کے شوہر کی کل کائنات کیوں ہیں؟ مسٹر اسمتھ کو کوئی چیز بھی کہیں پڑی ہوئی مل جاتی تھی، وہ اُسے اُٹھاتے صاف کرتے اور سنبھال کر رکھتے تھے، وہ بچپن سے اس کے عادی تھے۔ یہ دکان بچپن کے اس خبط کا نتیجہ تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہر چیز کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ دکان میں ہر چیز کی ایک جگہ تھی، ایک مستقل جگہ۔ جب بھی مسٹر اسمتھ کو کوئی چیز فروخت کرنی پڑتی، انہیں شدید اذیت ہوتی تھی کیوں کہ سالہا سال سے ایک جگہ جو چیز رکھی تھی، فروخت ہونے پر اس کی جگہ خالی ہو جاتی تھی اس اذیت کا احساس ان کے چہرے سے بھی ہوتا تھا۔ بعض اوقات گاہک اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے تھے کہ شاید انہوں نے مطلوبہ چیز بے حد سستی خرید لی ہے یا دکان دار غلطی سے کم قیمت بتا گیا ہے۔ مسز اسمتھ بھی ان حقائق سے بے خبر تھی اسی لیے اس نے قرض کے معاملے میں بے دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا" جب تک میں زندہ ہوں اسمتھ تمہیں اس کباڑ خانے کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا، سمجھ گئے"۔

اس طرح مسز اسمتھ نے نادانستگی میں خود اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے۔ جب وقت آیا تو مسٹر اسمتھ نے کسی [illegible] ہدایت نامے [illegible] طرح کتاب [illegible]

خاکوں کے مطابق اپنا سبق دہرایا اور انہیں یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ وہ اپنی بیوی کی گردن توڑنے میں بہت آسانی سے کامیاب ہو گئے تھے۔ زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی کہ مرحومہ کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ سارا کام کسی شور شرابے کے بغیر لمحوں میں انجام پا گیا تھا۔ البتہ ان کی پتلون پانی سے گیلی ہو گئی تھی اور گلاس فرش پر گر کے ٹوٹ گیا تھا۔

پولیس کے محکمے میں شاید کسی نے اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا اس لیے کسی نے بھی ان سے کوئی سوال نہیں کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اسے مرحومہ کی موت پر قتل کا شبہ ہے۔ اس کے برعکس پولیس کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ چند روز بعد تو خود مسٹر اسمتھ کو بھی یہ احساس ہونے لگا کہ شاید ان کی بیوی کی موت محض حادثاتی تھی جس میں ان کے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ شاید وہ اس مفروضے پر دل سے یقین کر لیتے لیکن جب ایک ہفتے بعد مرحومہ کے وکیل نے انہیں مرحومہ کی جائیداد اور نقد رقم کی تفصیلات مہیا کی تو مسٹر اسمتھ پر اچانک اپنی محنت کے پھل کا انکشاف ہوا۔ یہ سوچ کر ان کا سینہ فخر سے پھول گیا کہ یہ سب کچھ انہیں مفت نہیں مل رہا ہے بلکہ ان کی ذہانت پھرتی اور اعلیٰ کارکردگی کے باعث مل رہا ہے۔

بسا اوقات جذبات پر مصلحت کو ترجیح دینی پڑتی ہے۔ مسٹر اسمتھ بہرحال ایک دُور اندیش آدمی تھے۔ اپنی بیوی کی جائیداد وغیرہ فروخت کرنے کے بعد انہوں نے اپنی دکان بیچ دی اور ریاست کے دوسرے حصے میں منتقل ہو گئے۔ وہاں انہیں اپنی پسند کی ایک اور دکان مل گئی۔ اس کے بعد دوسری بیوی کی اچانک وفات پر انہیں ایک بار پھر دکان تبدیل کرنی پڑی۔ اسی طرح چوتھی بیوی کی حادثاتی موت تک دکان تبدیل کرنا ان کا معمول بن چکا تھا۔

چوں کہ مسٹر اسمتھ کی [illegible] بیویاں ایک جیسی تھیں [illegible] انہیں [illegible] علیحدہ [illegible] رکھنا ان کے لیے بہت

مشکل تھا۔ وہ سب زرد رنگت اور پچکے پچکے ہونٹوں والی عورتیں تھیں۔ وہ سب سبزیاں اُبال لینے میں ماہر تھیں اور اپنے معمولات پر سختی سے عمل کرتی تھیں۔ مسٹر اسمتھ اپنی بیویوں کو رقم کے ہندسوں سے یاد کرتے تھے۔ ہر بیوی نے اپنی وفات پر ان کے لیے بینک میں رقم چھوڑی تھی، پہلی دو بیویوں کی رقم چار ہندسوں پر مشتمل تھی، تیسری بیوی کی رقم تین ہندسوں پر اور چوتھی بیوی کی رقم پانچ ہندسوں پر مشتمل تھی۔ تمام بیویوں کا مجموعی ترکہ کسی دوسرے شوہر کے لیے اتنا بڑا اثاثہ ہوسکتا تھا کہ وہ کوئی کام کیے بغیر پوری زندگی بسر کرسکتا تھا لیکن مسٹر اسمتھ کا ہر ترکہ ان کی دکان اس طرح ہڑپ کرگئی جس طرح بھوکی چھپکلی دیوار پر بیٹھی مکھی ہڑپ کر جاتی ہے۔ چوتھی بیوی کی موت سے کچھ عرصے بعد مسٹر اسمتھ نے خود کو پھر معاشی بدحالی کی دلدل میں دھنستا محسوس کیا۔ وہ پریشان ہوگئے حالانکہ انھوں نے تہیہ کیا تھا وہ اس بار خوب دیکھ بھال کے اور پانچویں بیوی کی معاشی حالت کے متعلق پورا اطمینان کرکے شادی کریں گے اور ایسی کوئی بیوی قبول نہیں کریں گے جس کا بینک اکاؤنٹ پانچ ہندسوں سے کم ہو لیکن وہ اپنی معاشی پریشانیوں سے اتنے مجبور ہوگئے کہ انھوں نے فوری طور پر کوئی ایسی بیوی ہی قبول کرنے کا ارادہ کیا جس کا اکاؤنٹ صرف چار ہندسوں پر مشتمل ہو۔ زندگی کے اس نازک مرحلے پر مارتھا ایک سورج کی طرح ان کی زندگی میں داخل ہوئی۔ اس سے چند منٹ کی گفتگو کے بعد انھوں نے چار اور پانچ ہندسوں کا خیال ذہن سے نکال دیا کیونکہ مارتھا کا بینک اکاؤنٹ انھیں چھ ہندسوں پر مشتمل نظر آیا۔

مارتھا نہ صرف دولت کے اعتبار سے مسٹر اسمتھ کی گزشتہ بیویوں پر فوقیت رکھتی تھی بلکہ جسمانی طور پر بھی ان سے مختلف تھی۔ وہ دوسری بیویوں کے برعکس دراز قد اور پھیلی ہوئی تھی۔ جسمانی نشیب و فراز بڑی حد تک چھپی ہوئی تھیں۔ [illegible] زیر پوش ہو گئے تھے [illegible]

اپنے حلیے اور لباس سے ایک بے پروا عورت نظر آتی تھی اور رنگوں کے معاملے میں خاصی بدذوق تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ تیز نارنجی تھا جو بے پروائی کی وجہ سے اس کے سر پر ایک گھونسلے کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر جگہ جگہ پاؤڈر تھپا ہوا تھا اور لپ اسٹک کا رنگ اس کی رنگت سے قطعاً میل نہیں کھاتا تھا۔ لباس ڈھیلا ڈھالا اور انتہائی بیہودہ رنگ کا تھا۔ تراش خراش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جوتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ بہت آرام دہ ہیں اور انھیں ایک لمبی مدت سے استعمال کیا جارہا ہے لیکن ان کی نگہداشت صحیح طریقے سے نہیں کی جاتی۔

مارتھا اس امر سے لاعلم اور بے تعلق نظر آتی تھی کہ دوسروں پر اس کی شخصیت کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ وہ ٹہلتی ہوئی مسٹر اسمتھ کی دکان میں داخل ہوئی تھی لیکن داخل ہونے کا انداز زلزلے کے مانند تھا۔ دکان میں رکھی ہوئی چھوٹی موٹی چیزیں رقص کرنے لگی تھیں۔ وہ مسلسل سگریٹ پیے جارہی تھی۔ ایک سگریٹ ختم ہوتی تو وہ اسی سے دوسری سگریٹ سلگا لیتی۔ جلد ہی مسٹر اسمتھ کی دکان دھوئیں سے بھر گئی اور انھیں پنکھے سے اپنے سامنے کا دھواں ہٹانا پڑتا تاکہ وہ اپنی گاہک کی حرکات و سکنات واضح طور پر دیکھ سکیں۔

مسٹر اسمتھ پنکھا جھلتے ہوئے مخفی تیز انداز میں بار بار کھانستے رہے لیکن مارتھا نے یہ دونوں حرکات نظر انداز کردیں۔ اس کی آواز گھوڑے کی طرح تھی اور وہ مسلسل تمباکو نوشی کے ساتھ مسلسل بول بھی رہی تھی اور دکان میں رکھی ہوئی ایک ایک چیز کا معائنہ کر رہی تھی۔ وہ کسی چیز کی قیمت دریافت کرتی خود اس کی قیمت کا اندازہ لگاتی اور مسٹر اسمتھ پر جرح کرنے کے بعد آگے بڑھ کے کوئی دوسری چیز اٹھا لیتی۔ مسٹر اسمتھ پنکھے سے دھواں ایک طرف کرتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے [illegible] منٹ پر انھیں [illegible] کہ [illegible] زلزلہ نما عورت کو اپنی دکان

سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور ان کا مال بھی محفوظ رہے گا۔ چودھویں منٹ پر مارتھا نے وہ تاریخی جملہ کہا جس نے مسٹر اسمتھ کی پوری زندگی بدل دی "میرے پاس بینک میں پانچ لاکھ ڈالر پڑے ہیں" پھر مسٹر اسمتھ کو جلانے والے انداز میں بولی "لیکن اس کباڑ خانے پر میں ایک پیسہ بھی خرچ کرنا گوارا نہیں کروں گی"۔

مسٹر اسمتھ کا پنکھے والا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا۔ پھر انہیں اس کے نیچے کرنے کا احساس بھی نہیں ہوسکا کیونکہ ان کا ذہن تیزی سے کئی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا۔ ایک اہم مسئلہ مارتھا کے ہاتھوں کی انگلیاں تھیں جن میں کوئی انگوٹھی نظر نہیں آرہی تھی دوسرے مسئلے ذاتی نوعیت کے تھے، جن میں قرضوں اور سود کے معاملات شامل تھے۔ مسٹر اسمتھ کے تمام ذاتی مسائل چونکہ چند لمحوں میں حل ہو گئے۔ انہوں نے مارتھا کو پہلی بار بہت غور سے دیکھا۔ اس میں انہیں عورتوں والی کوئی چیز نظر نہیں آئی لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ مارتھا سے شادی کا مسئلہ جذبات سے نہیں حساب کتاب سے متعلق تھا۔

انہوں نے اپنی بڑی بڑی گہری آنکھیں مارتھا کے چہرے پر جمائے ہوئے کہا "مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا مسز......"۔

مارتھا نے انہیں اپنا پورا نام بتایا اور ان کی یہ غلط فہمی دور کی کہ وہ شادی شدہ ہے "او معاف کیجئے گا مس"۔ مسٹر اسمتھ نے معذرت کے لہجے میں کہا "جیسا کہ میں کہہ رہا تھا، مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ آپ جیسی تعلیم یافتہ اور مہذب لڑکی کو آرٹ کے اعلیٰ نمونوں سے مسرت حاصل کرنے کا تجربہ نہیں ہوا لیکن خیر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے انسان عمر کے کسی بھی حصے میں کچھ سیکھ سکتا ہے کیا میں نے غلط کہا مس؟"۔

مارتھا چند لمحوں تک تیز نظروں سے انہیں چھبتے گھورتی رہی پھر پوسکا [illegible] ایک شاف [illegible]

قہقہوں سے لرزنے لگی۔ مسٹر اسمتھ حیرانی سے اس کی صورت دیکھتے رہے، ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہوں نے ایسا کون سا لطیفہ سنا دیا ہے جس پر اسے اتنی ہنسی آرہی ہے۔

"مسٹر دکان دار" مارتھا نے قہقہے روکتے ہوئے کہا "میں یہاں اپنی ایک سہیلی کے لیے کوئی تحفہ خریدنے آئی ہوں، آرٹ پر لیکچر سننے نہیں آئی، اپنی جس سہیلی کے لیے مجھے تحفہ خریدنا ہے وہ ایک بیہودہ اور فولاد کی طرح ٹھس عورت ہے۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں اور اسی جذبے کا اظہار کرنے کے لیے آپ کی دکان سے کوئی چیز خریدنا چاہتی ہوں۔ اندر داخل ہو کر مجھے احساس ہوا کہ یہاں کی کوئی بھی چیز میرا مقصد پورا کردے گی۔ کئی روز کی مسلسل تلاش کے بعد آج مجھے اپنے مطلب کی دکان نظر آئی ہے۔ اگر آپ میرا خریدا ہوا تحفہ میری سہیلی کے مکان پر پہنچانے کا بندوبست بھی کردیں تو میں آپ کی شکرگزار ہوں گی کیونکہ میں وہاں اپنی موجودگی میں اس تحفے کا پیکٹ کھولتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں تحفہ دیکھ کر اس کا جو ردعمل ہوگا، اس سے پورا لطف اٹھانا چاہتی ہوں"۔

مارتھا کا ہر جملہ ان کے سینے میں گولی کی طرح پیوست ہو رہا تھا۔ اگر وہ کوئی عام خریدار ہوتی تو مسٹر اسمتھ اسے کھڑے کھڑے دکان سے نکال دیتے لیکن مارتھا سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی، غصے کی شدت سے ان کا برا حال تھا مگر وہ ضبط کیے رہے "مس! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اپنی کوئی چیز فروخت نہیں کرسکتا چاہے آپ دس گنا قیمت ادا کریں"۔

مارتھا کا بھاری بھرکم جبڑا لٹک گیا "کیا؟ کیا کہا آپ نے؟"۔

مسٹر اسمتھ کو اس کا پوری طرح احساس تھا کہ ان کے یہ کلمات ان کی ساری معاشی زندگی کا فیصلہ کر دیں گے اور اگر انہوں نے کوئی [illegible] جملہ [illegible] دیا تو [illegible] کے [illegible] ہو [illegible]۔ وہ ایک بار پھر

کیا آپ چاہتے ہیں کہ
آپ، آپ کی اولاد، آپ کے بہن بھائی، عزیز واقارب
— جھوٹ بولنے سے باز آجائیں
— تجارت اور ملازمت میں بدعنوانی اور بددیانتی سے باز آجائیں
— اپنے گھر والوں سے حسن سلوک سے پیش آئیں
— زندگی کا ہر لمحہ نیکی اور پارسائی میں گزرے
— تعلیم و تعلم کے شاندار درس ذہن نشین ہوجائیں
— والدین سے وہ سلوک کریں جو خدا پسند کرتا ہے
تو
سیارہ ڈائجسٹ کی شاندار روایت
کے پیش منظر میں پیش کیا جانے والا
دلکش، دلکشا اور زرّیں
اخلاقِ رسول نمبر ۲
مطالعہ کیجئے
احادیثِ رسول کی روشنی میں

ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوسکتی ہے یا پھر جھنجھلاتی ہوئی فوراً دکان سے باہر نکل سکتی ہے۔ دونوں صورتوں میں آئندہ کبھی اس سے ملاقات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی اور اگر ان کا تیر نشانے پر لگ گیا تو بیڑا پار ہوسکتا ہے۔ وہ یہ فیصلہ کن لمحات ٹال نہیں سکتے تھے اور مارتھا کے ردعمل کے متعلق کوئی اندازہ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ بہرحال ایک عورت تھی۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر سکون سے کہا" اس دکان کا یہ اصول ہے مس کہ اگر کوئی خریدار کسی چیز کی قدر وقیمت سے صحیح واقف نہ ہو اور اس چیز کی اتنی محبت اور احتیاط سے نگہداشت نہ کرسکتا ہو جس کی وہ چیز حقدار ہے تو اسے کوئی چیز فروخت نہیں کی جاتی۔ جب تک میں زندہ ہوں اس دکان کا یہی اصول رہے گا۔ اس میں کسی نرمی یا لچک کی توقع فضول ہے"۔

مسٹر اسمتھ مارتھا پر نظریں جمائے غور سے اپنے لفظوں کا ردعمل دیکھ رہے تھے۔ مارتھا کے قریب ایک کرسی رکھی تھی وہ اچانک کرسی پر گر گئی۔ اس نے نئی سگریٹ جلائی اور انکھیوں سے مسٹر اسمتھ کو دیکھتی رہی پھر اس نے کئی گہرے کش لیے اور دھوئیں کے مرغولے ہاتھ سے ایک طرف ہٹائے" بہت خوب مسٹر"۔

"اسمتھ" مسٹر اسمتھ نے جلدی سے کہا۔

"مسٹر اسمتھ! آپ کی باتیں بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہیں، کیا ہم کچھ دیر دوستانہ انداز میں گفتگو نہیں کرسکتے؟"۔

مسٹر اسمتھ نے ایک کرسی گھسیٹی اور اس کے مقابل بیٹھ گئے کسی اجنبی سے اس کے گھریلو راز معلوم کرنا بظاہر بہت مشکل اور ناممکن نظر آتا ہے لیکن مسٹر اسمتھ کے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا کیوں کہ ان کے مستقبل کا انحصار انہی معلومات پر ہوتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد انہیں یقین ہوگیا کہ مارتھا نے اپنی دولت کے متعلق بالکل صحیح بتایا ہے اور بظاہر وہ اس دنیا میں تنہا ہے۔ اس کا کوئی قریبی عزیز یا دوست موجود نہیں ہے، اور...... وہ اب شادی کے خیال سے وحشت نہیں ہوتی۔ یہ آخری نتیجہ انہوں نے مارتھا کی باقاعدہ آمدورفت سے اخذ کیا تھا۔ وہ اب ہر دوسرے تیسرے دن ان کی دکان پر آجاتی تھی اور دونوں آمنے سامنے بیٹھ کے گھنٹوں گفتگو کرتے تھے۔ گفتگو عموماً مارتھا کے مرحوم والد کے متعلق ہوتی تھی۔

وہ تقریباً مسٹر اسمتھ کے ہم شکل تھے" ان کا لباس بھی تمہارے جیسا ہوتا تھا" ایک روز مارتھا نے گفتگو کے دوران کہا" صاف ستھرا بے داغ اور استری کیا ہوا، بس نہیں انہیں صفائی کا خبط تھا، وہ روز پورے گھر کا ایک چکر لگاتے اور دیکھتے کہ ہر چیز قرینے سے اصل جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر کوئی چیز جگہ سے ذرا بھی ہلی ہوئی ملتی تو وہ اسے ٹھیک کر دیتے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وفات سے ایک گھنٹے قبل وہ دیواری تصویروں کے زاویے درست کر رہے تھے"۔

"کیا آپ آخری لمحات میں ان کے قریب تھیں؟" مسٹر اسمتھ نے ہمدردی سے پوچھا۔

"بے شک"۔

"اتنی بڑی قربانی دینے والا انعام کا مستحق ہوتا ہے" مسٹر اسمتھ نے خوش دلی سے کہا" مس مارتھا! میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ جیسی لڑکی اپنے والد کی دیکھ بھال کے لیے چند ملازم بھی رکھ سکتی تھی۔ اس کی یہ قربانی بہت عظیم ہے۔ آپ چاہتیں تو آسانی سے شادی کرکے شوہر کے ساتھ زندگی بسر کر سکتی تھیں لیکن آپ نے اپنے والد پر اپنی خوشیاں قربان کر دیں"۔

مس مارتھا نے ایک گہری سانس لی" شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر اسمتھ اور میں اس سے بھی انکار نہیں کروں گی کہ میں نے بے حد سہانے خواب دیکھے تھے لیکن وہ خواب ہی رہے اور شاید ہمیشہ خواب رہیں"۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے اپنے خوابوں کا شہزادہ آج تک نظر نہیں آیا کوئی مرد میرے معیار پر پورا نہیں اترتا۔

مجھے معلوم ہے کہ مرد مجھ سے زیادہ میری دولت میں کشش محسوس کرتے ہیں اور اب مجھے اس کی پروا بھی نہیں کہ میرا ہونے والا شوہر کس چیز میں زیادہ کشش محسوس کرے گا؟ میرا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ وہ ایک صاف ستھرا' مہذب اور معزز آدمی ہو اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ میرے لیے وقف کردے۔ میرے بارے میں ہر وقت پریشان رہے اور ہر وقت میری دیکھ بھال میں مصروف رہے میرے والد مرحوم کی طرح کہ جب بھی میں اس کی طرف دیکھوں، مجھے اپنے والد یاد آجائیں"۔

مسٹر اسمتھ نے آہستہ سے اپنا ایک ہاتھ مس مارتھا کے کاندھے پر رکھ دیا "ممکن ہے مارتھا! کسی روز تمہیں ایسا مرد نظر آجائے" انہوں نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"کیا واقعی مسٹر اسمتھ؟ آپ کو پورا یقین ہے؟"

"ہوسکتا ہے وہ تمہارے بہت قریب ہو لیکن تم اسے دیکھنا نہ چاہتی ہو"۔ ان کے لہجے میں محبت کی گرمی پیدا ہوگئی تھی۔ مارتھا خاموش رہی، مسٹر اسمتھ کو ان معاملات کا اچھا تجربہ تھا۔ وہ ان لمحات سے پہلے بھی گزر چکے تھے "مس مارتھا!" انہوں نے لوہا گرم دیکھ کے چوٹ لگائی "ہر تنہا مرد پر ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب اس سے مزید تنہائی برداشت نہیں ہوتی اگر اس موقع پر اس کی ملاقات کسی ایسی عورت سے ہو جائے جسے وہ اپنی تمام محبت دے سکتا ہو تو وہ مرد دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان کہلانے کے قابل ہے اور مس مارتھا!...... میں وہی مرد ہوں"۔

مارتھا کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ "اوہ مسٹر اسمتھ! آپ تو بہت اچھے شاعر بھی ہیں لیکن......"۔

اس کے لہجے میں بے یقینی کی کیفیت دیکھتے ہوئے مسٹر اسمتھ کا دل ڈوبنے لگا "ٹھہریے مس مارتھا!" انہوں نے جلدی سے کہا "اگر آپ میرے متعلق شبہات میں مبتلا ہیں [illegible] جب تک ان کا [illegible] کر دیجیے۔ میں آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔ میری جذباتی کیفیت دیکھ کے آپ کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مجھے اس کا حق پہنچتا ہے ورنہ یہ خلش مجھے عمر بھر پریشان کرے گی"۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں" مارتھا نے کہا۔ بات یہ ہے مسٹر اسمتھ کہ میں شادی کرنے پر شادی نہ کرنے کو ترجیح دیتی ہوں۔ شادی کرنے میں ہمیشہ اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ ممکن ہے میرا شوہر میری توقعات پر پورا نہ اترے۔ میں ایسا شوہر چاہتی ہوں جو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ میرے لیے وقف کردے"۔

"مس مارتھا" مسٹر اسمتھ نے گمبھیر لہجے میں کہا "میں دل و جان سے اس کے لیے تیار ہوں"۔

"مرد وعدے تو بڑی آسانی سے کرلیتے ہیں" مارتھا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "لیکن خیر میں سوچوں گی مسٹر اسمتھ!"۔

مارتھا جیسی بے پروا عورت سے جلدی کسی فیصلے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی مگر چند روز بعد اچانک مسٹر اسمتھ کو ایک وکیل کا خط ملا جس میں ان سے دفتر آکے ملاقات کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ مسٹر اسمتھ سمجھے کہ یہ وکیل ان کے کسی قرض خواہ کا نمائندہ ہوگا لیکن جب وہ مقررہ وقت پر اس کے دفتر پہنچے تو انہیں یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی کہ وہ مس مارتھا کا نمائندہ تھا۔ اس فرم میں تین وکیل حصے دار تھے تینوں کی عمروں میں پانچ پانچ سات سات سال کا فرق تھا۔ "یہ بہت نازک معاملہ ہے مسٹر اسمتھ!" سب سے معمر وکیل نے کہا "مس مارتھا ہماری ایک پرانی اور معزز موکلہ ہے۔ انہوں نے آپ سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے"۔

مسٹر اسمتھ کا رواں رواں مسرت سے رقص کرنے لگا۔ "جی...... جی...... جی ہاں" معمر وکیل نے سلسلہ [illegible] ہوئے کہا" انہیں اس کا بھی

احساس ہے کہ ان سے شادی کرنے کے خواہش مند دراصل اُن کی دولت کے خواہش مند ہوتے ہیں لیکن .....'' معمر وکیل نے ہاتھ اُٹھا کر مسٹر اسمتھ کو احتجاج کرنے سے روک دیا ''وہ یہ بات نظر انداز کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ ان سے شادی کا خواہش مند ان کی تمام توقعات پوری کر سکے''۔

''میں اس کے لیے تیار ہوں'' مسٹر اسمتھ نے کہا۔

تینوں وکیل چند لمحوں تک خاموشی سے انہیں گھورتے رہے پھر اچانک معمر وکیل نے کہا ''مسٹر اسمتھ! کیا آپ نے پہلے کوئی شادی کی تھی؟''

اگر وہ انکار کرتے اور بعد میں مارتھا کو ان کی کسی شادی کا علم ہو جاتا تو وہ خوانخواہ ان کی طرف سے مشکوک ہو جاتی۔ موجودہ صورت حال میں شادی کا اعتراف نقصان دہ معلوم نہیں ہوتا تھا چنانچہ مسٹر اسمتھ نے کہہ دیا ''جی ہاں''۔

''طلاق؟''

''اُف..... نہیں جناب!'' مسٹر اسمتھ نے کہا۔

تینوں وکیلوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلائے ''یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی مسٹر اسمتھ!'' معمر وکیل نے کہا۔ ''یہ سوال بظاہر غیر اہم نظر آتا ہے لیکن موجودہ زمانے میں لوگوں کا اخلاق تباہ ہوتا جا رہا ہے......''۔

''میں اس صورت میں یہ بتانا پسند کروں گا جناب کہ جہاں تک میرے اخلاق کا تعلق ہے تو تمبا کو نوشی تک نہیں کرتا، تیز شراب کبھی نہیں پیتا اور..... اور''۔

''بازاری عورتیں؟'' کم عمر وکیل نے لقمہ دیا۔

''جی ہاں'' مسٹر اسمتھ کا چہرہ سرخ ہو گیا ''میں ان کے قریب بھی نہیں جاتا''۔

معمر وکیل نے پسندیدگی کے طور پر اثبات میں سر ہلایا ''مسٹر اسمتھ شادی کے متعلق آخری فیصلہ مس مارتھا ہی کریں گی۔ ان کا [illegible] آپ کو ایک [illegible] مل جائے گا۔ میں [illegible] آپ [illegible] یہ مشورہ دوں گا [illegible]

اس ایک ماہ میں برابر ان سے ملتے رہیں۔ مس مارتھا بہر حال ایک عورت ہیں اور میرا خیال ہے کہ بنیادی طور پر تمام عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں''۔

''جی ہاں'' مسٹر اسمتھ نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''محبت توجہ اور قربت یہ چیزیں کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے مسٹر اسمتھ!'' کم عمر وکیل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

گھر واپس آ کے مسٹر اسمتھ نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ان سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی دکان کو بھول جائیں اور اس کی جگہ مارتھا کی ذات کو دے دیں انہیں معلوم تھا کہ یہ وقتی بات ہے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد جب مارتھا ان کی گزشتہ بیویوں کے نقش قدم پر چلتی ہوئی ان کی زندگی سے رخصت ہو جائے گی تو ایک بار پھر وہ اپنی پوری توجہ دکان کی طرف مرکوز کر سکیں گے۔ دکان سے جدائی کا یہ وقت عارضی ہوگا اور اس قربانی کا انہیں اچھا معاوضہ ملے گا۔ مارتھا ان کی سابقہ بیویوں سے بالکل مختلف تھی اس لیے انہیں اس سے گفتگو میں بڑی احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ کوئی بھی غلط جملہ ان کے منصوبے پر پانی پھیر سکتا تھا۔

''طلاق کے بارے میں میرا نقطہ نظر یہ ہے اسمتھ'' ایک روز مارتھا نے کہا ''کہ جو مرد اپنی ایک بیوی کو طلاق دے سکتا ہے وہ دوسری بیوی کو بھی طلاق دے سکتا ہے۔ آج کل طلاقوں کا عام رواج ہے اگر ہم ان طلاقوں کا بغور مطالعہ کریں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسے مردوں کی حالت ایک خریدار کی سی ہوتی ہے جو بازار میں اپنی پسند کی چیز خریدنے کے لیے مارا مارا پھرتا ہے لیکن اسے یہ تک نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیا چیز پسند کرتا ہے؟ [illegible] کیا خریدنا ہے؟ میں [illegible] مرد [illegible] سے شادی کروں [illegible] مارتھا کی [illegible] اس کا [illegible]۔ قناعت پسند

آدمی ہونا لازمی ہے۔ مجھ سے شادی کر کے اسے ایک گھر بسانا ہوگا اور ہمیشہ اسی گھر میں رہنا پڑے گا"۔

"بے شک، بے شک" مسٹر اسمتھ نے کہا۔

"میں نے سنا ہے" مارتھا نے ایک اور موقع پر کہا "کہ ایک مطمئن شادی شدہ زندگی عورت کی عمر بڑھا دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شادی کے حق میں یہ ایک بہترین دلیل ہے کیوں اسمتھ؟"

"بے شک!"

ایک ماہ کے امتحانی دور میں مسٹر اسمتھ کی گفتگو "بے شک" ہی تک محدود تھی اور ان کی یہ چال کامیاب رہی۔ ایک ماہ بعد ان کی شادی مس مارتھا سے ہوگئی۔ اس شادی کی تقریب میں صرف تین افراد شریک ہوئے اور وہ تینوں ان کی بیوی کے وکیل تھے۔ نکاح کے فوراً بعد انہیں ایک فوٹوگرافر کے سٹوڈیو جانا پڑا اور اپنی مرضی کے خلاف مارتھا کے ساتھ تصویریں کھنچوانی پڑیں۔ اس کے فوراً بعد ان دونوں نے اپنی اپنی وصیتوں پر دستخط کیے جن کی رو سے کسی ایک شریک حیات کے مرنے کی صورت میں دوسرا اس کی تمام جائیداد اور دولت کا وارث قرار پایا۔

شادی کی پُرمسرت تقریب کے دوران مسٹر اسمتھ کو اکثر کچھ سوچتے ہوئے پایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنا پرانا منصوبہ نئے حالات کے تحت تیار کر رہے تھے اور اس کی جزئیات میں تبدیلی کر رہے تھے۔ اب انہیں وہ تاریخی اونی وردی اپنے نئے مکان میں لانی تھی جس نے گزشتہ چار موقعوں پر ان سے وفاداری کا ثبوت دیا تھا پھر ایک روز وہ اپنی بیوی سے پانی کا ایک گلاس طلب کریں گے اور گلاس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بڑی محبت کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ اس کی پشت پر [illegible] کے اور دوسرا ہاتھ [illegible] انہیں اس مبارک موقع [illegible] کا بڑی شدت [illegible]

انتظار تھا کیونکہ قرض خواہوں کے تقاضوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان کے گرد منڈلانے لگے تھے۔ مارتھا کو وصیت نامے پر دستخط کرتے دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں اس عورت کا کام جلدی ہی تمام کرنا ہوگا ایک دفعہ وصیت نامہ ہاتھ میں آنے کے بعد مزید تاخیر کا کوئی جواز باقی نہیں تھا۔ بس چند ہفتے۔

شادی کے فوراً بعد مسٹر اسمتھ کو احساس ہوگیا کہ انہیں اپنے منصوبے پر مقررہ وقت سے پہلے ہی عمل کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنا ان کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ سب سے پہلی بات یہ تھی کہ مارتھا کا مکان جواب ان کا تھا افراتفری اور بدنظمی کا دہشت ناک نمونہ تھا۔ یہ مکان ان کی بیوی کو اپنی ماں سے ورثے میں ملا تھا۔ اس گھر میں غالباً یہ اصول کارفرما تھا کہ اگر کوئی چیز ادھر اُدھر پھینک دی جائے تو اسے دوبارہ اُٹھا کر جگہ پر رکھنا حماقت ہے کیونکہ ایک بار پھر ادھر اُدھر پھینک دیا جائے گا۔ ہر کمرے میں مختلف چیزوں کا ایک انبار جمع تھا کپڑے الماریوں میں بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ باورچی خانے سے تعلق رکھنے والی چیزیں غسل خانے اور غسل خانے کی چیزیں خواب گاہوں میں پڑی رہتی تھیں اور ان سب پر دھول کی ایک باریک تہہ جمی رہتی تھی۔ گھر میں پہلی بار قدم رکھنے پر اُن کا پورا اعصابی نظام ہل کے رہ گیا تھا۔

مارتھا کو کھانے پکانے سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ وہ کھانے کے وقت باورچی خانے سے ڈائننگ ہال تک درجنوں چکر لگاتی اور ہر بار ٹرے میں ایک ایسے کھانے کی پلیٹ لاتی جس کا مسٹر اسمتھ کو کوئی سابقہ تجربہ نہ ہوتا۔ وہ دل ہی [illegible] کے کھانا کھاتے تھے کیونکہ ان کی [illegible] کی طرح ان پر [illegible] ہوتی تھی۔ بلکہ [illegible] محسوس ہوتا تھا کہ انہیں

قربانی کے لیے تیار کیا جارہا ہے۔ شروع شروع میں انہوں نے دبی دبی زبان سے ان کھانوں پر احتجاج بھی کیا تھا مگر مارتھا نے انہیں بتایا کہ وہ اس معاملے میں بے حد جذباتی ہے اور کھانا تو دور کی بات ہے وہ خالی پلیٹ پر بھی کوئی تنقید برداشت نہیں کرسکتی۔ بدہضمی کی وجہ سے اگر ان کے پیٹ میں درد بھی ہوتا تو مارتھا کو ان پر رحم نہ آتا۔ وہ مرغن اور مجرب غذاؤں کی پلیٹیں ان کے سامنے لاکر رکھتی اور پلیٹ صاف ہونے تک ان کی نگرانی کرتی رہتی۔ مسٹر اسمتھ اس آمریت کے خلاف دم نہیں مارتے تھے کیونکہ وہ اس کی موت سے پہلے کوئی جھگڑا مول لینے کا خطرہ برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ ان کا معدہ ابلی ہوئی سبزیوں کے لیے ترستا رہتا تھا لیکن انہیں ناقابل ہضم چیزیں زہر مار کرنا پڑتی تھیں۔ انہوں نے تہیہ کیا کہ وہ جیسے ہی اپنی بیوی کی تدفین سے فارغ ہوں گے سب سے پہلے کسی عمدہ ہوٹل میں گرم گرم چائے اور توس اور آدھے ابلے ہوئے انڈوں کا ناشتہ کریں گے پھر گھر آکر وہ گھر کی صفائی کریں گے۔ کوڑا کرکٹ باہر پھینک دیں گے اور چیز اس کی صحیح جگہ پر رکھیں گے لیکن ان کے اس خواب کی تکمیل منصوبے کی کامیابی سے منسلک تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مارتھا کے تقاضوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ایک روز اس نے کھل کر مسٹر اسمتھ سے شکایت کی کہ وہ اپنی بیوی سے زیادہ اپنی دکان پر توجہ دیتے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اب مزید تاخیر خود ان کے لیے بھی جاہ کن ہوگی چنانچہ دکان سے واپسی پر وہ اپنے ساتھ اپنی تاریخی اونی دری لائے۔ مارتھا انہیں فرش پر دری بچھاتے ہوئے دیکھتی رہی "دیکھنے میں یہ بہت پرانی نظر آتی ہے اسمتھ!" اس نے کہا "یہ کیا چیز ہے؟ لوادر؟ آرٹ کا نمونہ یا [illegible]"

"یہ ان [illegible] نے [illegible] ہے [illegible] انہوں نے [illegible] اعتراف کیا" لیکن یہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اس سے میری بہت سی قیمتی یادیں وابستہ ہیں" مارتھا نے محبت سے ان کی طرف دیکھا "اور یہ تم میرے لیے لائے ہو؟ کیوں اسمتھ؟"۔

"ہاں تمہارے لیے جان من" انہوں نے جواب دیا۔

"اوہ تم کتنے اچھے ہو اسمتھ! تم بہت اچھے ہو"۔

مسٹر اسمتھ نے اونی دری ڈائننگ روم کے دروازے پر بچھائی تھی کیونکہ مارتھا روزانہ رات کے کھانے کے بعد ٹیلیفون استعمال کرتی تھی اور ٹیلیفون ڈائننگ روم کے ایک کونے میں رکھا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ یہ حادثہ اس وقت رونما ہو جب مارتھا ٹیلیفون استعمال کرنے آئے۔ وہ روزانہ ایک مقررہ وقت پر ٹیلیفون استعمال کرتی تھی اس لیے وہ بڑی آسانی سے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتے تھے۔

"تم کیا سوچ رہے ہو ڈیئر؟" مارتھا نے ان کے ذہن میں گھستے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں میں اپنے لباس کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اب کسی کپڑے میں ایک بٹن بھی باقی نہیں رہا سب ٹوٹ چکے ہیں"۔

مارتھا نے ایک طویل انگڑائی لی "جلد ہی میں سب کپڑوں میں بٹن لگادوں گی تم فکر نہ کرو"۔

"کل؟"۔

"نہیں شاید کل تو نہیں" مارتھا نے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "اب سو جاؤ اسمتھ! آج میں بہت تھک گئی ہوں"۔

مسٹر اسمتھ اپنی بیوی کے پیچھے چل دیے لیکن ان کا ذہن اب بھی منصوبے ہی کے مختلف زاویوں پر غور کررہا تھا۔ انہیں احساس ہوا کہ کل درزی کو کچھ سوٹ درستی کے لیے دینے پڑیں گے ورنہ مارتھا کی تجہیز و تکفین کے وقت ان کے پاس ایک بھی معقول لباس نہیں ہوگا۔

مسٹر اسمتھ نے اپنا بہترین سوٹ درزی سے

شائع ہوگیا ہے

سیارہ ڈائجسٹ کے لازوال اسلامی نمبروں میں ایک اور اضافہ

قیمت: 175 روپے

- ان تمام واقعات کا جدید علم و تحقیق کی روشنی میں تفصیلی ذکر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور اس کی امت کو بتانا ضروری سمجھے
- انبیائے کرام کی مقدس اور پاکیزہ زندگیوں سے وابستہ واقعات
- قصے ان قوموں کے جن پر انبیائے کرام کی نافرمانی، اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی اور سرکشی کے باعث عذابِ الٰہی نازل ہوا

عمدہ ترتیب، دلچسپ اندازِ بیاں اور پرکشش رنگین ٹائٹل

500 صفحات پر مشتمل یہ عظیم الشان نمبر جلد پیش کیا جائے گا

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

درست کرانے کے بعد بڑی احتیاط سے الماری میں لٹکا دیا۔ کھانے کے بعد وہ ڈائننگ روم میں بیٹھ کے نو بجنے کا انتظار کرنے لگے۔ ان کی بیوی روزانہ نو بجے کہیں ٹیلی فون کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مارتھا برتن باورچی خانے میں رکھ کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ حسب معمول اس کی زبان تیزی سے چلنے لگی۔ مسٹر اسمتھ ہوں ہاں کرتے رہے اور ذہن میں وہی خیالی منظر دہرانے لگے جو کچھ دیر بعد حقیقت بننے والا تھا۔

نو بجے سے چند منٹ قبل انہوں نے اپنی بیوی کو کرسی سے اُٹھتے ہوئے دیکھا وہ آہستہ آہستہ ٹیلی فون کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا "مارتھا! پلیز ایک گلاس پانی پلاؤ گی؟"۔

مارتھا نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا "ایک گلاس پانی؟"۔

"ہاں" مسٹر اسمتھ غور سے اپنی بیوی کو دیکھنے لگے۔ مارتھا نے ایک نظر ٹیلی فون کی طرف دیکھا پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا گلاس تھا۔ مسٹر اسمتھ نے اپنائیت سے اپنا ایک ہاتھ اس کی پشت پر رکھا اور دوسرا ہاتھ اس کی ٹھوڑی کی طرف اس طرح بڑھایا جیسے وہ اس کا بوسہ لینا چاہتے ہوں۔

"کیا دوسری عورتوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا؟" مارتھا نے پرسکون انداز میں اچانک کہا۔

مسٹر اسمتھ کا آگے بڑھتا ہوا ہاتھ درمیان میں ہی معلق ہو گیا اور ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی "دوسری عورتیں؟" ان کے حلق سے بمشکل آواز نکلی "کون سی عورتیں؟"

مارتھا کے لبوں پر ایک مسکراہٹ جم گئی "چار دوسری عورتیں"۔ اس نے کہا "میرے حساب سے چار عورتیں بنتی ہیں، کیا ان کی تعداد زیادہ تھی اسمتھ؟"

"نہیں مسٹر اسمتھ نے بے اختیار کہا۔ پھر وہ سنبھل گئے "پتہ نہیں [illegible] سب کیا بکواس ہے۔"

"میرے پیارے شوہر! کیا تم اپنی پچھلی چار بیویاں تعلقی بھول گئے؟ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے کہ میری محبت میں دیوانے ہو کر تم نے انہیں بھلا دیا مگر میری ایسی قسمت کہاں؟"

"بے شک میں نے پہلے بھی شادی کی ہے" مسٹر اسمتھ نے بلند آواز میں کہا "اور میں نے تمہارے ساتھ شادی کرنے سے پہلے یہ بات نہیں چھپائی تھی لیکن یہ چار بیویوں والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟"۔

"بے شک! تم نے پہلے بھی شادیاں کی ہیں اسمتھ اور ان کے متعلق میں نے تحقیق بھی کر لی ہے۔ میرے وکیل نے تمہاری تمام شادیوں کا پتہ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ تم نے کس سکول میں تعلیم حاصل کی تھی؟ کہاں پیدا ہوئے تھے؟ تمہاری ماں کون تھی؟ تم سمجھے اسمتھ میرا وکیل کتنا ہوشیار آدمی ہے؟"۔

"اچھا تو یہ تمہارا وکیل تھا؟"۔

"ہاں میرے بھولے شوہر!" مارتھا نے مزے لیتے ہوئے کہا۔ "جس دوران تم مجھے ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنا رہے تھے میں اس کا توڑ کر رہی تھی۔ پہلی بار جب میں نے تمہیں دیکھا تھا میں اسی وقت تمہاری اصلیت سمجھ گئی تھی۔ تمہیں اس پر تعجب نہیں ہوا؟"

"کیسے۔ کس طرح؟"

"تم میرے مرحوم باپ کا دوسرا روپ نظر آتے تھے۔ انہی کی طرح کا لباس انہی کی طرح بولنا انہی کی طرح صفائی ستھرائی کا خبط۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے ڈیڈی نے مرنے کے بعد تمہارے جسم میں دوبارہ جنم لے لیا ہو۔ میں نے زندگی بھر ان سے شدید نفرت کی۔ ان سے نہیں ان کی شخصیت سے ان کی عادات سے، کیونکہ میرے سامنے میری ماں کا حشر موجود تھا۔ انہوں نے میری ماں سے ان کی دولت کے لیے شادی کی تھی۔ [illegible] تمہیں شادی کے [illegible] میری ماں کی [illegible] جہنم بن [illegible] تھی۔ پھر میرے

والد نے دولت کی خاطر میری ماں کو قتل کردیا"۔

"قتل کردیا؟" مسز اسمتھ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"اوہ، کیا تمہارا خیال ہے کہ صرف تمہی اپنی بیویوں کو قتل کرنے کی اہلیت رکھتے ہو؟" مارتھا نے تیز لہجے میں کہا۔ انہوں نے میری ماں کو بالکل اسی طرح قتل کیا تھا۔ پہلے انہوں نے پانی کا گلاس مانگا اور پھر ان کی گردن توڑ دی۔ ان کا اور تمہارا طریقہ بھی ایک ہی ہے"۔

مسز اسمتھ کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

"لیکن پھر کیا ہوا؟" انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا "کیا تمہارے والد پکڑے گئے؟" انہیں اپنے سوال کا جواب معلوم تھا لیکن وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ مارتھا سے اس کی تصدیق چاہتے تھے۔

"نہیں وہ پکڑے کبھی نہیں گئے لیکن اس وقت میری ماں کے وکیل مسٹر ہیگرڈ تھے۔ انہیں امی کی موت پر شبہ ہوگیا تھا۔ انہوں نے میرے والد کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کردیا اور ان پر میری والدہ کو قتل کرنے کا الزام لگایا۔ انہوں نے ایک مشہور ڈاکٹر کو گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیا جس نے یہ ثابت کردیا کہ میری والدہ کی موت غیر فطری ہوسکتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان کی موت اونی دری پر پھسلنے سے اور فرش پر گر کے گردن ٹوٹنے سے واقع نہ ہوئی ہو بلکہ میرے والد نے اپنے ہاتھوں سے ان کی گردن توڑ دی ہو لیکن اس سے پہلے کہ عدالت کوئی فیصلہ سناتی میرے والد حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کرگئے تھے"۔

"اوہ اُف یہی تھا" یہی تھا وہ کیس جو میں نے پڑھا تھا"۔ مسز اسمتھ نے کراہتے ہوئے کہا۔

"ان کی موت کے بعد میں نے قسم کھائی تھی کہ ایک نہ ایک روز میں ایسا مرد ضرور تلاش کرلوں گی جو عادات و اطوار میں [illegible] میرے باپ کی طرح [illegible]

ہوگا۔ میں اس کی ایک ایک عادت ایک ایک پسند اور ناپسند کا گہرا مطالعہ کروں گی اور اس کی زندگی کا ہر لمحہ اس کے لیے جہنم بنادوں گی۔ میں نے خود کو اتنا بے ڈول اور بے ہنگم بنالیا کہ کوئی مجھ سے میری ذات سے شادی کا تصور تک نہ کرے۔ یہ حرکت میں نے اس لیے کی کہ مجھے اپنے شوہر کے بارے میں پورا یقین ہو کہ اس نے صرف اور صرف میری دولت کی وجہ سے میرے ساتھ شادی کی ہے۔ میں نے تہیہ کیا کہ میرے جیتے جی وہ میری دولت سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرسکے گا۔ اسے میری بے انتہا دولت صرف دیکھنے کی اجازت ہوگی لیکن وہ اسے چھو نہیں سکے گا اور وہ دولت حاصل کرنے کے لیے مجھے قتل بھی نہیں کرسکے گا۔ اس کی کوشش رات دن یہ ہو کہ مجھے کسی طرح ذرا بھی گزند نہ پہنچے"۔ مسز اسمتھ اپنے بکھرے ہوئے حواس پر قابو پاچکے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ مارتھا اب تک اونی دری پر اسی طرح ہاتھ میں گلاس لیے کھڑی ہے وہ اس کی طرف ذرا سا جھکے "تم اپنی حفاظت پر کسی کو مجبور کیسے کرسکتی ہو؟" انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اگر کوئی بیوی اپنے شوہر کو پھانسی دلوانے پر قادر ہو تو اس کا شوہر اس کی حفاظت کے لیے مجبور ہو جائے گا۔ میں نے اپنے وکیل سے مشورہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ تمہاری تمام بیویوں کا انتقال تمہیں پانی پلاتے ہوئے اونی دری پر پھسلنے اور فرش پر گر کے گردن ٹوٹنے سے ہوا تھا۔ دنیا کی کوئی بھی عدالت اسے اتفاق تسلیم نہیں کرے گی۔ کوئی بھی اتفاق ایک یا دو بار ہوتا ہے پانچ بار نہیں"۔

"اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ شوہر یہ سب کچھ جاننے کے بعد کسی تاخیر کے بغیر اپنی بیوی کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کرے گا"۔ مسز اسمتھ نے غیر محسوس طور پر مارتھا کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

[illegible] تم [illegible] کہا [illegible] تم میرے

انتظامات کیوں بھول رہے ہو؟"

"کیسے انتظامات؟"۔

"میں تمہیں بتانا بھول گئی تھی تمہاری تمام پچھلی شادیوں اور جرائم کے دستاویزی ثبوت اس وقت میرے وکیل کے پاس موجود ہیں"۔ مارتھا نے سرد لہجے میں کہا۔ "اس کے علاوہ ان کے پاس میری ایک تحریر بھی ہے جس میں میں نے لکھا ہے کہ میری موت کے بعد چاہے وہ کتنی ہی فطری نظر آتی ہو پولیس فوراً تفتیش کرے اور کوئی قابل ڈاکٹر میری موت کے متعلق اطمینان کرے۔ ساتھ ہی فوراً دوسرے ضروری اقدامات کیے جائیں۔ تمہیں معلوم ہے اسمتھ! میرا وکیل کس قدر ذہین اور ہوشیار ہے؟ اس نے پہلے ہی تمہاری تصویریں اور انگلیوں کے نشانات محفوظ......!"

"انگلیوں کے نشانات؟" مسٹر اسمتھ نے چلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں! ڈیڈی کی اچانک موت کے بعد معلوم ہوا تھا کہ انہوں نے ملک سے فرار ہونے کے پورے انتظامات کیے تھے اس لیے مسٹر ہیگرڈ نے کہا کہ تمہارے سلسلے میں پہلے ہی ایسا انتظام رکھیں گے کہ تم فرار ہونے کا خیال تک دل میں نہ لا سکو۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ اب تم خواہ فرار ہو کر کہیں بھی چلے جاؤ تمہیں چند گھنٹوں کے اندر اندر تلاش کرلیا جائے گا"۔

"وہ......تم کیا چاہتی ہو؟" مسٹر اسمتھ کا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔

"ظاہر ہے اب تم میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرو گی اور......"۔

"ارے نہیں، تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنے کا لطف تو اب آئے گا۔ ہاں ڈیئر! جب ہم اس مقام تک پہنچ ہی گئے ہیں تو میں تمہیں صاف صاف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے تمہاری دکان اور اس کا کاروبار بالکل پسند نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم چوبیس گھنٹے میرے ساتھ رہو"۔

"کیا؟ میں...... میں اپنی دکان چھوڑ دوں؟" مسٹر اسمتھ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"ہاں" مارتھا نے فیصلہ کن انداز میں کہا" اور ممکن ہے کہ کبھی میں تمہاری خدمات سے خوش ہو کر اپنے وکیل سے تمام کاغذات واپس لے کر تمہارے حوالے کردوں۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے میرا زندہ رہنا تمہارے حق میں کتنا ضروری ہے۔ میں نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ چاہے میری موت فطری ہو، پولیس اچھی طرح تفتیش کرے"۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی زور سے چیخی اور مارتھا نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ "یہ میرے وکیل کا ٹیلی فون ہوگا، اگر میں کسی رات نو بجے تک فون کرکے اسے اپنی خیریت سے مطلع نہیں کرتی تو وہ پانچ منٹ انتظار کرنے کے بعد خود ٹیلی فون کرتا ہے یہ بھی ہمارے انتظامات کی ایک کڑی ہے"۔

"ٹھہرو" مسٹر اسمتھ نے ٹیلی فون کی طرف بڑھ کر ریسیور اٹھا کے کان سے لگایا۔ دوسری طرف مارتھا کا وکیل ہیگرڈ موجود تھا۔

"ہیلو" مسٹر وکیل نے کہا" ہیلو مسٹر اسمتھ؟"

مسٹر اسمتھ کے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا "معاف کیجئے گا مارتھا اس وقت فون پر نہیں آسکتی، فرمایئے کیا کام ہے؟ میں اسمتھ بول رہا ہوں"۔

دوسری طرف چند لمحوں تک سناٹا طاری رہا پھر آواز آئی "میں ہیگرڈ بول رہا ہوں مسٹر اسمتھ، آپ مجھے پہچان گئے ہوں گے۔ میں آپ کی بیوی سے فوراً بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سمجھ گئے مسٹر اسمتھ؟ فوراً میں آپ کو صرف دس سیکنڈ کی مہلت دے سکتا ہوں۔ آپ اپنی بیوی سے میری بات کرا دیجئے"۔

......•......